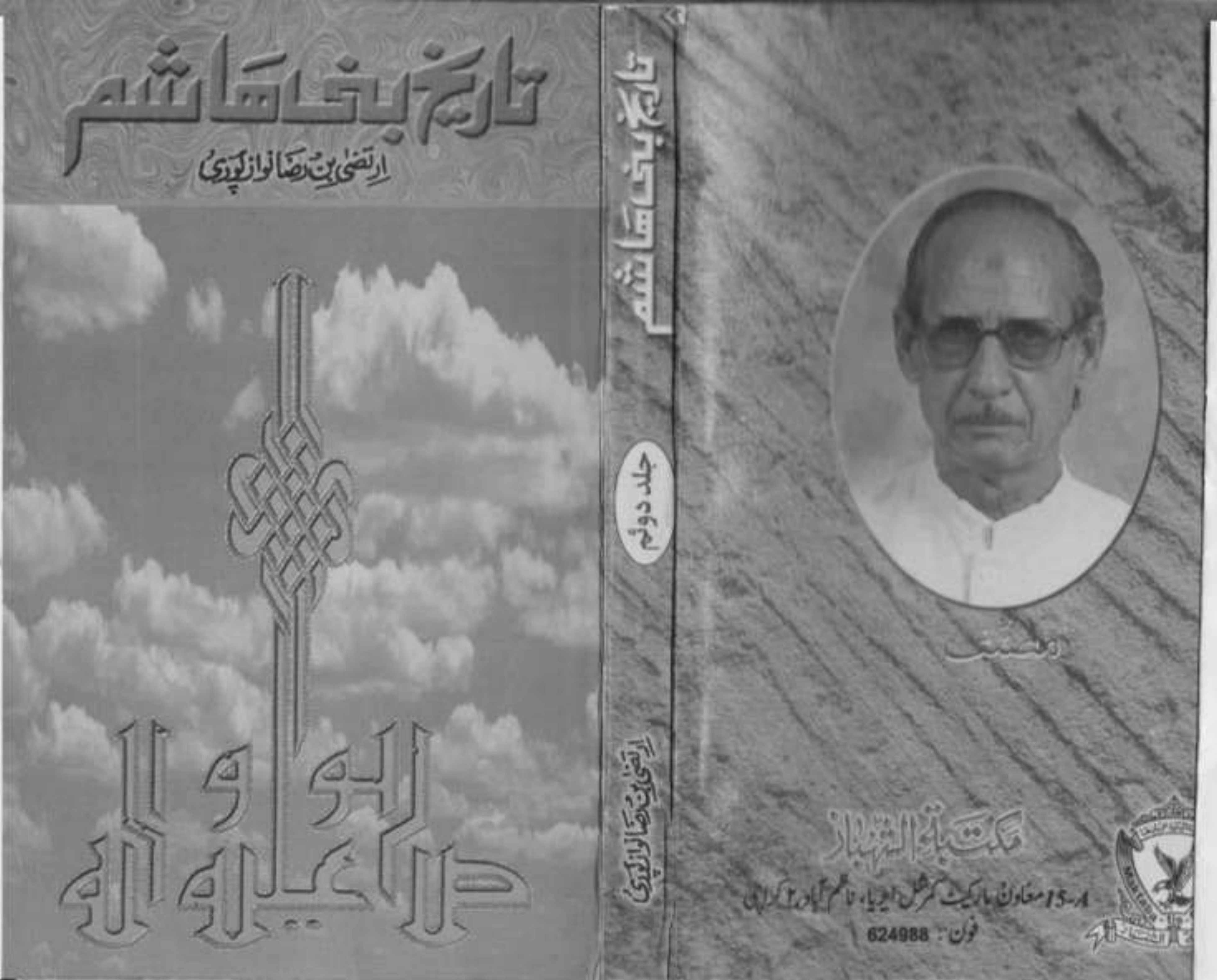

تاریخ بنی ھاشم

جلد دوئم

برائے ایصال ثواب
سید نثار حسین ابن سید رمضان علی
اختر النساء بنت سید علی جان
سیدہ حسنیٰ بنت اخلاق حسین

ناشران و تاجران کتب

تحقیق و تصنیف

ارتضیٰ بن رضا نواز لوری

نگرانئ اِمام میں ھو گا یہ نیک کام
اچّھا ھے وقت خواب کی تعبیر کے لئے
محشر میں فاطمہؑ تجھے کر دیں گی سرخرو
اٹھ جنّت البقیع کی تعمیر کے لئے
آصف لکھنوی

JANNATULBAQI PDF
Join us for Pdf Books @ Telegram Link
http://t.me/jannatulbaqii
App:- JANNATUL BAQI on Google Play Store
Please intsall & registered your Condemn

اللہ تعالیٰ کے پاک وپاکیزہ ناموں سے متعلق وظائف

اسمائے باری کے خواص، اعداد، طریقہ استخراج اسم اعظم اور ورد کرنے کے اوقات وایام پر مشتمل

وظائف اسماالحسنیٰ

مرتبہ
ارتضیٰ بن رضانواز پوری

ہدیہ -/36 روپے

(جملہ حقوق حق مصنف محفوظ ہیں)

بار اول ———— مارچ ۲۰۰۰ء
تعداد اشاعت ———— ایک ہزار
ناشر ———— مکتبہ الشہباز
طابع ———— دلاور زیدی
مطبوعہ ———— اوکھائی پرنٹنگ پریس
قیمت ———— Rs. 90/-

برائے ایصال ثواب
سید نثار حسین ابن رمضان علی
اختر النساء بنت علی جان
سید علی انصر ابن شبیر حسن
سیدہ حسنٰی بنت اخلاق حسین

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو خاندانِ بنی ہاشم کے ان شہیدوں کے نام منسوب کرتا ہوں جنہوں نے اسلام کی بقاء و سربلندی کیلئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔

ارتضیٰ نواز پوری

مشمولات

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
سرورق	۱	شجرہ نسب	۲۷
انتساب	۳	طفولیت	۳۱
مشمولات	۴	کفالت عبدالمطلب	۳۳
سخنہائے گفتنی	۱۰	کفالت ابوطالب	۳۶
ابتدائیہ	۱۳	گلہ بانی	۳۷
قائم تا دائم (باب سوئم)	۱۷	سفرِ شام	۳۸
حضرت محمد مصطفیٰ ؐ	۱۸	حرب فجار	۴۰
ولادت باسعادت	۱۸	نقشہ تجارتی سفر	۴۱
تاریخ ولادت	۲۱	تجارت	۴۲
جائے ولادت	۲۲	ترویج	۴۳
تسمیہ و عقیقہ	۲۲	ورقاعہ کا خطاب	۴۶
نقشہ جائے ولادت	۲۳	تعمیرِ کعبہ	۴۷
اسماء و القاب مبارکہ	۲۴	کعبہ منزل بمنزل (تصویر)	۴۸
نسب مبارک	۲۶	حضرت علی کی کفالت	۴۹
رضاعت	۲۶	اسباب رسالت	۵۰

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
بعثت	۵۴	صلح حدیبیہ	۱۰۳
دعوت بنی ہاشم	۵۶	معاہدہ کی خلاف ورزی	۱۰۸
اعلانیہ تبلیغ	۵۹	ابوسفیان کی ناکام سفارت	۱۰۹
مخالفت مشرکین	۶۰	فتح مکہ	۱۱۳
عبدالعزا کا نام	۶۵	حاطب بن ابی بلتعہ کا خط	۱۱۵
وفود قریش	۷۱	رسالتمآبؐ کی مدینہ واپسی	۱۱۶
عام الحزن	۷۳	ابوسفیان کی مکہ واپسی	۱۱۹
سفر طائف	۷۳	مکہ میں اسلامی لشکر کا داخلہ	۱۲۰
قبائل میں تبلیغ	۷۵	نقشہ فتح مکہ	۱۲۱
بیعت عقبہ	۷۵	قیام پر استفسار	۱۲۳
قریش کی سازش	۷۶	ام ہانی کا گھر دارالامان	۱۲۷
ہجرت	۷۷	حرم محترم میں داخلہ	۱۲۷
شب ہجرت	۷۸	بت شکنی	۱۲۸
نقشہ منازل ہجرت	۸۱	کلید برادر	۱۳۰
تعمیر مسجد	۸۳	آنحضرتؐ کا خطبہ	۱۳۱
مواخات	۸۳	عفو عام	۱۳۳
اسلامی ریاست کا قیام	۸۴	بیعت عام	۱۳۵
نقشہ مدینہ منورہ	۸۶	اعلان برأت	۱۳۷
غزوات کا مختصر جائزہ	۸۹	عام الوفود	۱۳۸
نقشہ غزوات	۱۰۱		

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
وفد بنو نجران	۱۳۹	مرثیہ	۱۷۱
واقعہ مباہلہ	۱۳۰	تاریخ وفات	۱۷۳
آیت تطہیر	۱۳۱	تجہیز و تکفین و تدفین	۱۷۳
حجۃ الوداع	۱۳۳	ازواج النبیؐ	۱۷۷
حضرت علیؑ کی شمولیت	۱۳۵	حضرت خدیجہؓ	۱۸۰
ادائیگی مناسک حج	۱۳۶	حضرت عائشہؓ	۱۸۷
مقام خم	۱۳۷	واقعہ افک	۱۸۸
خطبہ غدیر خم	۱۳۸	حضرت حفصہؓ	۱۸۹
تکمیل دین	۱۵۱	واقعہ تحریم	۱۹۱
وفات پیغمبرؐ	۱۵۳	حضرت زینبؓ بنت خزیمہ	۱۹۳
علالت	۱۵۳	حضرت ام سلمیٰؓ	۱۹۳
جیش اسامہ	۱۵۵	حضرت زینبؓ بنت حجش	۱۹۷
شدت مرض	۱۵۶	حضرت جویریہؓ	۲۰۰
واقعہ پیش نمازی	۱۵۸	حضرت ام حبیبہؓ	۲۰۲
واقعہ قرطاس	۱۶۱	حضرت صفیہؓ	۲۰۳
حضرت علیؑ کی طلبی	۱۶۵	حضرت میمونہؓ	۲۰۳
قرب وفات	۱۶۶	حضرت اسماءؓ	۲۰۳
حضرت علیؑ سے آخری وصیت	۱۶۶	حضرت عمرہؓ	۲۰۳
وفات پیغمبر	۱۶۸	حضرت ماریہؓ	۲۰۵
وفات پیغمبر پر گریہ وبکا	۱۶۹	حضرت ریحانہؓ	۲۰۶

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
اولاد اکرام	۲۰۸	سقیفہ بنی ساعدہ	۲۳۳
حضرت فاطمہ زہراؑ	۲۱۰	سقیفہ کیا تھا؟	۲۳۵
ولادت باسعادت	۲۱۱	بیعت سقیفہ	۲۳۶
نام، لقب و کنیت	۲۱۲	حضرت علیؑ سے بیعت کی طلبی	۲۳۹
تربیت	۲۱۲	مسئلہ خلافت	۲۴۳
شادی	۲۱۳	حضرت علیؑ کا سکوت	۲۴۶
کفو	۲۱۳	خلیفہ کا انتخاب	۲۵۳
طرز زندگی	۲۱۵	ظاہری خلافت	۲۵۳
تسبیح فاطمہؑ	۲۱۶	مطالبۂ قصاص	۲۵۵
بعد وفات رسولؐ	۲۱۶	جنگ جمل	۲۵۷
وفات	۲۱۸	جنگ صفین	۲۵۹
اولاد	۲۲۰	واقعہ تحکیم	۲۶۰
فضائل	۲۲۰	جنگ نہروان	۲۶۲
حضرت علی کرم اللہ وجہہ	۲۲۳	شہادت	۲۶۳
ولادت	۲۲۳	ازواج و اولاد	۲۶۶
نام و نسب	۲۲۶	شجرہ	۲۶۷
کنیت و القاب	۲۲۶	فضیلت	۲۶۹
طفولیت و تربیت	۲۲۸	منقبت	۲۸۵
سابقیت اسلام	۲۳۰	حضرت امام حسنؑ	۲۸۹
سابقیت نماز	۲۳۲	ولادت و نسب	۲۸۹

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
کنیت و لقب	۲۸۹	اسحاق بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۵
مشابہت و محبوبیت	۲۸۹	ابراہیم بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۶
فضائل و مناقب	۲۹۲	عبداللہ بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۶
پیش آمدہ واقعات	۲۹۲	اسمٰعیل بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۶
صلح حسن	۲۹۶	حسن بن حسنؑ (حسن مثنیٰ)	۳۲۷
تجزیہ صلح حسن	۲۹۹	شجرہ	۳۲۸
شہادت	۳۰۸	عبداللہ بن حسن مثنیٰ (عبداللہ محض)	۳۳۰
جعدہ بنت اشعث	۳۰۹	اولاد عبداللہ محض	۳۳۳
کثرت ازواج کا الزام	۳۱۰	محمد بن عبداللہ محض (محمد نفس زکیہ)	۳۳۳
ازواج	۳۱۶	تحریک بنو ہاشم کا مختصر جائزہ	۳۳۵
شجرہ	۳۱۸	منصور کا برتاؤ	۳۳۷
اولاد حضرت امام حسنؑ	۳۱۹	روپوشی و خروج	۳۳۸
زید بن حسنؑ	۳۲۰	شہادت محمد نفس زکیہ	۳۴۱
اولاد زید بن حسنؑ	۳۲۲	اولاد	۳۴۲
حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۳		
قاسم بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۴		
علی بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۵		
زید بن حسن بن زید بن حسنؑ	۳۲۵		

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
عبداللہ اشتر	۳۴۴	ابراہیم بن حسن مثنیٰ	۳۵۸
اسپین میں علوی حکومت	۳۴۷	طباطبائی سلطنت	۳۵۹
طبرستان میں علوی حکومت	۳۴۷	حسن بن حسن مثنیٰ (حسن مثلث)	۳۶۰
ابراہیم بن عبداللہ محض	۳۴۷	اولاد حسن مثلث	۳۶۰
موسیٰ بن عبداللہ محض	۳۵۱	اولاد علی بن حسن مثلث	۳۶۲
اولاد موسیٰ	۳۵۲	واقعہ فخ	۳۶۳
یحییٰ بن عبداللہ محض	۳۵۳	حسن بن علی	۳۶۵
اولاد یحییٰ	۳۵۳	جعفر بن حسن مثنیٰ	۳۶۶
سلیمان بن عبداللہ محض	۳۵۳	داؤد بن حسن مثنیٰ	۳۶۶
ادریس بن عبداللہ محض	۳۵۵		
ادریسی سلطنت	۳۵۵		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

پروفیسر ڈاکٹر مرزا عسکری حسین
ایم۔ اے ۔ فاضل ادب۔
ایل ایل۔ بی۔ پی ایچ۔ ڈی۔

جارج برنارڈ شاہ نے کہا ہے کہ "تاریخ میں کچھ بھی صحیح نہیں ہوتا سوائے ناموں اور تاریخوں کے اور ناول میں کچھ بھی غلط نہیں ہوتا سوائے ناموں اور تاریخوں کے"۔

بیسویں صدی کے اس عظیم فلسفی کا یہ قول عمومی تاریخ پر تو ضرور صادق آتا ہے مگر انبیاء و مرسلین و مصلحین اور مجدّد دین کی تواریخ پر اس کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جنہیں تاریخ نے نہیں بنایا بلکہ جنھوں نے خود تاریخ کو بنایا ہے۔ وہ تاریخ کے محتاج نہیں بلکہ تاریخ ان کی محتاج ہے۔ اسی لئے ایسی مقدس و متبرک ہستیوں کی تاریخ لکھنا بہت مشکل امر ہے۔ اس میں ہر ہر منزل پر بڑی احتیاط سے قلم کو حرکت دینا ہوتی ہے۔ بڑی ذمہ داری کے ساتھ ایک ایک لفظ کو سپرد قرطاس کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس دائرہ میں دین اور دنیا دونوں ہی داخل ہیں۔

جناب ارتضی بن رضا نواز پوری لائق تحسین و آفرین ہیں کہ انہوں نے "تاریخ بنی ہاشم" تحریر کرنے کی ذمہ داری قبول کی اور بہت ہی ذمہ داری، عرق ریزی، خلوص اور تحقیق سے کام لیکر صحیح روایات اور حقائق کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے تاریخ بنی ہاشم کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ جناب ارتضی بن رضا کی یہ کاوش اسلامی مشاہیر و محسنین کے صحیح حالات اور مستند روایات کو منظر عام پر لانے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوگی۔

سرکار دو عالم، رحمت للعالمین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ ان کی منفرد اور قابل تقلید ذات گرامی قدر کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ نیز مستند حوالہ جات سے جس طرح حقائق کو ثابت کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی زندگیوں اور ان کے حالات کو قلمبند کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک ایک روایت بلکہ ایک ایک لفظ کو بہت غور و فکر کے ساتھ ضبط تحریر میں لانا ہوتا ہے۔ تاکہ ایسی مقدس ہستیوں کی حیات طیبہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ مصنف اس مقصد میں بہت کامیاب رہے ہیں۔ اور انہوں نے بہت ذمہ داری سے ان مقدس ہستیوں کے حالات و واقعات کو تحریر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جناب ارتضی بن رضا نے صلح امام حسن علیہ السلام پر جس طرح عالمانہ بحث کی ہے اور اس متنازعہ مسئلہ کو جس طرح پیش کیا ہے۔ حقائق کو ثابت کرنے کے لئے جو دلائل دیئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ صلح فی الحقیقت تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جس نے اسلام سے خاندان نبوت کی محبت کے ساتھ ساتھ اس دین کی بقاء اور روحانی اقدار کو برقرار رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ صلح اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ آل محمدؐ نے دین اسلام کی حفاظت اور بقاء کے لئے کسی بھی قسم کی جانی و مالی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔ ان ہی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج دین اسلام دائم و قائم ہے بلکہ قیامت تک قائم رہے گا۔

اس کتاب کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ مصنف نے اولاد جناب امام حسنؑ کی ان صعوبتوں، ابتلائوں اور قربانیوں کا مفصّل تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے اسلامی اقدار کو برقرار رکھنے کے لئے پیش کیں۔ حضرت عبداللہ بن حسن مثنیٰ، محمد بن عبداللہ محض، یحییٰ بن زید شہید،

محمد نفس ذکیہ اور عبداللہ شاہ غازی کے حالات پر سیر حاصل تذکرہ کرکے قارئین کو مفید معلومات بہم پہنچائی گئیں ہیں۔

بہر حال یہ جلد بھی پہلی جلد کی طرح بہت مفید اور موثر ثابت ہوگی۔ اس کامیاب محنت و کاوش پر مصنف کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ پس یہی کہا جا سکتا ہے کہ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" میری دعا ہے کہ جناب ارتضی بن رضا کی یہ کوشش بارگاہ محمدؐ وآل محمدؐ میں قبولیت کا شرف حاصل کرے اور اللہ ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

آمین۔

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد ہے اس خدا کے لئے جو چھوٹی بڑی نعمتوں کا بخشنے والا اور ہر مصیبت کا دور کرنے والا ہے۔ خدا کی رحمت ہو نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپؐ کی آلِ اطہار پر خصوصاً ان اصحابِ اہلبیت پر جو روشن پیشانی والے ہیں اور جنہوں نے دین کے قیام کے لئے ہر زمانہ میں نصرت کی۔

اللہ رب کریم کا بڑا کرم ہے کہ اس حقیر کی محنت کارگر ہوئی اور تاریخِ بنی ہاشم کی دوسری جلد تکمیل کو پہنچی۔ گزشتہ سال اس کتاب کی جلد اوّل شائع ہوئی تھی جسے بحمد اللہ مومنین نے شرفِ قبولیت بخشا۔ زیرِ نظر کتاب اپنے عنوانات کے باعث اہم ترین اور تدوین کے اعتبار سے دشوار ترین تھی کیونکہ اس جلد میں خاندانِ بنی ہاشم کی ان دو متبرک و مقدس ہستیوں کا ذکر ہے جو تاریخِ بنی ہاشم تو کیا تاریخِ انسانیت کے وہ درخشاں مہرو ماہ ہیں جن کی ضیائے پر نور سے عالمِ انسانیت تا قیامت روشن و منور رہے گی۔ جن کا ہر قول باعث رہنمائی اور ہر عمل قابلِ تقلید ہے۔ ان میں سے ایک نبیؐ آخر تو دوسرا امام اوّل، ایک تابع وحی الہٰی تو دوسرا تابع احکام محبوب الہٰی۔ ایک کی بابت ارشادِ باری ہے "وَمَا اَرسَلْنٰكَ اِلَّا رَحمَةً لِّلعٰلَمِينَ۔[۱] ترجمہ : اے رسول! ہم نے تم کو (نسلِ انسانی اور) عالمین کیلئے سر تا پا

رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تو دوسرے کا تعارف اللہ کے نبیؐ نے اس طرح فرمایا : عَلِيٌّ سَيِّدُ المُسلِمِينَ وَ اِمَامُ المُتَّقِينَ وَ قَائِدُ الغُرِّ المُحَجَّلِينَ۔[۲] ترجمہ علی مسلمانوں کے سردار، متقیوں کے پیشوا اور ان لوگوں کے سالار ہیں جو روزِ قیامت سرخرو ہوں گے۔

ایسی پاک و پاکیزہ ہستیوں کا ذکر کرنا بلاشبہ کارِ خیر ہے اور کارِ خیر اس وقت تک صادر نہیں ہوتا جب تک کہ توفیق الہٰی و تائیدباری شامل حال نہ ہو۔ انسان کو گمان ہوتا ہے کہ کارِ خیرمحض اسکی کاوش کا نتیجہ ہے۔ درآنحالیکہ یہ عطیہ خداوندی ہوتا ہے۔ جو انہی کو نصیب ہوتا ہے جو خلوص نیت سے اللہ کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

عام طور سے دیکھنے میں آتا ہے کہ ایسے حضرات جنکا شمار نہ علماء و واعظین میں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کسی عربی و مذہبی درسگاہ سے اکتساب علم حاصل کرپاتے ہیں لیکن پھر بھی تائید ایزدی، ذوق فطری اور جذبۂ قلبی کے باعث ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں جنکا بظاہر ان سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور توفیقات الہٰی کے باعث وہ نہایت مناسب تصنیفات مرتب کرتے رہتے ہیں۔ بعینہٖ یہی صورتحال اس فقیر کی ہے۔ نہ علمیت کا غرور نہ ذکاوت کا تکبر بس ایک جذبۂ اندروں ہے کہ جو شب و روز مشغول رکھتا ہے اور تائید غیبی شامل حال ہے جو رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ ورنہ کہاں یہ کمترین اور کہاں تدوین تاریخ بنی ہاشم۔

ہم نے اپنے اس سلسلہ تاریخ کیلئے کتاب کی ضخامت کو محدود رکھنے کی غرض سے صفحات متعین کئے تھے۔ لیکن زیرِ نظر کتاب جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے حالات و واقعات پر

[۱] سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۷، [۲] منتخب کنزالعمال ص: ۳۴ ج:۵

مشتمل ہے، کوشش کے باوجود اسکی ضخامت محدود نہ رہ سکی۔ اور کیونکر محدود رہتی، اس جلد میں جن برگزیدہ ہستیوں کا ذکر ہے انکا زمانہ خصوصاً ختمی مرتبتؐ اور حضرت علیؑ کا دور انتہائی اہم اور تاریخ اسلام کی بنیاد ہے۔ جناب ختمی مرتبتؐ کی سیرتِ طیبہ پر قدما نے متعدد ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؑ کی حیات مبارکہ پر نہ صرف ضخیم کتب موجود ہیں بلکہ سیرت کی کتابوں میں بھی جابجا آپ کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ان تفصیلی مضامین میں سے ہم نے جن عنوانات کو منتخب کیا گو کہ ان کی تحریر میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا مگر اس کے باوجود اس کتاب کے صفحات ہمارے مقرر کردہ صفحات سے کہیں زیادہ ہوگئے۔ لہٰذا ہمیں چارو ناچار حضرت علیؑ سے متعلق چند عنوانات مثلاً آپؑ کے فضائل قرآن و حدیث کی روشنی میں، آپؑ کے کارنامے اور آپؑ کی اولاد کے حالات واقعات وغیرہ کیلئے جلد سوئم کو مختص کرنا پڑا۔ جو انشاء اللہ جلد شائع کردی جائے گی۔

آخر میں میں اپنے محسن جناب قبلہ ڈاکٹر مرزا عسکری حسین صاحب دام اقبالہ، کی محبت و عنایت کا صدق دل سے مشکور ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ بنی ہاشم جلد دوئم کی کمپوز شدہ کاپی کا ایسی حالت میں مطالعہ فرمایا جبکہ چند دن قبل ہی آپ کی آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ بنی ہاشم سے یہ الفت آپ کے جذبۂ حب اہلبیت کی بہترین مثال ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ بتصدق محمدؐ و آلِ محمدؐ ڈاکٹر صاحب موصوف کو صحتِ کلی عطا فرمائے۔ آمین۔

ارتضیٰ نواز پوری

مورخہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

اے ہمارے پروردگار! ان (لوگوں) میں انہی میں سے ایک رسول کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)

اور آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے اور ان (کے نفوس) کو پاکیزہ کرے، بیشک تو ہی غالب

اور صاحب تدبیر ہے ——— (القرآن، ۲/۱۲۹)

باب سوئم

حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تا

حضرت دائم علیہ السلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ولادت باسعادت : جب دنیائے انسانیت پر گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا' ظلم و بربریت اپنے عروج پر تھی' قتل و غارت کا بازار گرم تھا' شرک و بت پرستی عام تھی اور نیکی پر نفس غالب آچکا تھا۔ الغرض ہر اعتبار سے آدم کی اولاد حیثیت مجموعی شر میں مبتلا اور خیر سے محروم ہو چکی تھی۔ ایسے میں تاریخ ایک انقلابی قوت کی متلاشی تھی' انسانیت اپنے آخری نجات دہندہ کی منتظر تھی' بھٹکے ہوئے راہی سر راہ کھڑے رہبر کامل کی راہ تک رہے تھے۔ تاریکیاں اور ظلمتیں طلوع سحر کے انتظار میں تھیں کہ واقعہ اصحاب فیل کے پچپن دن بعد جناب آمنہؑ کے ایام حمل تمام ہوئے یا یوں کہئے کہ امین الہیٰ کی مدت امانت ختم ہوئی تو فاران کی چوٹی سے نور مجسم طلوع ہوا اور جناب آمنہ کے بطن سے ودیعت الہیٰ کا نایاب گوہر' قدرت لامتناہی کا لاجواب جوہر' علم وایقان کا مخزن' عرفان و اتقان کا معدن' دعائے خلیل کا ماحاصل' بشارت موسیٰ کا مدعا' نوید عیسیٰ کا مقتضا' اصل وحدت کا معلم' امر رسالت کا متمم' افضل المرسلین' خاتم النبیینؑ' شہنشاہ کونین' رسول الثقلین' فخر ہاشم و قصیٰ' مفخر عبدالمطلب و عبداللہ' ناز پروردہ آمنہ' اور اول ثمرہ آل عبا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت الہٰیہ و برکات قدسیہ کا اسوہ حسنہ بنکر رونق افروز گلستان عالم ہوئے۔

صلو علیہ و آلہ

معززین مکہ کے درمیان کعبہ کے مقام حجر میں بیٹھے ہوئے دادا کو پوتے کی ولادت کی خبر پہنچائی گئی۔ اس پرمسرت خبر کے اثرات جناب عبدالمطلب کے چہرے سے نمایاں ہوئے، مسرت و شادمانی کا یہ عالم کہ نومولود پوتے کو دیکھنے کی غرض سے فوراً اٹھے معززین مکہ بھی آپکے ہمراہ ہوئے۔ گھر پہنچے' نومولود کو گود میں لیکر واپس کعبہ میں تشریف لائے' اس نعمت بے بہا پر اللہ کو شکر ادا کیا اور اس کی سلامتی کے لئے دست دعا بلند کئے۔ جناب عبدالمطلب نے اپنے جذبات قلبی کا اظہار اس طرح فرمایا۔

الحمد لله الذى اعطانى هذا الغلام الطيب الاردان

قد ساد فى المهد على الغلمان أعيذهُ بالله الذى ذى الاركان

حتى اراه بالغ البنيان اعيذهُ من شرّذى شنان

من حاسدٍ مضطرب العنان

ترجمہ: میں خدا کی تعریف کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسا فرزند عطا فرمایا جو اپنی قوم میں پاک و پاکیزہ ہے وہ اپنے گہوارے میں غلاموں کی حفاظت میں آرام کرتا ہے۔ خدائے تعالیٰ جو رکن و مقام کا مالک ہے اس کو اپنی پناہ میں رکھے یہانتک کہ میں اپنی آنکھوں سے اسے جوان دیکھ لوں اور خدا اسے اسکے را چاہنے والے حاسدوں سے محفوظ رکھے اور اسکے شریک سے بھی جو اس کا اچھا نہیں چاہتے ہیں۔

(طبقات ابن سعد ص: ۱۹۰ ج: ۱ ، اسوۃ الرسول ص: ۱۲ ج: ۲)

آنحضرتؐ کی ولادت کی بابت ابن اسحاق نے حسان بن ثابت کی روایت اس طرح بیان کی ہے کہ

"خدا کی قسم! میں سات یا آٹھ سال کا تھا۔ قریب البلوغ لڑکا تھا، جو بات سنتا تھا اسے سمجھتا تھا کہ اچانک میں نے ایک یہودی کو یثرب کے ایک بلند مقام پر بلند آواز سے "اے گروہ یہود!" چیختے سنا۔ یہانتک کہ جب وہ اس کے پاس جمع ہو گئے اور پوچھا! کم بخت: تجھے ہوا کیا

ہے اس نے کہا: آج رات احمد کا ستارا طلوع ہو گیا ہے جس میں وہ پیدا ہوگا۔" (سیرۃ ابن ہشام ص: ۱۸۲ ج: ۱)

اسحاق بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ نے کہا:

"ان (محمدؐ) کے پیدا ہوتے ہی مجھ سے ایک ایسا نور برآمد ہوا کہ ملک شام کے قصر و ایوان اس سے روشن ہو گئے، پیدا ہوئے تو پاک و صاف اور طاہر و مطہر پیدا ہوئے۔ جس طرح بھیڑ بکریوں کے بچے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے کچھ بھی آلائش نہیں ہوتی، زمین پر آئے تو فرش خاک پر اپنے ہاتھ کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے" (طبقات ابن سعد ص: ۱۵۸ ج: ۱)

عبداللہ بن عباس نے اپنے والد عباس بن عبدالمطلب سے روایت کی ہے کہ

"رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تو ختنہ شدہ، ناف بریدہ تھے عبدالمطلب کو اس پر مسرت آمیز تعجب ہوا ان کے نزدیک رسول ﷺ کی قدر بڑھ گئی اور انہوں نے کہا میرے اس بیٹے کی ایک خاص شان ہو گی، چنانچہ آنحضرتؐ کی خاص شان ہوئی۔" (طبقات ابن سعد ص: ۱۵۹ ج: ۱)

جب پروردگار عالم نے ایجاد مخلوقات کا ارادہ فرمایا تو نور محمدیؐ کو اپنے انوار صمدیہ سے ظاہر کر کے اس نور سراپا ظہور سے تمام عالم کو پیدا کیا۔ جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ "میں نے رسالتمآب سے پوچھا کہ یارسول اللہ (میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں) سب سے پہلے خدا نے کس چیز کو خلق فرمایا۔ آنحضرت نے جواب دیا: اے جابر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا"۔ نیز حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ جناب رسول مقبول نے ارشاد فرمایا کہ "خالق عالم نے میرے نور کو حضرت آدمؑ کی پیدائش سے چودہ ہزار سال پہلے خلق فرمایا"۔[1]

---

[1] تاریخ احمدی ص: ۱

تاریخ ولادت : آنحضرتؐ کی تاریخ ولادت کی بابت مفسرین، محدثین، محققین کے اختلافی بیانات ملتے ہیں۔ قدما کے اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے زرقانی نے جو تاریخیں بیان کی ہیں وہ دوسری، آٹھویں، دسویں، بارھویں، سترویں اٹھارویں ربیع الاول ہیں۔ مگر اجماع اہلسنت و الجماعت کے نتیجہ میں متفقہ فیصلے کے مطابق مشہور ترین قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت بارھویں ربیع الاول ۱؁ عام الفیل مطابق ۲۹ اگست ۵۷۰ء بروز دوشنبہ بوقت صبح بعد طلوع آفتاب ہوئی اور علمائے اہلبیت کے متفقہ فیصلے کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت سترویں ربیع الاول ۱؁ عام الفیل بروز دوشنبہ بوقت صبح ہے۔ جبکہ علامہ شبلی نعمانی نے منجم محمود پاشا فلکی کی تقلید کرتے ہوئے قاعدہ نجوم سے حاصل کردہ تاریخ ۹ ربیع الاول ۱؁ ع ف مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تحریر فرمائی ہے[1] جو اجماع اہلسنت اور علمائے اہلبیت دونوں کے خلاف ہے۔ نیز سر سید احمد خان صاحب نے خطبات احمدیہ میں تفصیلی بحث اور تحقیق و تصدیق سے ثابت کیا ہے کہ ۱؁ عام الفیل ۵۷۰ء کے مطابق تھا۔ لہذا فلکی صاحب کا استخراج بابت ماہ اپریل اور ۵۷۱ء درست ثابت نہیں ہوتا۔[2] بہر حال اس بات پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت ماہ ربیع الاول ۱؁ عام الفیل مطابق ۵۷۰ء بروز دوشنبہ بوقت صبح ہوئی۔ جسٹس امیر علی تحریر کرتے ہیں کہ:

" Towards the end of the fortieth year of the reign of Kesra Anushirvan, and the year 880 of the era of the Seleucidae." (The Spirit of Islam F. Note P. 8)

جس سال آنحضرتؐ پیدا ہوئے وہ کسریٰ نوشیروان کا چالیسواں سال جلوس تھا اور سن سلاقی (یونانی) ۸۸۰ء تھا۔

---

[1] سیرۃ النبی ص: ۱۷۱ ج: ۱ [2] خطبات احمدیہ ص: ۱۲

جائے ولادت : بقول زرقانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت مکہ میں محلہ بنی ہاشم کے اس مکان میں ہوئی جسکو "زقاق مدکک" کہتے تھے۔ ہجرت کے بعد اس مکان پر ابو سفیان قابض ہوا پھر یہ مکان حجاج بن یوسف ثقفی کے بھائی محمد بن یوسف ثقفی کے قبضہ میں آیا۔ اسکے بعد ہارون رشید کے دور حکومت میں ہارون کی ماں خیزران نے محمد بن یوسف کے ورثاء سے اس مکان کو خرید کر یہاں مسجد تعمیر کرائی بعدہ ۶۵۹ھ میں والئی یمن ملک مظفر نے اس مسجد کی تعمیر نو کرائی جو اب تک مولود النبیؐ کے نام سے زیارت گاہ عالم ہے۔[۱]

تسمیہ و عقیقہ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسم تسمیہ اور ولیمہ عقیقہ کی بابت زرقانی کے بیان کا ترجمہ جناب فوق بلگرامی نے اس طرح رقم کیا ہے۔

> "تاریخ خمیس میں ہے کہ جب رسالتمآبؐ پیدا ہوئے تو حضرت عبد المطلب نے اونٹوں کی قربانی کا حکم دیا۔ چنانچہ اونٹ ذبح کئے گئے قریش کے لوگوں کو دعوت دی گئی۔ وہ حاضر ہوئے اور کھانے کھائے بعض کتابوں میں یہ دعوت ولادت سے ساتویں دن بیان کی گئی ہے جب کھانے سے فراغت ہو چکی تو لوگوں نے حضرت عبد المطلب سے پوچھا اس مولود کا کیا نام رکھا ہے عبد المطلب نے کہا محمد (ﷺ) لوگوں نے پوچھا آپکو اپنے بزرگوں کے نام سے رغبت نہیں ہے۔ عبد المطلب نے فرمایا میں نے اس لئے اسکا نام محمد رکھا ہے کہ یہ خدا کے نزدیک آسمان پر بھی محمود اور اس کی خلقت کیلئے زمین پر بھی (محمود) ہو۔ اور یہ قول بھی آیا ہے کہ آپ کا یہ نام آپ کی ماں نے رکھا تھا جیسا کہ آپ کو خواب میں اس بچہ کے نام اور اکرام شان کے متعلق بتلایا گیا تھا۔ اور ان دونوں

---

[۱] منتہی الامال ص: ۱۷ ج: ۱

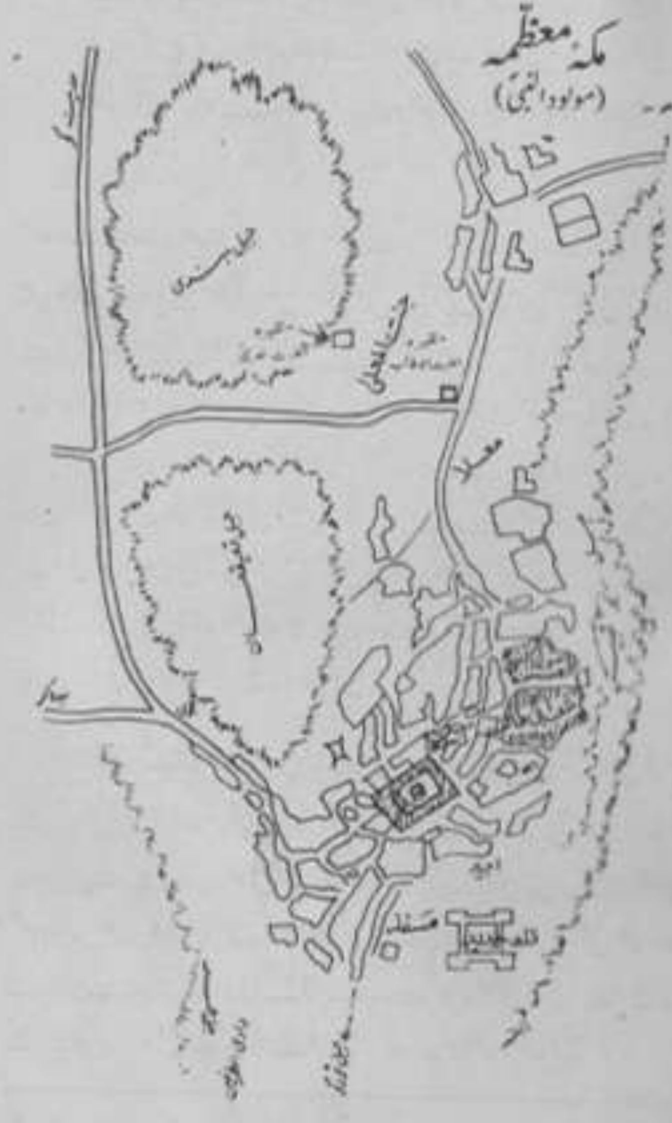

> مختلف اقوال میں اجماع ممکن ہے۔ اسطرح کہ آپ کی مادر گرامی قدر نے جو خواب میں مشاہدہ فرمایا ہو وہ آپ کے جد امجد سے دہرا دیا ہو اور کہدیا ہو کہ بچہ کا یہی نام رکھا جائے اور اسی کے مطابق تسمیہ واقع ہوا ہو۔ لیکن صحیح ترین یہی ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپکا نام احمد رکھا"
>
> (زرقانی ص: ۱۵۲ ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۱۷۸ ج: ۲)

اسماء والقاب مبارکہ : اسمائے رسالتمآبؐ کی بابت کتب احادیث میں متعدد روایات منقول ہیں۔ ان میں سے ایک جبیر بن مطعم کی یہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "میرے پانچ نام ہیں میں (۱) محمد ہوں (۲) احمد ہوں (۳) ماحی ہوں کہ اللہ تعالی میرے باعث کفر کو مٹاتا ہے (۴) حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر محشور ہونگے۔ (۵) اور میں عاقب ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں"[۱] اس حدیث میں پیغمبر خدا ﷺ نے ابتدائی دو ناموں کی کوئی تشریح نہیں کی جبکہ آخری تین ناموں کی وضاحت فرمائی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد کے تین نام اسمائے صفاتیہ ہیں جبکہ ابتدائی دو نام اسمائے ذاتیہ ہیں۔

آپ کے نام احمد کی بابت ابن سعد نے دو احادیث اس طرح بیان کی ہیں کہ "ابو جعفر محمد بن علی (حضرت امام محمد باقر علیہ السلام) سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ ہنوز بطن مادر ہی میں تھے کہ آمنہ کو حکم ہوا۔ ان کا نام احمد رکھنا" دوسری حدیث محمد بن علیؓ یعنی محمد حنفیہ سے روایت ہے کہ "انہوں نے (اپنے پدر بزرگوار) علی ابن ابی طالبؑ کو یہ کہتے سنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میرا نام احمد رکھا گیا"[۲]

---

[۱] طبقات ابن سعد ص: ۱۹۱ ج: ۱ [۲] طبقات ابن سعد ص: ۱۹۰ ج: ۱

احمد جو افعل التفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سب سے زیادہ حمد کرنے والا اور حمد کے معنی تعریف کے ہیں یہ لفظ صرف اللہ تعالی کے لئے مخصوص ہے جبکہ حمد کے دوسرے معنی شکر و رضا کے بھی ہیں ہمارے لئے ہر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا لازم ہے اور یہ سورہ "حمد ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اسطرح ہمیں ہر حال میں حمد و شکر کی تاکید کی گئی ہے۔ رسالتمآب ﷺ ہر وقت اور ہر موقع پر اللہ تعالی کی حمد و ثناء فرماتے تھے۔ آپؐ کا قلب مطہر حمد سے لبریز اور زبان مبارک پر کلمہ حمد جاری رہتا تھا۔ اسی کثرت حمد کے باعث اللہ نے آپکا نام احمد رکھا۔ جب حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل کو آپؐ کے ظہور کی خوشخبری دی تو احمد ہی کے نام سے دی۔ ارشاد باری ہے ترجمہ :" اور ایک پیغمبر جن کا نام احمد ہوگا اور میرے بعد آئیں گے ان کی خوشخبری سناتا ہوں"۔ اس آیت کے ضمن میں مولانا فرمان علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "اسرائیلیوں نے انجیلوں میں اس قدر ترمیم و تنسیخ کی کہ گویا انجیل ہی باقی نہیں رہی چنانچہ یہ پیشگوئی موجودہ انجیلوں میں نہیں ہے مگر میرے ایک دوست کے پاس جو لسن کے چھاپہ کی انجیل ہے اس میں بعینہ ان الفاظ کا ترجمہ موجود ہے"۔[۱]

رسول اکرم ﷺ کا اسم مبارک محمد "قرآن کریم میں چار مقامات یعنی سورہ فتح آیت ۲۹، سورہ آل عمران آیت ۱۴۴، سورہ احزاب آیت ۴۰ اور سورہ محمد آیت ۲ میں وارد ہوا ہے۔ کلمہ محمد کی اصل بھی حمد ہی ہے جس کے معنی ہیں بہت ہی تعریف کے لائق یا وہ شخص جس میں بکثرت قابل تعریف خصلتیں موجود ہوں یا وہ شخص جسکی بار بار تعریف کیجاتی ہو۔ ان تینوں مفہوم کے اعتبار سے آنحضرت کا نام آپؐ کی سیرت طیبہ کے عین مطابق ہے۔

---

[۱] (سورہ صف آیت ۶) القرآن حاشیہ ص: ۷۹۳

رسلتماب ﷺ کی متفقہ و مصدقہ کنیت ابو القاسم ہے اسکے علاوہ کتب سیرۃ و تاریخ میں آپؐ کے بہت سے القابات بیان کئے گئے ہیں۔ امام سمہودی نے اپنی کتاب اخبار الوفا میں رسلتماب کے ننانوے (۹۹) القابات معہ توجیہات نہایت تفصیل سے تحریر کئے ہیں۔ آپؐ کے مشہور ترین چند القابات خاتم النبیین، رحمت اللعالمین، افضل المرسلین، شہنشاہ کونین، رسول الثقلین وغیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یٰسین، مزمل، طٰہٰ، مدثر کے القابات سے مخاطب فرمایا ہے۔

نسب مبارک : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب مبارک عالم انسانی میں سب سے بہترین و افضل ترین ہے۔ آپ کا نسب پدری و مادری ہر دو اطراف سے نجیب و شریف اور لائق عزت و احترام ہے۔ پدری سلسلہ کے جد ششم اور مادری سلسلہ کے جد پنجم ایک ہی شخص کلاب بن مرہ ہیں۔ کلاب کے ایک بیٹے قصی اور دوسرے زہرہ تھے۔ قصی کی اولاد میں جناب عبداللہ اور زہرہ کی نسل میں بی بی آمنہ ہیں اور ان دونوں کی واحد اولاد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عدنان تک اپنا نسب درست و یقینی قرار دیا ہے جبکہ اس سے آگے کے ناموں میں نسب بیان کرنے والوں نے اختلاف کیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی آنحضرت ﷺ کے جدات و امہات کا سلسلہ نسب عدنان تک ہی تحریر کر رہے ہیں۔

رضاعت : چونکہ ماں کا رتبہ رضاعت سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اسلئے ماں کو مرضعات میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جناب آمنہ کے بعد سب سے پہلے آنحضرت کی رضاعت یعنی دودھ پلانے کا شرف آپکے چچا عبدالعزیٰ کی ایک کنیز ثویبہ کو نصیب ہوا۔ بقول صاحب معارج النبوۃ "جب ابولہب کی ایک کنیز ثویبہ نے اسے بھتیجے کی پیدائش کی سب سے پہلے خبر سنائی تو اس

نے اس خوشی میں ثویبہ کو آزاد کر دیا"۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ "ثویبہ کو ابولہب نے آزاد کر دیا تھا اور اسی وجہ سے اس نے رسول ﷺ کو دودھ پلایا تھا"۔[1] مولانا شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں کہ "سب سے پہلے آنحضرتؐ کو آپکی والدہ محترمہ نے اور دو تین روز بعد ثویبہ نے دودھ پلایا (جو ابولہب کی لونڈی تھی)[2] بروایت تجراۃ سے روایت ہے کہ

"رسول اکرمؐ کو پہلے پہل ثویبہ نے اپنے ایک لڑکے کیساتھ دودھ پلایا جسے مسروح کہتے تھے۔ یہ واقع حلیمہ کی آمد سے قبل کا ہے۔ ثویبہ نے اس سے پہلے حمزہ بن عبدالمطلب کو دودھ پلایا تھا اور اسکے بعد ابو سلمہ بن عبد الاسد المخزومی کو دودھ پلایا۔" (طبقات ابن سعد ص: ۱۹۵ ج: ۱)

فوق بلگرامی نے ابن سعد کے ایک اقتباس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

"رسولؐ ثویبہ کو برابر صلہ جات و عطایا عنایت فرمایا کرتے تھے اور جناب خدیجہ بھی اس کی بہت تکریم فرمایا کرتی تھیں۔----- قیام مدینہ کے زمانہ میں بھی آپ وہیں سے روپے پیسے اور کپڑے وغیرہ سے ثویبہ کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہجرت کے ساتویں سال جب غزوہ خیبر سے آپ مدینہ میں لوٹے تو سنا کہ ثویبہ مر گئی۔ آپ نے پوچھا کہ اس کے بیٹے مسروح کا کیا حال ہوا۔ کہا گیا کہ وہ تو اس سے قبل مر چکا تھا اور اب ثویبہ کے اقرباء سے کوئی باقی نہیں ہے"۔

(طبقات ابن سعد ص: ۱۸ مطبوعہ برمن ترجمہ: اسوۂ رسول ص: ۹ ج: ۲)

راویوں کا انداز بیان خواہ کیسا بھی ہو یہ امر مسلمہ ہے کہ عبدالعزیٰ عم رسول خدا جسے مورخین ابولہب کے نام سے پیش کرنے پر بضد ہیں کی کنیز ثویبہ ہی نے سب سے پہلے آنحضرتؐ کو دودھ پلایا تھا۔ جسے عبدالعزیٰ نے بھتیجے کی خدمت و رضاعت کے لئے آزاد کر دیا تھا۔

[1] طبقات ابن سعد ص: ۱۹۵ ج: ۱ [2] سیرت النبیؐ ص: ۱۷۳ ج: ۱

ثوبیہ کے بعد رضاعت کی خدمت جناب حلیمہ سعدیہ کو میسر آئی جسکی وضاحت کچھ اسطرح ہے کہ زمانہ قدیم سے عربوں میں یہ دستور رائج تھا کہ اشراف مکہ اپنے نومولود بچوں کی ابتدائی پرورش عرب کی اُن صحرائی عورتوں سے کرواتے تھے جو اسی مقصد کیلئے ہر سال مکہ آیا کرتی تھیں۔ اس دستور کی دو خاص وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ رؤسائے مکہ کا خیال تھا کہ شہر کی کثیف آب و ہوا میں ان کے بچوں کی بہتر نشوونما نہیں ہو سکتی اور وبائی امراض کا خطرہ بھی رہتا ہے جو اکثر و بیشتر شہر میں پھیلتے رہتے تھے۔ دوئم یہ کہ شرفائے مکہ زباندانی کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر میں بولی جانے والی زبان بیرونی الفاظ اور خارجی محاورات و اصطلاحات کے اثرات کے باعث فصاحت وبلاغت کے معیار پر قائم نہیں رہ پاتی جبکہ صحرائی قبائل کی زبان خالص، شیریں و شستہ ہوتی ہے۔

بہر حال ثوبیہ کی رضاعت کے دوران رضاعت کی تلاش میں صحرائی عورتوں کا ایک قافلہ مکہ آیا جس میں حلیمہ بنت عبداللہ بن حارث بن شجنہ بن جابر بھی تھیں۔ حلیمہ کے شوہر کا نام حارث بن عبدالعزیٰ بن رفاعہ بن بلال تھا اور انکا تعلق قبیلہ ہوازن کی شاخ بنو سعد سے تھا۔ سوئے اتفاق کہئے یا مشیت الٰہی، اس قافلہ کی تمام عورتوں کو رضاعت کیلئے بچے مل گئے مگر حلیمہ سعدیہ کا کہیں کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ وہ بچے کی تلاش میں جناب عبد المطلب کی در دولت پر پہنچیں تو جناب آمنہ نے آنحضرتؐ کی رضاعت کیلئے انہیں مقرر کرنا چاہا۔ حلیمہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بچہ یتیم ہے تو وہ پس و پیش کرنے لگیں مگر پھر خالی ہاتھ لوٹنے کی شرمندگی سے بچنے کیلئے جناب آمنہ کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ اس طرح ودیعت الٰہی کی خدمت رضاعت حلیمہ سعدیہ کے ذمہ ہوئی اور وہ اس در یتیم کو گلے کا تعویز بنا کر اپنے ساتھ لے گئیں اور آپؐ کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئیں۔ جب دو برس کے سن

میں آپ کی مدت رضاعت ختم ہوئی تو حلیمہ آپ کو لیکر مکہ آئیں۔ اس وقت شہر میں وبائی امراض پھیلے ہوئے تھے لہٰذا جناب آمنہ کے کہنے پر حلیمہ فوراً ہی آپؐ کو لیکر واپس لوٹ گئیں۔ ابن اسحاق نے آنحضرتؐ کی اس مدت رضاعت کو چھ سال بتایا ہے جبکہ عبدالباقی زرقانی نے مختلف بیانات کی روشنی میں فیصلہ کیا ہے کہ "قول راجح یہی ہے کہ آپ چار برس کے سن میں اپنی والدہ محترمہ کے پاس واپس آئے"[1] آنحضرتؐ بنو سعد میں اپنی پرورش کے زمانہ کا اکثر ذکر فرماتے اور اس قبیلے کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد فرماتے تھے۔ آپؐ حلیمہ سعدیہ کے ساتھ عزت و تکریم اور شفقت و عنایت سے پیش آتے تھے۔

طفولیت : خالق کونین نے فطرت صالحہ کے اعلیٰ ترین جوہر سے پیکر رسالت کو خلق فرمایا زمانہ رضاعت و طفولیت ہی سے پاکیزگی و طہارت، حیاو عفت، ضبط و تحمل، تہذیب و احتیاط کے اعلیٰ محاسن آپؐ کے طرز عمل سے ظاہر ہوتے تھے جو عموماً بچوں کی نفسیات و عادات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بالکل مختلف تھے۔ جن کی بابت جمال الدین محدث شیرازی نے حلیمہ سعدیہ کا تفصیلی بیان تحریر کیا ہے۔

ترجمہ : "حلیمہ کہتی ہیں کہ اسی وقت سے آپؐ کی پاکیزگی طبع کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپؐ نے روزمرہ کے کپڑوں میں عام بچوں کی طرح رفع حاجت نہ فرمائی۔ وقت کی پابندی اور احتیاط کا اسی زمانہ سے یہ حال تھا کہ رفع حوائج ضروریہ کیلئے وقت خاص مقرر تھا اسی وقت رفع حاجت فرمائی جاتی تھی اور پھر روز آئندہ کے وقت مقررہ تک اسکی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھ کو رفتہ رفتہ روز کے مشاہدے سے اس کا پورا علم و تجربہ ہو گیا اور میں روزمرہ وقت مقرر پر آپؐ کی ان ضروریات کو انجام دیدیا

[1] زرقانی ص : ۱۸۱ حوالہ اسوۃ الرسول ص : ۲۷ ج : ۱

کرتی تھی۔ حیاو عفت کا بچپن ہی سے یہ عالم تھا کہ اگر میری غلطی اور غفلت سے اگر کسی وقت آپ کا کشف ستر ہو گیا تو اس حیائے مجسم اور ناموس الٰہی کے خاص محرم پر غیظ و غضب کا ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا اور شرم و حیا کے وفور سے آپؐ فوراً رونے لگتے تھے میں دوڑ کر دوڑ پڑتی تھی اور کپڑا ڈال دیتی تھی۔ عام بچوں کی طرح رونا، دودھ کیلئے مچلنا میں نے رضاعت کے دو سالہ ایام میں کبھی نہ دیکھا۔ کبھی آپؐ نے کوئی چیز بائیں ہاتھ سے نہیں اٹھائی ہمیشہ سیدھے ہاتھ سے کام لیا"

(روضۃ الاحباب ص : ۹۰ ج : ۱ حوالہ اسوۃ الرسول ص : ۲۶ ج : ۲)

اسی مصنف نے آگے چل کر ام ایمن جو آپ کی محصنہ یعنی آیا (کھلانے والی) تھیں کا بیان نقل کیا ہے۔ امّ ایمن کہتی ہیں کہ :

ترجمہ : میں نے کبھی آپ کو بھوک و پیاس کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ ہر روز کا معمول تھا کہ میں آب زمزم کا شربت تیار کر کے دیدیتی تھی اور آپؐ پی لیتے تھے اور پھر شام تک کچھ بھی نہ مانگتے تھے۔ اکثر میں طعام چاشت (ناشتہ) تیار کر کے حاضر کرتی تو ارشاد فرماتے مجھ کو بھوک نہیں۔ (زرقانی ص : ۱۸۱ حوالہ اسوۃ الرسول ص : ۲۷ ج : ۲)

جب ایام رضاعت کے چار سال پورے ہو گئے تو جناب حلیمہ سعدیہ نے اس امانت بے بہا کو جناب آمنہ سلام اللہ علیہا کو لوٹا دیا۔ ابن سعد نے اس موقعہ کے واقعات کو اس طرح لکھا ہے۔

حلیمہ نے دیکھا کہ ایک ابر آنحضرتؐ پر سایہ گستر ہے۔ جب آپؐ ٹھہر جاتے ہیں تو وہ بھی ٹھہر جاتا ہے اور چلتے ہیں تو وہ بھی چلتا ہے۔ حلیمہ اس بات سے بھی ڈریں اور آنحضرتؐ کو لے کے چلیں کہ آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے سپرد کردیں اسوقت آپؐ پانچ برس کے تھے۔ وہاں سے لیکر چلیں تو مکہ کے قریب پہنچی تھیں کہ لوگوں کے مجمع میں سے آپؐ کو گم کر دیا تلاش کیا اور نہ پایا تو آ کے عبد المطلب کو خبر دی، عبد المطلب

نے بھی جستجو کی انہیں بھی نہ ملے تو عبد المطلب کعبہ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

لاھُمّ اَدِّ الی مُحمّداً اَدّہٗ الیَّ و اصطنع عندیے یدا

یا اللہ میرے شہسوار محمد کو مجھے دیدے، اسے مجھکو دیدے اور میرے پاس پہنچا دے اور اس عنایت کی بدولت مجھ پر اپنا فضل و کرم کر۔

انت الذی جعلتہ لی عضداً لا یبعد الدّھر بہ فیبعدا

یا اللہ تو نے اس لڑکے کو میرا بازو بنایا ہے۔ یا اللہ ایسا نہ ہو کہ زمانہ اس کو دور کردے تو پھر یہ دور ہی ہو جائے۔

انت الذی سمّیتہ محمداً

تو نے ہی تو اس کا نام محمد رکھا ہے اور اس کو ستودگی اور ستائش سے موسوم کیا ہے۔" (طبقات ابن سعد ص : ۱۷۱ ج : ۱)

کچھ ہی دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگئے عبد المطلب نے آنحضرتؐ کو گلے لگا لیا۔ بہر حال اسکے بعد آپؐ اپنے دادا اور مادر گرامی کے دامن عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ جب آپ کا سن مبارک چھ برس کا تھا تو آپؐ کی والدہ جناب آمنہ اپنے میکے والوں سے ملنے اور اپنے شوہر جناب عبداللہ کی قبر کی زیارت کرنے کی غرض سے مدینہ تشریف لے گئیں آنحضرتؐ کی والدہ اور آپؐ کی دایا اُم ایمن ساتھ تھیں آپؐ نے وہاں ایک ماہ تک قیام فرمایا۔ واپسی پر مقام ابواء میں جناب آمنہ علیل ہوئیں اور انتقال کر گئیں وہیں پر آپکی تجہیز و تکفین کر دی گئی اور اُمّ ایمن آپؐ کو لیکر مکہ واپس آئیں۔[1] اُمّ ایمن کی بابت شیخ عباس قمی نے لکھا ہے کہ

"امّ ایمن حبشیہ کہ کنیزک عبداللہ بود و برکہ نام داشت و بہ میراث بہ پیغمبرؐ رسیدہ بود بحضانت ونگاہ داشت"

[1] طبقات ابن سعد ص : ۱۷۱ ج : ۱، سیرت ابن ہشام ص : ۱۸۷ ج : ۱

ام ایمن حبشہ کی رہنے والی تھیں اور ان کا نام برکہ تھا یہ جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی کنیز اور آنحضرتؐ کی آیا یعنی کھلانے والی تھیں۔ (منتہی الامال ص: ۲۲ ج: ۱)

کفالتِ عبدالمطلب : مدتِ رضاعت پوری کر کے آغوشِ مادر میں آئے ابھی دو سال ہی ہو پائے تھے کہ مادرِ مہربان رحلت فرما گئیں۔ صغر سنی میں ماں کی شفقت سے محرومی لازمی طور پر آنحضرتؐ کیلئے سخت ترین قلق و رنج کا باعث تھی۔ لیکن شفیق و مہربان دادا نے اپنے پوتے کو گلے سے لگا لیا اور اس ودیعت خداوندی کی تمام خدمات اپنے ذمہ لیں۔ رسلتمآبؐ کی پرورش و پرداخت میں جناب عبدالمطلب کی زوجہ ہالہ بنتِ وہیب مادر حضرت حمزہؓ نے بڑی مدد و معاونت کی۔ جناب ہالہ نہ صرف رسلتمآبؐ کی دادی تھیں بلکہ آپ کی والدہ جناب آمنہ کے سگے چچا وہیب کی بیٹی تھیں اور جناب آمنہ و جناب ہالہ کا ایک ہی وقت اور ایک ہی نشست میں عقد ہوا تھا۔ جناب آمنہ کی پرورش جناب ہالہ کی ماں عیلہ بنت مطلب بن عبد مناف نے کی تھی۔ اس طرح جناب ہالہ متعدد رشتوں اور محبتوں سے منسلک ہونے کے باعث رسلتمآبؐ کو بہت زیادہ چاہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیلہ بنتِ مطلب کی بیٹی ہالہ بنت وہیب زوجہ جناب عبدالمطلب مادر حضرت حمزہؓ نے آنحضرتؐ کی پرورش میں خصوصی کردار ادا کیا۔

حالات پر غور کرنے سے عجیب انکشافات ہوتے ہیں اور واقعات میں تعجب خیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ابتدا ہی سے اپنے محبوب بندے کی زندگی کے ہر واقعہ کو خصوصیت عطا فرمائی تھی مثلاً (۱) عبد مناف کے بیٹوں میں ہاشم اور مطلب کی باہمی رفاقت اور ہاشم کا مطلب کو اپنا وصی بنانا (۲) مدینہ کے معزز خاندان بنی نجار کی خاتون سلمہ بنت عمرو سے ہاشم کی تزویج (۳) دوران سفر مکہ سے باہر

ہاشم کی وفات۔ (۴) ہاشم کی وفات کے بعد شیبہ کی مدینہ میں ولادت و پرورش۔ (۵) مطلب کا شیبہ کو مدینہ سے مکہ لانا اور کفالت کرنا۔ (۶) چچا بھتیجے یعنی مطلب اور شیبہ میں بے حد پیار و محبت یہانتک کہ شیبہ کا چچا کی نسبت سے عبدالمطلب کہلوانا۔ (۷) عبداللہ کا قرعہ کے ذریعے ذبیح اللہ ثانی ہونے کے باعث پورے خاندان کی محبت والفت کا مرکز بن جانا۔ (۸) مدینہ کے قبیلہ بنی زہرہ کی خاتون جناب آمنہ بنت وہب سے عبداللہ کا عقد ہونا۔ (۹) عیلہ بنت مطلب اور وہب کے بڑے بھائی وہیب کی بیٹی ہالہ سے عبدالمطلب کا عقد کرنا۔ (۱۰) عیلہ اور وہیب کی کفالت و سرپرستی میں جناب آمنہ کی پرورش۔ (۱۱) جناب عبداللہ کا دوران سفر مکہ سے باہر انتقال کرنا۔ (۱۲) جناب عبداللہ کی وفات کے بعد حضرت محمد ﷺ کی ولادت۔ (۱۳) کمسنی میں آنحضرتؐ کی والدہ کا انتقال اور دادا کی کفالت۔ (۱۴) دادا کے انتقال کے بعد چچا کی کفالت و حفاظت اور شدید محبت۔ ان تمام واقعات و حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسلتمآبؐ کی پرورش و پرداخت میں مشیت الٰہی کا حقیقی نظام کار فرما تھا۔ جسکے تحت تمام ظاہری اسباب بہت پہلے سے متعین ہوتے چلے آرہے تھے۔ بہر حال جیسا کہ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ جناب عبدالمطلب کو اپنے یتیم پوتے سے بے انتہا محبت تھی۔ یہانتک کہ وہ اپنی صلبی اولاد پر بھی اپنے اس پوتے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم یہاں ابن سعد کا ایک مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں :

"جناب آمنہ نے وفات پائی تو جناب رسلتمآب ﷺ کی پرورش و پرداخت کے تمام امور حضرت عبدالمطلب سے متعلق ہوئے اور حضرت عبدالمطلب نے اپنے محاسن اشفاق کے وہ مسالک آپ کیساتھ اختیار فرمائے جو اپنی کسی اولاد کے ساتھ بھی نہیں ظاہر فرماتے تھے۔ تمام گھر والوں میں اس وقت قریب ترین و عزیز ترین یہی تھے۔ خلوت

و جلوت میں آپ کو برابر ساتھ رکھا کرتے تھے اور آپ کیساتھ سویا کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد ص: ۵۰ ج: اطبع بر مین ص: ۱۰۹ ج: ا کراچی)

خاندان کے بزرگ اور متولی خانہ کعبہ ہونے کے باعث جناب عبدالمطلب کی بڑی عزت تھی عربوں کی قدیم تہذیب کے مطابق ہر خاص و عام محفل میں انکی نشست مخصوص ہوتی تھی جس پر آپ کے سواء کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ حتیٰ کہ آپ کے بیٹوں میں سے بھی کوئی یہ جرات نہیں کر سکتا تھا لیکن جناب عبدالمطلب نے اپنے پیارے پوتے کو ان تمام پابندیوں سے مستثنٰی قرار دے رکھا تھا۔[1] حضرت عبدالمطلب کی کفالت سے متعلق واقعات ہم جلد اول میں تحریر کر چکے ہیں۔

ابھی آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال دو مہینے دس دن ہوئی تھی کہ مونس و ہمدرد دادا بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ جب جناب عبدالمطلب کا انتقال ہوا تو آنحضرتؐ اپنے مشفق و مہربان دادا کے غم میں بہت ملول ہوئے۔ ام ایمن کی سند سے ابن سعد نے لکھا ہے کہ "میں نے اس دن دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ عبدالمطلب کے تابوت کے پیچھے پیچھے روتے جاتے تھے"۔[2]

کفالت ابو طالب : وفات سے قبل جناب عبدالمطلب نے اپنے پیارے پوتے کی کفالت و حفاظت کے لئے اپنی تمام اولاد میں سے جناب ابو طالب کا انتخاب کیا۔ بعد میں پیش آمدہ واقعات سے ثابت ہو گیا کہ یہ انتخاب بے مثال و لاجواب تھا۔ رسلتمآبؐ کی کفالت و حفاظت کا یہ زمانہ جناب ابو طالب کے ہمت و استقلال اور صبر و استقامت کی آئینہ تھا۔ نامساعد حالات، مخالفت قریش، دشمنوں کی یورش کے باوجود جناب ابو طالب اپنے محبوب بھتیجے کی حمایت و حفاظت میں ہر وقت مشغول رہتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ " ابو طالب مال و دولت والے نہ تھے مگر

[1] سیرت ابن ہشام ص: ۱۰۸ ج: ۱ [2] طبقات ابن سعد ص: ۱۸۱ ج: ۱

آنحضرتؐ کو بہت ہی چاہتے تھے حتیٰ کہ اپنی اولاد کیساتھ بھی اتنی محبت نہ تھی۔ سوتے تو آنحضرتؐ بھی انہی کے پہلو میں سوتے باہر نکلتے تو آنحضرتؐ بھی ساتھ ہوتے۔ یہ گرویدگی اتنی بڑھی، اس حد تک پہنچی کہ کسی شے کے ابو طالب اتنے گرویدہ نہ ہوئے تھے۔ "[1] کھانے کے وقت جناب ابو طالب یہ اہتمام فرماتے کہ جب تک آنحضرتؐ تشریف نہ لاتے آپ اپنے بچوں کو کھانا شروع نہ کرنے دیتے اور اپنے بچوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کیساتھ کھانے سے تمھارے کھانوں میں برکت ہوتی ہے۔ یہ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ جناب ابو طالب کو اپنے بھتیجے سے صرف محبت مربیانہ ہی نہ تھی بلکہ عظمتِ عقید تمندانہ بھی تھی جو معرفتِ رسالتؐ کا بین ثبوت ہے۔

گلہ بانی : خلوت و محویت کے عالم میں معرفت الٰہی کے حصول کی بابت غور و خوض اور صانع قدرت کے عجائبات کی حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کی خاطر اللہ رب العزت نے اپنے محبوب بندے کی ابتدائی تعلیم کے لئے گلہ بانی کا وہی قدیم طریقہ کار مقرر فرمایا جس کا اہتمام سابقہ انبیاء علیہم السلام کیلئے مقرر فرمایا تھا۔ جب آپ کا سن مبارک دس برس کا ہوا تو آپؐ نے اپنے گھر کی دنبیوں کی گلہ بانی شروع کی۔ جس کا ذکر آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں بیان کی جانے والی روایتوں میں سے ایک روایت اس طرح ہے کہ۔

"جناب رسلتمآب صلعم نے ارشاد فرمایا کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے گوسفند کی گلہ بانی کی ہیں۔ اصحاب حاضرین نے پوچھا اور آپ نے یا رسول اللہ، ارشاد فرمایا! ہاں میں نے بھی اہل مکہ کی دنبیاں قراریط میں چرائی ہیں۔" (طبقات ابن سعد ص: ۱۹۲ ج: ۱)

[1] طبقات ابن سعد ص: ۱۸۴ ج: ۱

مذکورہ قول رسولؐ میں لفظ قراریط سے ابن ماجہ و بخاری نے درہم و دینار مراد لیکر اس سے اجرت کا مطلب نکالا جس کے باعث یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ "ابو طالب چونکہ محمد کو ذلیل رکھتے تھے اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے۔" اس بدگمان خیال کی وضاحت مولانا شبلی نعمانی نے اس طرح کی ہے۔

"قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے اس بناء پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرتؐ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے اسی بناء پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا ہے۔ لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں حث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے۔(عینی ج:٦ ص:٦٣١)، نور النبراس میں یہ حث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔" (سیرت النبیؐ ص: ١٧٨ ج:١)

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ قراریط ایک غیر آباد قطعہ زمین کا نام تھا جو نواحِ مکہ میں مقام اجیاد کے قریب تھا نہ کہ درہم و دینار کا ٹکڑا۔ مزید برآں یہ بھی ذہین نشین ہونا چاہئے کہ اولاً نہ تو زمانہ قدیم میں بکریاں، دنبیاں چرانا کوئی معیوب فعل سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی اس کام سے کوئی تذلیل کا پہلو نکلتا تھا۔ ثانیاً اس زمانہ میں شرفائے عرب کے بچے تو کجا پیغمبران اولوالعزم بھی اپنے بچپن میں گلہ بانی کرتے آئے ہیں اور ان کیلئے حصول معرفتِ الٰہی کی ابتدائی درسگاہ یہی گلہ بانی ہوتی تھی۔

سفرِ شام: آنحضرتؐ نے بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا جناب ابو طالب

کے ہمراہ ملک شام کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران بحیرا راہب کا مشہور واقعہ پیش آیا جسے تمام مستند مورخین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ابن سعد نے انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا تحریر کیا ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ جب بارہ برس کے ہوئے تو غرض شام میں تجارت کرنے کیلئے ایک قافلہ روانہ ہو رہا تھا، ابو طالب بھی آنحضرتؐ کو لیکر نکلے اور قافلہ کیساتھ ہو لئے۔ اہل قافلہ بحیرا راہب کے پاس جاکر اترے، رسول اللہ ﷺ کے متعلق بحیرا نے ابو طالب سے جو کہنا تھا کہا اور انہیں حکم دیا (تاکید کی) کہ آنحضرتؐ کی حفاظت کریں اسی بناء پر آنحضرت علیہ السلام کو لے کے ابو طالب مکے آئے"۔

(طبقات ابن سعد مطبوعہ کراچی ص: ١٨٣ ج:١ اور مطبوعہ برمن ص: ٧٦ ج:١)

طبری اور ابن ہشام نے اس واقعہ کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے[1] مولانا شبلی نعمانی نے تحریر کیا ہے کہ "مسلمانوں سے زیادہ عیسائیوں کو اس واقعہ سے شغف رہا ہے عیسائی مورخین اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہؐ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور اسی کے بتائے ہوئے نکتوں پر آنحضرتؐ نے اسلام کی بنیاد رکھی"۔[2]

مذکورہ کتب میں اس واقعہ کی تفصیل پڑھنے سے کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بحیرا نے آنحضرتؐ کو کچھ سکھایا تھا۔ اس واقعہ کی صورتحال صرف اتنی سی ہے کہ بحیرا راہب کتب قدیم کا عالم تھا اس نے جو کچھ ان کتب سے علم حاصل کیا تھا اسی کی روشنی میں اس نے آنحضرتؐ کو پہچان لیا تھا لہٰذا اس نے آنحضرتؐ کی حفاظت کے لئے جناب ابو طالب کو ہدایت کی تھی اور بس۔

[1] تاریخ طبری ص: ٥٩ ج:١، سیرۃ ابن ہشام ص: ٢٠٣ ج:١ [2] سیرۃ النبیؐ ص: ١٣٠ ج:١

بحیرا راہب نے نبوت و رسالت کی وہ تمام صفات جو اس نے اپنی کتب و صحائف میں پڑھیں تھی۔ آنحضرتؐ کی ذاتِ بابرکات میں تمام کمال و مشاہدہ کیے جن کی خود تصدیق کی اور دوسروں سے کرائی بحیرا راہب کا یہ واقعہ اسلام کی صداقت اور مظہر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت کا معیار عظیم ہے۔ آنحضرتؐ کی صفات قدسیہ اور کمالات نبویہ کے متعلق ایک نصرانی عالم کا اقرار و اعتراف اس کی تصدیق و توثیق در حقیقت اصول اسلام کی بنیاد کو ایسی مستحکم و استوار کرتی ہے جسے نصرانیت و رہبانیت کے دیو ہرگز متزلزل نہیں کر سکتے۔

حربِ فجار: جب آنحضرتؐ کی عمر مبارک بیس برس کی ہوئی تو عرب کی مشہور جنگ حربِ فجار واقع ہوئی۔ یہ جنگ قبیلہ قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان عکاظ کے مقام پر ہوئی تھی۔ مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق تقریباً تمام قبائل اپنے اپنے حلیف قبیلے کے دوش بدوش اس جنگ میں شریک ہو گئے۔ چونکہ یہ جنگ ایام الحرام یعنی ان دنوں میں ہوئی جن میں جدال و قتال قطعی ممنوع تھا اسی لئے اس جنگ کا نام حربِ فجار پڑا اور یہ زمانہ جاہلیت کی آخری جنگ تھی۔ جس میں فریقین نے اپنے اپنے حریفوں کو اس کثرت سے قتل کیا کہ لوگ چیخ اٹھے اور صلح کیلئے آواز بلند کی صلح ہو گئی اور فریقین اپنے اپنے مقام پر چلے گئے۔

اس جنگ میں آنحضرتؐ نے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کے ہمراہ شرکت فرمائی۔ گو کہ آپ سنِ بلوغ کو پہنچ چکے تھے اور جنگ میں لڑنے کے قابل تھے مگر آپ نے فرمایا ہے کہ "میں اپنے چچاؤں کو وہ تیر دیتا جاتا تھا جو دشمنوں کی جانب سے آتے تھے"۔[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کا طرزِ عمل مدافعانہ تھا۔ اسی بات کو امام سہلی کے حوالہ سے مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ٢١٠ ج:١

"آپ نے اس لڑائی میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا تھا کیونکہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی نیز یہ وجہ بھی تھی کہ فریقین کافر تھے اور ان کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو"۔ (سیرت النبیؐ ص: ۱۸۳ ج: ۱)

تجارت : جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سن رشد کو پہنچے تو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی لہٰذا آپؐ نے اپنے آبائی پیشہ یعنی تجارت کو اپنایا۔ آپؐ کے سامنے اس کی دو صورتیں تھیں اول یہ کہ ذاتی سرمایہ سے کاروبار کریں، دوئم یہ کہ کسی سرمایہ کار کے مال تجارت کو اجارہ کی بنیاد پر حاصل کریں۔ آپؐ کیلئے پہلی صورت اس لئے ناممکن تھی کہ نہ تو آپؐ کے پدر بزرگوار ہی ورثہ میں کوئی دولت چھوڑ گئے تھے اور نہ ہی آپ کے چچا اپنی کثیر العیالی اور خرچ عیالداری کے باعث کوئی سرمایہ فراہم کرنے کے قابل تھے لہٰذا آپؐ نے دوسری صورت پر عمل کیا۔ اس زمانہ میں یہ رواج عام تھا کہ سرمایہ دار تجار، دیانتدار وایماندار افراد کو اپنا مال تجارت دیکر اجرت یا شراکت کی بنیاد پر قافلوں کے ساتھ بھیجا کرتے تھے۔ چونکہ آنحضرتؐ کے حسن معاملت، دیانت، امانت اور صداقت سے اہل مکہ بخوبی واقف تھے اور انہی خوبیوں کے باعث آپؐ کا لقب امین مشہور تھا۔ لہٰذا ہر سرمایہ دار اپنا مال تجارت آپؐ کے سپرد کرنے کا متمنی تھا انہی لوگوں میں حضرت خدیجہ بھی تھیں۔ یہ خاتون مکہ کی مالدار ترین تاجرہ تھیں۔ بقول شبلی نعمانی:

"ان کی تجارت کا یہ حال تھا کہ جب قافلہ تجارت شام کو جاتا تو اس میں اکیلا ان کا مال تمام لوگوں کے مال کے برابر ہوتا تھا۔ تجار آپ سے مال لیکر تجارت کیلئے جاتے تھے۔" (سیرۃ النبیؐ ص: ۱۸۷ ج: ۱)

ابن سعد نے نفیسہ بنت منیہ اور عبداللہ بن عقیل سے دو روایتیں بیان کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ کا سن مبارک پچیس

برس کا ہوا تو جناب ابو طالب نے آپؐ سے کہا کہ تجارتی قافلہ کا شام کی طرف جانے کا وقت آگیا ہے خدیجہ بنت خویلد اپنے تجارتی قافلوں میں لوگوں کو بھیجا کرتی ہیں اگر تم آمادہ ہو تو وہ تم کو فوراً منظور کرلیں گی۔ عبداللہ ابن عقیل کی روایت میں ہے کہ ابوطالب نے خدیجہ سے معاوضہ طے کیا کہ دوسروں کو دو جوان اونٹوں کے مقابلہ میں آپؐ کیلئے چار جوان اونٹ دیئے جائیں۔ حضرت خدیجہ نے یہ کہہ کر قبول کرلیا کہ "اگر کسی دوسرے دور دراز شخص آدمی کیلئے بھی تم یہ سوال کرتے تو میں ایسا ہی کرتی، چہ جائے کہ تم نے تو ایک قریبی دوست کیلئے یہ خواہش کی ہے۔[۵]

بہر حال آنحضرتؐ نے بھی اس پیشکش کو قبول کرلیا اور خدیجہ کے غلام میسرہ کے ہمراہ آپؐ مال تجارت لیکر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اثنائے سفر میں ایک پڑاؤ کے دوران نسطورا راہب کا واقعہ پیش آیا۔ اسی سفر کے دوران میسرہ نے آپؐ کے اوپر ابر کو سایہ فگن دیکھا۔ الغرض آپ کے حسن تدبیر سے تجارت میں توقع سے زیادہ فائدہ ہوا۔ جب تجارت سے فارغ ہو کر قافلہ واپس مکہ پہنچا تو میسرہ نے اپنے تمام مشاہدات جناب خدیجہ سے بیان کئے جو حضرت خدیجہ کے میلان خاطر کا باعث بنے اور جناب خدیجہ کی طرف سے تزویج کی سلسلہ جنبانی شروع کی گئی۔

تزویج : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت خدیجہؓ سے تزویج کی بابت چند مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ابن ہشام اور ابن سعد وغیرہ کے مطابق صحیح تر روایت نفیسہ بنت منیہ کی ہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ

"نفیسہ کا بیان ہے کہ شام سے قافلہ تجارت آنے کے بعد جناب خدیجہ نے مجھ کو رسالتمآبؐ کی خدمت میں پیغام نکاح لیکر بھیجا۔ میں نے حاضر

[۵] طبقات ابن سعد ص: ۲۰۰ ج: ۱

خدمت ہو کر عرض کی۔ اے محمد (صلعم) آپکو اب اپنا بیاہ کر لینے کیلئے کون شے مانع ہے؟ آپؐ نے فرمایا! میرے ہاتھ میں کیا ہے جس سے میں اپنا بیاہ کا قصد کروں۔ میں نے کہا اگر میں اس امر میں آپؐ کی مدد کروں اور ایک ایسی جگہ آپ کی نسبت لگا دوں جو صاحب شرف بھی ہو اور صاحب دولت بھی تو کیا آپؐ اسے قبول فرمائیں گے؟ آپؐ نے دریافت فرمایا کون ہے؟ میں نے کہا خدیجہ آپؐ نے ارشاد فرمایا وہ اس پر کیسے راضی ہوں گی۔ میں نے کہا یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ آپؐ نے آمادگی ظاہر فرمائی۔ نفیسہ کہتی ہیں کہ میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد سن کر خدیجہ کے پاس پہنچی اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔ جناب خدیجہ نے اسی روز نکاح مقرر فرما کر آنحضرت صلعم کو کہلا بھیجا اور اپنے چچا عمرو بن اسد کو بھی اسکی خبر کر دی۔ وقت مقررہ پر جناب رسالتمآب صلعم اپنے چچاؤں کے ساتھ حضرت خدیجہ کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے اور آپؐ کے چچاؤں میں سے ایک صاحب نے آپؐ کا خطبہ نکاح پڑھا"

(طبقات ابن سعد ص: ۲۰۳ ج: ۱)

مندرجہ بالا روایت میں خطبہ نکاح پڑھنے والے چچا کا نام نہیں لیا گیا۔ جب کہ ان کا نام اور خطبہ کی عبارت لفظاً بہ لفظاً متعدد مستند کتب میں موجود ہے۔ شبلی صاحب نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ "جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچسو طلائی درہم مہر قرار پایا۔" جبکہ امام قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں، علامہ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں، امام الحرمین برزنجی نے سنی المطالب میں اور امام دولابی نے اس خطبہ کو بیک لفظ تحریر کیا ہے۔ جسے فوق بلگرامی نے زرقانی سے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

" الحمدللہ الذی جعلنا من ذریہ ابراھیم ذرع اسماعیل وضئضئی معدو عنصر مضر و جعلنا حضنہ بیتہ و سواس حرمہ

وجعل لنا بیتاً محجو جا و حرماً امنا و جعلنا حکام الناس ثم ان ابن اخی ھذا محمدبن عبداللہ لا یوزن برجلِ الارجح بہ شرفا و نبلا و فضلا و عقلاً فان کان فی المال قل فان المال ظل زائل و امر حائل دعاریتہ مسترجعتہ و محمد قد عرفتم قرابتہ و قد خطب خدیجہ بنت خویلد و بزل لہا ما آجلہ و عا جلہ کذا وھو واللہ بعد ھذا لہ بناء عظیم وخطر جلیل جسیم"

(سیرۃ النبیؐ ص: ۱۲۹ ج: ۱، السیرت النبویہ ص: ۱۰۶ ج: ۱، سیرت الحلبیہ ص: ۱۶۵ ج: ۱، شرح البلاغہ ص: ۳۱۴ ج: ۹، تذکرۃ الخواص ص: ۳۱۲)

ترجمہ: شکر ہے اس معبود کا جس نے ہمیں ابراہیمؑ کی ذریت اسمٰعیل کی نسل، معد کا معدن، مضر کا جوہر، کعبہ کا نگران اور حرم کا محافظ بنایا۔ حرم وکعبہ کو ہمارے حوالے کر کے ہمیں تمام لوگوں کا حاکم بنایا۔ یاد رکھو! یہ میرا بھتیجا محمدؐ شرافت، نجابت، فضل، عقل کے اعتبار سے تمام دنیا سے بہتر ہے۔ یہ اگرچہ مالی اعتبار سے کمزور ہے۔ لیکن مال کیا چیز ہے؟ ایک ڈھلتا ہوا سایہ، ایک پلٹا کھانے والی شے، ایک واپس ہونے والی عاریت، تم لوگ محمدؐ کی قرابت سے واقف ہو، اب انہوںؐ نے خدیجہ بنت خویلد کو پیغام دیا ہے اور مہر مقرر کیا ہے۔ یاد رکھو ان سب باتوں کے علاوہ محمدؐ بڑا جلیل القدر اور عظیم المرتبہ انسان ہے"۔

(ابوطالب مومن قریش ص: ۱۲۹)

اسکے علاوہ حافظ جمال الدین محدث شیرازی نے جناب ابوطالب کے یہ الفاظ بھی تحریر کئے ہیں:

"ترجمہ: خدیجہ بنت خویلد کا (محمد صلعم کی طرف سے) میں خطبہ نکاح پڑھتا ہوں اور اسکے مہر موجل اور معجل میں دس مہار اونٹ جو میری

ملکیت سے ہیں ادا کرتا ہوں۔" (روضۃ الاحباب ص: ۱۰۶ حوالہ اسوۃ الرسول ص: ۹۷ ج: ۲)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جناب ابو طالب نے رسالتمآبؐ کے نکاح کا آغاز الحمدُ للہ سے کیا۔ درآنحالیکہ یہ الفاظ اس سے قبل نہ کہے گئے اور نہ سنے گئے اور نہ ہی اسکے بعد کسی نے یہ کلمات ادا کئے حتیٰ کہ پندرہ سال بعد آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت سے نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا تب اللہ تعالیٰ نے یہ کلمات نازل فرمائے جس کے بعد سے امت مسلمہ ان کلمات کا کثرت سے ورد کر کے اپنے رب کی حمد کرتی ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ یہ ہے شانِ ایمان ابو طالب۔

ورقہ کا خطاب : جناب ابو طالب کا خطبہ نکاح ختم ہونے کے بعد ورقہ بن نوفل نے یوں تقریر کی:

"وہ خدا قابل ستائش ہے جس نے ہم لوگوں کو ان اوصاف سے موصوف کیا جن کا ابو طالب نے ذکر کیا اور ہم لوگوں کو وہ فضائل عنایت کئے جن کا شمار و انحصار آپ نے فرمایا۔ ہم سردار قوم معرب ہیں اور پیشوائے قوم۔ اور آپ حضرات (بنی ہاشم) وہ بزرگوار ہیں جن کے فضائل سے کسی قبیلہ اور عشیرہ کا انکار ہو ہی نہیں سکتا اور آپ کے مفاخر و مشارف پر کسی فرد واحد کو حرف گیری کی جرات ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم لوگوں نے بطیب خاطر آپ حضرات سے پیوند کرنا چاہا اور آپ کے مشارف میں شریک ہونا قبول کیا۔ اے معاشر قریش آپ حضرات اس کے گواہ رہنا کہ میں نے خدیجہ بنت خویلد کو محمد بن عبد اللہ کے ساتھ چار سو دینار مہر پر بیاہ دیا۔"

(زرقانی ص: ۲۰۲ بحوالہ ترجمہ: اسوۃ الرسول ص: ۸۰ ج: ۲)

چونکہ حضرت خدیجہ کے والد خویلد حرب فجار میں یا اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے لہذا یہ نکاح حضرت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد کی سرپرستی

میں ہوا۔ نکاح کے بعد آنحضرتؐ نے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا جس میں تمام قریش نے شرکت کی۔

مولانا شبلی نعمانی نے تحریر کیا ہے کہ "شادی کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس برس تھی اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔"[1]

تعمیر کعبہ : کعبۃ اللہ کی تعمیر کا واقعہ ۳۵ عام الفیل میں پیش آیا۔ اس وقت تک کعبہ کی عمارت قدِ آدم چار دیواری کی شکل میں تھی جس پر نہ چھت تھی اور نہ کوئی دروازہ تھا۔ اہلِ عرب اس چار دیواری کی آرائش کرتے اور نہایت عقیدت و احترام سے ہر سال ریشمی پردے چڑھایا کرتے تھے۔ اس چار دیواری کی سادگی و بے قاعدگی اس کی قدامت و عظمت کی آئینہ دار تھی۔ مورخین نے اس کی تعمیر نو کی دو وجوہات بیان کی ہیں۔ اول یہ کہ "ایک عورت نے وہاں خوشبو سلگائی جس کی چنگاری پردہ پر پڑ گئی اور پھر تمام جل گیا۔" چھت نہ ہونے کے باعث کوئی نقصان تو نہ ہوا البتہ دیواریں سیاہ اور بد نما ہو گئیں جو اس کی تعمیر نو کا باعث بنی۔ دوئم یہ کہ مکہ کے اطراف واقع پہاڑیوں سے برسات کا پانی سیلاب کی شکل میں آتا تھا جس سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچتا تھا۔ لہذا عربوں نے اس کی تعمیر نو کا قصد کیا۔ حسنِ اتفاق سے انہی دنوں جدہ کے قریب مقام شعیبہ کے ساحل پر ایک جہاز ناکارہ ہو گیا۔ قریش کو جب اس کا علم ہوا تو وہ وہاں پہنچے اور اس جہاز کی لکڑیاں خرید لیں نیز اسکے مالک "باقوم" کو جو روم کا رہنے والا عیسائی تھا اپنے ساتھ لے آئے۔

جب تمام انتظامات ہو گئے تو موجودہ عمارت کو منہدم کر دیا اور سیلاب سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اس کی بنیادوں کی بلندی

[1] سیرۃ النبی ص: ۱۸۹ ج: ۱

دوگنا کر دیا گیا جب کہ طول و عرض میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ جتنی لکڑی موجود تھی اتنی چھت ڈال دی گئی اور ایک نئی دیوار کھینچ کر بقیہ زمین پر چار دیواری بنا دی گئی جو "حطیم" کہلائی۔ جب حجرِ اسود کو نصب کرنے کا وقت آیا تو ہر شخص اس اعزاز کے حصول کا آرزو مند ہوا۔ ابتداء میں تکرار پھر لڑائی کی نوبت آگئی۔ سب سے زیادہ بنو عبد الدار کا قبیلہ کشت و خونریزی پر آمادہ ہوا۔ خدا کے بندوں نے خدا کا گھر تو بنا لیا لیکن اپنے گھر اجاڑنے پر کمربستہ ہو گئے۔ اسی بحث و تکرار میں چار دن گزر گئے۔ آخر کار قریش اس امر پر متفق ہو گئے کہ دوسرے دن صبح جو شخص سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو گا وہی اس منصبِ جلیلہ کو انجام دے گا۔ دوسرے دن صبح سب سے پہلے آنے والے اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ سب نے آپؐ کی ذات مقدسہ پر اتفاق کیا۔ اللہ کے رسولؐ نے اپنی ردائے مبارک بچھا دی اور اس پر حجرِ اسود کو رکھ کر قبائل قریش چار ممتاز قبائل کے سرداروں کو ردائے مبارک کا ایک ایک کونہ پکڑا دیا۔ یہ لوگ حجر اسود کو مقام تک لائے پھر آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے رکن کو اسکے مقام پر نصب کر دیا۔ اس طرح آنحضرتؐ کی برکت سے قریش کا اختلافی مسئلہ حل ہوا اور دورِ جہالت کا ایک بڑا فساد ٹل گیا اور کعبۃ اللہ کی عمارت بن گئی۔

حضرت علی کی کفالت : یہی وہ زمانہ تھا جب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا جناب ابو طالب کی عیالداری میں معاونت کیلئے انکے ایک فرزند جعفر کو عباس بن عبد المطلب کی سرپرستی میں دلوایا اور دوسرے فرزند علیؑ کو خود اپنی کفالت و تربیت میں لیا۔ اس وقت آنحضرتؐ کی عمر مبارک پینتیس ۳۵ سال اور حضرت علیؑ کا سن مبارک دس سال تھا۔ اس واقعہ کو طبری، ابن سعد، ابن ہشام وغیرہ نے تفصیل سے لکھا ہے اور ہم بھی اس کتاب کی جلد اول میں تحریر کر آئے ہیں۔

اسباب رسالت : ظہور اسلام سے قبل عرب ہی کیا مجموعی طور پر تمام اقوام عالم مذہبی، سیاسی، اخلاقی و معاشرتی الغرض ہر اعتبار سے نیکی سے محروم اور شر و فساد میں مبتلا ہو چکی تھی۔ وحدانیت کا تصور معدوم اور کفر و شرک راسخ ہو چکا تھا۔ جس ہمہ گیر اصلاح کی دنیا محتاج تھی اسکے لئے پیغمبرانہ دست وبازو کی ضرورت تھی اور یہی وہ اسباب تھے جن کی بناء پر اللہ جل شانہُ نے اپنے محبوب ترین بندے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث برسالت فرمایا۔ گمراہی میں ڈوبی ہوئی نسل آدم کی حالتِ زار کو مورخین نے تفصیل سے تحریر کیا ہے مگر ہم صفحات کی کمیابی کے باعث حالات کو مختصراً پیش کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد بہت سے پیغمبر مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنی اپنی قوموں کو خدا پرستی کی جانب راغب کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مصلحین تھے جنہوں نے اصلاح معاشرہ کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں لیکن زود فراموش اقوام نے توحید و اخلاق کے تمام سبق فراموش کر دیئے اور چھٹی صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ کرۂ ارض کے کسی بھی حصہ میں خدا شناسی اپنی حقیقی شکل میں باقی نہ رہی۔ اگر کسی قوم میں نورالٰہی کی کوئی کرن تھی بھی تو اس پر جہل کے اتنے دبیز پردے پڑ گئے تھے کہ اس کی اصل صورت مسخ ہو گئی تھی۔

روم و فرہنگ جو دین کے پیشوا اور دنیا کے تاجدار تھے ان کی زبوں حالی کا عالم یہ تھا کہ عیسائیت پال کے ہاتھوں مسخ ہو چکی تھی، توحید کی جگہ تثلیث نے لے لی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ اور بی بی مریمؑ کے مجسموں کی پرستش کی جاتی تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی خانقاہیں عیش و نشاط کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ سفاکی اور ہوس پرستی عام تھی۔

ایرانی قوم بھی توحید خالص سے ناآشنا تھی۔ زرتشت اور مانی نے جو اخلاقی آگ روشن کی تھی وہ یزدان و اہرمن کی اوس پڑنے سے سرد ہو گئی تھی۔ حکمرانوں کو راہب کا درجہ حاصل تھا اور رعایا ان کی پرستش کرتی تھی۔ ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا۔ ظلم و جور کی حکمرانی تھی۔ آئے دن کے سیاسی انقلابوں نے ملک کا امن و سکون تباہ کر دیا تھا۔

ہندو دھرم کی حالت سب سے بدتر تھی اس مذہب کے پیرو کبھی بھی ایک خدا کے قائل نہ تھے اور نہ ہیں۔ یہ قوم ابتدا ہی سے شرک و بت پرستی میں مبتلا ہے۔ اوہام پرستی نے ان کے بے شمار خدا بنا دیئے جن کی پوجاپاٹ ان کا دھرم ہے۔ ان کے مصلحین کرشن، گوتم بدھ، اشوک وغیرہ نے فلسفیانہ روحانیت کا درس دیا مگر ان کی قوم تمام درسوں کو بھلا کر براہوں کی تعلیم پر عمل کرنے لگی۔ اور یہ قوم طبقات میں بٹ گئی اور ہر نچلا طبقہ اپنے سے بلند طبقے کا غلام تصور کیا جاتا تھا۔ برہمن جو سب سے اونچی ذات سمجھی جاتی تھی اس کے لئے کسی حالت میں بھی کوئی سزا نہ تھی۔ چھوت چھات کا رواج عام تھا۔ اخلاقی حالت انتہائی شرمناک تھی۔ شراب گھل مل پڑی تھی، بدمستی میں ہر گناہ ثواب بن جاتا تھا، عصمت کی کوئی قیمت نہ تھی، بڑے بڑے ذی جاہ امراء کی عورتیں جانہ عصمت اتار پھینکتی تھیں۔ اگر ایک طرف ایک عورت کئی شوہر کر سکتی تھی تو دوسری طرف شوہر کی موت کے بعد عورت کو تمام لذائذ سے محروم کر دیا جاتا تھا جسکے باعث وہ شوہر کے ساتھ جل کر مرنے (ستی ہونے) کو ترجیح دیتی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ عورتوں کو ستی ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس تاریک دور میں اگر کسی میں تلاش حق کا جذبہ پیدا بھی ہوتا تو وہ جنگلوں اور پہاڑوں پر جا کر "گیان دھیان" کے ذریعہ خدا کو تلاش کرتا تھا اور تزکیہ روح کیلئے جسم کو دردانگیز اذیتیں دیتا تھا۔

اس عالمگیر تاریکی میں اگر کسی قوم سے اصلاح کی امید کی جا سکتی تھی تو وہ بنی اسرائیل تھے لیکن ان کو غرور و گھمنڈ نے ذلیل و برباد کر دیا تھا۔ ساری خدائی میں وہ صرف اپنی قوم کو خدا کا محبوب اور راس کا کنبہ تصور کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا کی محبوبیت کے باعث ان کا کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس قوم کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ وہ پیغمبروں کے قتل سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ گو کہ ان کا مذہب الہامی تھا مگر انہوں نے مذہب کی اصل روح کی جگہ ظاہری دینداری کو رواج دے رکھا تھا۔ دولت کی طمع نے ان میں سود خوری کو جنم دیا جو شقاوت و سنگدلی کا باعث بنی۔ مذہبی اعتبار سے یہ قوم نہایت قدیم تھی مگر ذلت کی وجہ سے انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ان کا مذہبی مرکز بیت المقدس بھی ان کے ہاتھوں میں نہ تھا۔ یہ قوم دوسرے ملکوں میں دربدر پھرتی تھی اور ہر جگہ ان کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ الغرض مذہب، اخلاق و سیاست ہر اعتبار سے بنی اسرائیل ایک مسخ شدہ قوم تھی۔

جہاں حضرت ابراہیمؑ نے توحید الٰہی کی شمع روشن کی اور خدا کی بندگی کیلئے مکہ میں اللہ کا گھر بنایا وہاں کے قبائل عرب کی حالت بھی دوسری قوموں سے کچھ بہتر نہ تھی۔ گو کہ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے لیکن ماسوائے چند کے جو وحدانیت کے قائل اور معبود حقیقی کی بندگی کرنے والے تھے بقیہ تمام توحید کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مختلف قبائل کے اپنے اپنے مخصوص بت تھے اور مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا خود اللہ کے گھر میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت نصب تھے۔ ان بتوں پر انسانوں کی قربانیاں کی جاتیں تھیں اور ان کے نام پر سانڈ چھوڑے جاتے تھے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ لوگ انتہائی پست تھے۔ انتقام پسندی، سفاکی، خونریزی اور جنگجوئی فطرت میں داخل تھی۔ معمولی سی

بات پر جنگ چھڑ جاتی جو پشت در پشت جاری رہتی، شراب نوشی عام تھی، قمار بازی فخر و مباہات کا باعث تھی۔ یہودیوں کے فیض صحبت سے سود کی لعنت داخل ہو گئی تھی۔ چوری ڈکیتی بعض قبائل کا مستقل پیشہ تھا۔ بے حیائی و بے شرمی ہنر بن گئی تھی۔ شرفاء اپنی عزیز عورتوں اور شریف خواتین کے عشق و محبت کی داستانیں بھرے مجمع میں فخریہ بیان کرتے تھے۔ تعداد ازواج منکوحہ و ممنوعہ و مدخولہ کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ ترکہ میں ملنے والی امہات انکے علاوہ تھیں۔ نکاح کی بہت سی اقسام رائج تھیں مثلاً نکاح معروف، نکاح استبضاع، نکاح عشر (اسکا رواج صرف اہل ہنود میں تھا جسے "یوگ" کہتے تھے)۔ نکاح جماعت، نکاح الخذان (سورہ نساء آیت ۲۵ میں اسکی ممانعت کا حکم ہوا)، نکاح البدل، نکاح عاریت، نکاح شغار، نکاح متعہ، نکاح مقت (سورہ نساء آیت ۲۲ میں حکم ممانعت نازل ہوا) وغیرہ۔ عربوں میں زنا کوئی عیب نہ تھا۔ بعض قبائل بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے۔

اس عالمگیر ظلمت میں جب کہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، کہیں نور حق کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی، خدا کی مخلوق خدائی تعلیمات کیساتھ ساتھ انسانی و اخلاقی اقدار کو بھی بھلا چکی تھی، ہوس پرستی و خود غرضی سے نظام عالم درہم برہم ہو رہا تھا۔ ان حالات میں ایک ایسے رہبر کامل و ہادیٔ برحق کی ضرورت تھی جو بھٹکی ہوئی مخلوق کو راہ راست پر لا سکے اور ایک قوم کو نمونۂ عمل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ لہٰذا اللہ جل شانہُ نے اہل عالم کی ہدایت و تربیت کیلئے اپنے محبوب ترین بندے حضرت محمدؐ بن عبداللہ کو اسوۂ حسنہ کا نمونہ بنا کر مبعوث برسالت فرمایا اس طرح گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع اور کوئلے کی کان میں ایک ہیرے نے دنیا کو منور کر دیا۔

بعثت : چونکہ اللہ جل شانہٗ اپنے اس محبوب بندے کو منصبِ جلیلہ پر فائز کرنے والا تھا لہٰذا اس نے ابتدا ہی سے آنحضرت صلعم کو فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے آپؐ کا دامنِ اخلاق ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور رسومات جاہلیت سے محفوظ رہا۔ عقد خدیجہ کے بعد آپ کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں تھیں اور اسی کے ساتھ آپ کے قلبی و روحانی انوارِ معارفت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ لہٰذا آپؐ اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور معاشی و معاشرتی مصروفیتوں کو باحسن انجام دیتے ہوئے روحانی جذبات کی تسکین کیلئے ویران و پر سکون علاقوں میں کئی کئی روز قیام فرمایا کرتے تھے۔ قدرت الٰہی کے عجائبات کا مشاہدہ فرماتے اور ذات واجب کے ادراک، کائنات میں قدرت کے ظہور، انوار قدسیہ کی شہادت کے اشتیاق اور عالم انفس و آفاق میں غور و فکر فرماتے تھے۔

خاندان بنی ہاشم کے اس برگزیدہ نوجوان نے جبل فاران میں واقع غار حراء کو اپنی عبادت و ریاضت کیلئے منتخب فرمایا۔ یہ غار مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ اس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز تھا۔ بعثت سے سات سال اور بقول دیگر پانچ سال قبل اسی غار میں تجلیات آشکار ہونے لگیں۔ کبھی رویائے صادقہ اور کبھی الہام آپ کی رہبری کرتے۔ بقول علامہ مجد فیروز آبادی "جناب رسالتمآب صلعم ان انوار الٰہی کی ضو فشانیوں کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوتے، مگر ان تجلیات میں کوئی صورت یا اس سے کوئی آواز نہیں پیدا ہوتی تھی۔"[1]

تقریباً پانچ سال یہی کیفیت رہی۔ جب آپؐ براہ راست اکتساب علم کی صلاحیت پا چکے تو اکتالیسویں سال آپؐ کو وہ منصب جلیل حاصل ہوا جس کا اہل آپؐ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ آفتاب نبوت طلوع ہوا۔ ایک دن

[1] رحمۃ العالمین ص: ۴۹

آپؐ حسبِ معمول غار حراء میں مشغولِ عبادت تھے کہ روح الامین خدا کا پیغام لے کر نازل ہوئے اور آپؐ سے کہا: "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" ترجمہ: پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا۔ اس کے بعد آپؐ جلال الٰہی سے لبریز گھر تشریف لائے اور سارا واقعہ حضرت خدیجہؓ سے کہہ سنایا۔ وہ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عبرانی زبان کے جاننے والے اور توریت و انجیل کے ماہر تھے۔ انہوں نے واقعہ کی تفصیل جاننے کے بعد کہا کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر اُترا تھا۔[1]

آپؐ کی تاریخ بعثت کی بابت مختلف اقوال ہیں جن کے پیش نظر جناب فوق بلگرامی نے لکھا ہے کہ "بقول عموم اٹھارویں رمضان یوم دو شنبہ ۱۳ ؁ ع ف مطابق ۱۲ فروری ۶۱۰ء اور بقول مشہور و جمہور ستائیسویں رجب کو مبعوث بہ رسالت ہوئے۔"[2]

بعض سیرت نگاروں کے بیانات سے تاثر ملتا ہے کہ رسالتمآب صلعم کو بعثت کے وقت خدا کا پتہ چلا اس سے قبل وہ خدا کے وجود سے ناآشنا تھے۔ یہ رائے مسلمہ عقائد اسلام کے قطعی منافی ہے۔ نعوذباللہ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چالیس برسوں میں آپؐ کس وجود کے قائل اور کس مسلک کے مالک تھے؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انبیاء و رسل ابتداء ہی سے خدا کے وجود کو یکتا اور اس کے ابدی و ازلی ہونے کا یقین کامل رکھتے ہیں۔ جس طرح رسول کی عصمتِ ذاتی قدیم سے ہے اسی طرح اس کی معارفتِ الٰہی بھی قدیم ہے۔ کتب سیر و تواریخ میں ہمارے رسول برحق کی بابت کثیر تعداد میں ایسے واقعات مرقوم ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بیشتر عمائدین و اکابرین نے قبل از بعثت آپؐ کے محاسن

[1] سیرت ابن ہشام ص: ۲۶۲ ج: ۱، سیرت النبی ص: ۲۰۳ ج: ۱ [2] اسوۃ الرسول ص: ۱۵۳ ج: ۱

اوصاف اور مکارم اطوار کا مشاہدہ کر کے آپؐ کے نبی اللہ ہونے کی بشارت دی۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں ایسے اخبار و واقعات کے لئے علیحدہ ایک باب مخصوص کیا ہے۔

دعوتِ بنی ہاشم : بعثتِ نبوت کے بعد ابتدائی دور میں ہر خاص و عام سے رسالت کا اظہار اسلام کے لئے باعث نقصان اور بانیٔ اسلام کے لئے خطرۂ جان ہو سکتا تھا لہٰذا بعثت کے بعد تقریباً تین سال تک رسالت کو پردہ اخفا میں رکھا گیا اور اس دوران تبلیغ دین میں انتہائی رازداری سے کام لیا گیا۔ اقرار و تصدیق کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اقرب ترین افراد سے ہوا یعنی آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا، آپؐ کے ابن عم حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور آپؐ کے پروردہ حضرت زید بن الحارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور باتفاق جمہور انہی حضرات نے تبلیغ دین کی ابتداء فرمائی۔ چونکہ یگانوں پر بیگانوں سے زیادہ اعتماد ہوتا ہے لہٰذا حسبِ قاعدہ انبیائے ماسبق اللہ جل شانہٗ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز بھی اپنے حبیب کے اعزۂ خاص سے کرنے کے لئے یہ حکم صادر فرمایا۔ "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ"[1] ترجمہ: اور (اے رسول) تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذابِ خدا سے ڈراؤ۔ اسلام کے اس اولین و عظیم واقعہ کو مفسرین، محدثین و مورخین نے تفصیل و تصریح کے ساتھ تحریر کیا ہے۔[2] ہم اس واقعہ کا وہ اردو ترجمہ تحریر کر رہے ہیں جو جناب سید

[1] سورہ الشعراء آیت ۲۱۴ [2] چند مستند کتب کے نام یہ ہیں۔ تفسیر خازن، تفسیر سراج المنیر، تفسیر واحدی، تفسیر ابن مردویہ، تفسیر ابن ابی حاتم، کنز العمال، دلائل نبوۃ، حلیۃ الاولیاء، ذخیرۃ المآل، مختارۃ الضیاء مقدسی، تہذیب الآثار طبری، کتاب الاکتفا، تاریخ کامل ابن اثیر، تاریخ ابو الفداء، تاریخ روضۃ الصفا، تاریخ حبیب السیر، معارج النبوۃ، مدارج النبوۃ، ازالۃ الخفا اور تاریخ طبری وغیرہ۔

اولاد حیدر فوق بلگرامی نے تفسیر معالم التنزیل، کنز العمال اور طبری وغیرہ کی ایک جیسی عبارتوں کا کیا ہے۔

"حضرت علی مرتضیٰ سے مروی ہے کہ جب آیت و انذر عشیرتک الاقربین جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا تو آپؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یا علی مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈراؤں۔ لیکن میں نے اس میں چند لمحے توقف کیا اس وجہ سے کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ میری ہدایت سے انکار کریں گے اور میری بات نہ مانیں گے اس بناء پر میں خاموش رہا۔ تاآنکہ پھر جبرائیل نازل ہوئے اور کہنے لگے کہ خدا فرماتا ہے کہ اے محمدؐ اگر تم نے ایسا نہیں کیا جیسا ہم نے تم کو حکم دیا ہے تو تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب کیا جاوے گا۔ پس تم اے علی بقدر ایک صاع (پونے تین سیر پختہ) طعام (روٹیاں) تیار کرو۔ ایک بکری کا گوشت پکالو اور ایک کاسہ شیر مہیا کرلو، اور تمام بنی عبدالمطلب کو ضیافت میں بلاؤ تاکہ میں اسی مجلس ضیافت میں ان سے کلام کروں اور جو کچھ ان کے متعلق حکم ہوا ہے اس کو جالاؤں اور ان تک پہنچا دوں۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلعم کے حکم کے مطابق سب سامان مہیا کر دیا اور تمام بنی عبدالمطلب کو بلا لایا۔ وہ شمار میں کم و بیش چالیس آدمی تھے اور ان میں آنحضرتؐ کے چچا ابو طالب، حمزہ، عباس، ابولہب سب ہی موجود تھے۔ جب یہ سب لوگ جمع ہو گئے تو آنحضرتؐ نے کھانا کھلانے کے لئے حکم دیا جو ان لوگوں کے لئے تیار ہوا تھا۔ میں جب ان کھانوں کو حضرت کے سامنے لایا تو آپؐ نے ایک پارچہ گوشت اٹھایا اور اپنے دندان مبارک سے کاٹ کر طشت میں رکھ

دیا اور حاضرین سے کہا بسم اللہ آپ لوگ تناول فرمائیں۔ پس تمام لوگوں نے کھایا اور سیر ہو گئے اور کھانا ویسے ہی کا ویسا پڑا رہا۔ اس میں ان کے ہاتھوں کے نشان تک نہیں معلوم ہوتے تھے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ کھانا جو سب نے مل کر کھایا تھا مقدار میں اتنا کم تھا کہ اکیلا آدمی اسے کھا جاتا اس کے بعد آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ انہیں سیراب کرو میں نے انہیں دہی دودھ کا شربت پلایا اور وہ سب کے سب سیراب ہو گئے اور قسم خدا کی وہ ایک آدمی کے پینے کی مقدار تھا اسکے بعد رسول اللہ صلعم نے کلام کرنے کا قصد کیا اس اثناء میں ابولہب نے اٹھ کر آپؐ کا قطع کلام کیا اور قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے صاحب نے تم پر جادو کیا۔ یہ سننا تھا کہ تمام قوم کے لوگ متفرق ہو گئے۔ دوسرے دن پھر آپؐ نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ یا علی اس شخص نے میرے کلام پر سبقت کی اور قبل اسکے کہ میں کچھ کہوں قوم کے لوگ منتشر ہو کر چلے گئے۔ پھر آج تم ویسا ہی کھانا تیار کرو اور پھر سب لوگوں کو بلاؤ پس میں نے آنحضرتؐ کے مطابق آج بھی ویسے ہی سامان کئے جو کل کئے تھے اور پھر ان لوگوں کو جا کر بلا لایا جب میں کھانا لیکر آنحضرتؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے پھر وہی عمل کیا جو کل کیا تھا۔ پس تمام لوگوں نے وہ کھانا کھایا اور سیر ہو گئے اور شربت پیا اور سیراب ہو گئے۔ کھانے سے فراغت ہو چکی تو آنحضرتؐ نے ارشاد کیا کہ اے اولاد عبدالمطلب خدا کی قسم میں جوانان عرب میں کسی شخص کو ایسا نہیں جانتا جو میری طرح تمہارے لئے دین و دنیا کی خبر لایا ہو۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس کی طرف بلاؤں پس تم لوگوں میں سے اس امر خاص میں میری وزارت کون شخص کرتا ہے؟ حضرت علی علیہ السلام کا بیان ہے کہ میں اس

مجمع میں کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گو میں ان لوگوں میں سب سے کم سن ہوں گو میری آنکھیں پر آشوب ہیں۔ گو میرا پیٹ بڑا ہے۔ میری ساق پاتلی ہیں لیکن بایں ہمہ اس امر میں آپؐ کا وزیر بننے کو مستعد ہوں۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ لوگو دیکھو تم لوگوں میں یہ میرا بھائی ہے یہ میرا وصی ہے اور یہ میرا خلیفہ ہے اس کی باتوں کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ یہ سن کر تمام لوگ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابطالب علیہ السلام کو مخاطب کر کے بطور تمسخر کہنے لگے آج سے تم اپنے بیٹے علی کے مطیع و منقاد بنائے گئے"

(کنز العمال ص: ۳۹۷ ج: ۶، حوالہ اسوۃ الرسول ص: ۱۹۸ ج: ۲، تاریخ طبری ص ۹۶ ج ۱)

اعلانیہ تبلیغ : اس کے بعد جب آفتاب رسالت کی شعاؤں سے تاریکی چھٹنے لگی اور طلوع سحر نمودار ہونے لگی تو پروردگار عالم کا حکم نازل ہوا۔ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ"[۱] یعنی جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے واشگاف کہدو اور مشرکین سے قطعاً نہ ڈرو۔ لہذا حکم خداوندی کے مطابق آنحضرتؐ نے کوہ صفا یا بقول دیگر کوہ ابو قبیس پر چڑھ کر پکارا۔ "یامعاشر القریش" اے قریش کے لوگوں یا بقول مولانا مودودی صاحب "آپ نے صدا بلند کی یاصباحاہ (ہائے صبح کی آفت) عرب میں یہ صدا وہ لگاتا ہے جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلہ پر حملہ کرنے کیلئے آتا دیکھ لیتا ہے۔"[۲] بہر حال آپ کی آواز مکہ کے گرد پہاڑوں سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتی ہوئی صدائے بازگشت بن کر آبادی کے ہر گھر میں سنی گئی۔ قریش مکہ اس آواز پر جوق در جوق پہاڑ کے دامن میں جمع ہونے لگے جب

۱۔ سورۂ حجر آیت ۹۴، ۲۔ تفسیر القرآن ص: ۵۲۱ ج: ۶

سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا" اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا" ہاں! کیونکہ تم کو ہمیشہ سچ بولتے دیکھا ہے" تب آپ نے فرمایا" میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا" یہ سن کر سب لوگ سخت برہم ہوئے اور چلے گئے۔

مذکورہ بالا ہر دو احکامات خداوندی اور ان کے نتیجہ میں ہونے والے واقعات کو اسطرح خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ ان کے زمانے کا تعین اور درمیانی مدت کا پتہ لگانا دشوار ہو گیا۔ جبکہ بعض مورخین و مترجمین نے ان واقعات میں قطع و برید کر کے انہیں مہمل و مبہم بنا دیا۔ جبکہ بعض مورخین نے پہلے حکم کو بعد میں اور دوسرے حکم کو پہلے تحریر کیا اور بعض نے پہلے حکم کے ضمن میں دوسرے حکم کے تحت ہونے والے واقعہ کو بیان کر کے پہلے واقعہ کی اہمیت کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ درآنحالیکہ دونوں احکامات بالکل واضح ہیں۔ اور قرینہ بھی یہی بتاتا ہے کہ بعثت کے بعد اللہ جل شانہٗ نے اپنے پیغمبرؐ کو خفیہ تبلیغ کیلئے سب سے پہلے آپؐ کے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت حق پیش کرنے کا حکم دیا اور بعد میں قریش مکہ یعنی عام لوگوں میں اعلانیہ تبلیغ کا حکم نازل فرمایا جسکے ساتھ ہی خفیہ تبلیغ کا تین سالہ دور ختم ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا حکم خفیہ تبلیغ کے ابتدائی دور میں جبکہ دوسرا حکم خفیہ تبلیغ کے اختتام پر نازل ہوا اور مورخین کے متفقہ فیصلے کے مطابق خفیہ تبلیغ تین سال تک جاری رہی۔

تبلیغ دین و مخالفت مشرکین : مذکورہ بالا واقعات کے بعد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلانیہ طور پر اللہ وحدہٗ لاشریک کی اطاعت کا حکم اور شرک و بت پرستی کی مذمت فرماتے تھے۔ جس کے باعث لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ آنحضرتؐ کی تبلیغ اور

اسلام کی مقبولیت کو دیکھ کر مشرکین مکہ مخالفت پر آمادہ ہوئے اور انتقامی کاروائیاں شروع کر دیں۔ جس مسلمان پر ان کا قابو چلتا اسے بے دریغ زدوکوب کرتے تھے۔ جیسے جیسے اللہ کا دین پھیلتا گیا ویسے ویسے مشرکین کی دشمنی بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ غریب و نادار مسلمانوں پر مکہ کی زمین تنگ کر دی گئی۔ حالات سے مجبور چند ستم رسیدہ مسلمان آنحضرتؐ کی اجازت سے رجب ۵ھ نبوی میں حبشہ ہجرت کر گئے۔ ان کی تعداد سترہ تھی جن میں بارہ مرد اور پانچ عورتیں شامل تھیں۔ مشرکین کو جب ان کی روانگی کا پتہ چلا تو ان کی تلاش میں ساحل سمندر تک آدمی دوڑائے مگر یہ مسلمان کشتیوں میں سوار ہو کر نکل چکے تھے۔ اس ناکامی سے مشرکین کا غیظ و غضب بھڑک اٹھا انہوں نے مکہ میں موجود مسلمانوں پر اتنے شدید و بے رحمانہ مظالم ڈھائے کہ ان میں سے چند مسلمان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان مظلومین میں حضرت عمارؓ کے والد یاسرؓ اور والدہ سمیہؓ کے نام سر فہرست ہیں۔ دیگر مظلومین میں حضرت جناب بن الارت تمیمی، حضرت بلالؓ حبشی، حضرت صہیبؓ رومی، حضرت فہیرہؓ (ان کا نام افلح تھا اور یہ صفوان بن امیہ کے غلام تھے)، ان کے علاوہ مظلوم خواتین میں لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، اور ام عبیسؓ قابل ذکر ہیں۔

مورخین نے دشمنان اسلام کی ظالمانہ کاروائیوں پر اجمالاً و تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ ابن سعد نے اللہ کے رسولؐ اور اصحابؓ رسولؐ کو اذیتیں پہنچانے والے مشرکین کے درج ذیل نام تحریر کئے ہیں :۔

۱۔ ابو جہل بن ہشام ۲۔ ابو لہب بن عبد المطلب ۳۔ اسود بن عبد یغوث ۴۔ حارث بن قیس ۵۔ ولید بن مغیرہ ۶۔ امیہ بن خلف ۷۔ ابی بن خلف ۸۔ ابو قیس بن فاکیہ بن مغیرہ ۹۔ عاص بن وائل ۱۰۔ نضر بن حارث ۱۱۔ منبہ بن حجاج ۱۲۔ زہیر بن ابی امیہؓ ۱۳۔ سائب

بن صیفی بن عائذ ۱۴۔ اسود بن عبدالاسد ۱۵۔ عاص بن سعید بن عاص ۱۶۔ عاص بن ہاشم ۱۷۔ عتبہ بن ابی معیط ۱۸۔ ابن الاصدی ہذلی ۱۹۔ حکم بن ابی العاص ۲۰۔ عدی بن حمرا۔ ~ آگے چل کر ابن سعد نے لکھا ہے کہ عتبہ وشیبہ فرزندان ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب بھی اہل عداوت تھے۔ سوائے ابوسفیان اور حکم کے ان میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لایا۔

علامہ شبلی نعمانی نے بھی انہی ناموں کو نقل کیا ہے۔ ~ اور قریش مکہ کی مخالفت کے اسباب بیان کرتے ہوئے بدترین دشمنان اسلام و پیغمبر اسلام صلعم کے یہ نام تحریر کیے ہیں۔ ابوسفیان' ولید' ابوجہل' ابولہب' عتبہ' عاص بن وائل اور ان کے زیرِ اثر مشرکین میں اسود بن مطلب' اسود بن یغوث' نضر' امیہ' عتبہ تھے۔ ~

ہم نے مختلف کتبِ تواریخ و شجرہ جات کی مدد سے مشرکین مکہ کی درج ذیل فہرست مرتب کی ہے اور انکے نام معہ سلسلہ نسب لکھے ہیں تاکہ عام قاری بآسانی سمجھ سکے کہ کون کس قبیلے سے تھا اور انکا باہمی تعلق کیا تھا۔

۱۔ ابوجہل بن ہشام بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم (بنی مخزوم) رئیس الاشرار۔ یہ ملعون بدر میں مارا گیا۔

۲۔ عاص ----------"---------- (بنی مخزوم) یہ بھی بدر میں جہنم رسید ہوا۔

۳۔ ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم (بنی مخزوم) مشرکین کا سرغنہ۔ سورہ مدثر آیت ۱۱ تا ۲۵ اسی سے متعلق ہیں

۴۔ عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم (بنی مخزوم) دشمن اسلام۔

۵۔ سائب بن صیفی بن عائذ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم (بنی مخزوم) دشمن اسلام۔

۶۔ نوفل بن عبداللہ -----"----- (بنی مخزوم) یہ جنگ خندق میں واصل جہنم ہوا۔

۷۔ زہیر بن ابی امیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم (بنی مخزوم) مقاطعہ کے خلاف تحریک کا شریک۔

~ طبقات ابن سعد ص: ۹۹-۲۹۸ ج: ۱ ~ سیرۃ النبی ص: ۲۵۶ ج: ۱ ~ سیرۃ النبی ص: ۲۱۴ ج: ۱

۸۔ ابو قیس بن فاکہ (یہ ہندہ بنت عتبہ کا ابوسفیان سے پہلے شوہر تھا) بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم (بنی مخزوم) دشمن اسلام۔

۹۔ اسود بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم (بنی مخزوم) بدر میں حضرت حمزہؓ نے واصل جہنم کیا۔

۱۰۔ ابوسفیان بن حرب بن امیہ (بنی امیہ) بدر کے سوا تمام لڑائیاں اسی نے برپا کیں۔

۱۱۔ حنظلہ بن ابوسفیان بن حرب بن امیہ (بنی امیہ) بدر میں جہنم رسید ہوا۔

۱۲۔ ابوالبختری بن ابوسفیان بن حرب بن امیہ (بنی امیہ) بدر میں جہنم رسید ہوا۔

۱۳۔ حکم بن عاص بن امیہ (بنی امیہ) فتح مکہ کے بعد اسلام لایا۔

۱۴۔ عاص بن سعید بن عاص بن امیہ (بنی امیہ) بدر میں حضرت علیؑ نے واصل جہنم کیا۔

۱۵۔ عتبہ بن ابی معیط بن عمرو بن امیہ (بنی امیہ) اسیر بدر۔ کافر مرا۔ آنحضرتؐ کے گلے میں پھندا اسی نے ڈالا تھا۔

۱۶۔ عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس (بنی عبد شمس) بدر میں حضرت حمزہؓ نے واصل جہنم کیا۔

۱۷۔ شیبہ بن ربیعہ بن عبد شمس (بنی عبد شمس) بدر میں حضرت علیؑ نے واصل جہنم کیا۔

۱۸۔ عبداللہ بن ربیعہ بن عبد شمس (بنی عبد شمس) اسیر بدر۔ قتل کر دیا گیا۔

۱۹۔ ولید بن عتبہ ربیعہ بن عبد شمس (بنی عبد شمس) بدر میں حضرت علیؑ نے فی النار کیا۔

۲۰۔ ابولہب بن عبدالمطلب بن ہاشم (بنی ہاشم) بدر کے چند روز بعد حالتِ کفر فوت ہوا۔

۲۱۔ نضر بن حارث بن علقمہ بن کلدہ بن عبد مناف بن عبدالدار (بنی عبدالدار) بدر میں قید ہوا قتل کر دیا گیا۔

۲۲۔ حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف (بنی نوفل) بدر میں جہنم رسید ہوا۔

۲۳۔ طعیمہ بن عدی بن نوفل بن عبد مناف (بنی نوفل) بدر میں حضرت حمزہؓ نے واصل جہنم کیا۔

۲۴۔ حارث بن قیس بن عدی بن سعد بن سہم (ابن غیطلہ) (بنی سہم) بدترین دشمن رسول۔

۲۵۔ عاص بن وائل بن ہاشم بن سعید بن سہم (بنی سہم) کافر مرا۔ آنحضرتؐ کو ابتر کہنے والا۔

۲۶۔ منبہ بن حجاج بن عامر بن حذیفہ بن سعد بن سہم (بنی سہم) بدر میں قتل ہوا۔

۲۷۔ امیہ بن خلف بن وہب بن حذافہ بن جمح (بنی جمح) بدر میں واصل جہنم ہوا۔

۲۸۔ ابی بن خلف بن وہب بن حذافہ بن جمح (بنی جمح) بدر میں حضرت بلالؓ نے واصل جہنم کیا۔

۲۹۔ اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ (بنی زہرہ) دشمن اسلام

۳۰۔ عقیل بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ (بنی اسد) بدر میں جہنم رسید ہوا۔

۳۱۔ زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ (بنی اسد) بدر میں قتل ہوا۔ مقاطعہ کے خلاف تحریک کا شریک۔

۳۲۔ حارث بن زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ (بنی اسد) دشمن اسلام۔

۳۳۔ قریب بن زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ (بنی اسد) دشمن اسلام۔

۳۴۔ اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ (بنی اسد) حالتِ کفر مرا۔ آنحضرتؐ نے اس کے لئے بددعا فرمائی۔

۳۵۔ عاص بن ہاشم بن حارث بن اسد بن عبدالعزیٰ (بنی اسد) بدر میں مارا گیا۔ مقاطعہ کے خلاف تحریک میں شریک۔

ان کے علاوہ بھی اور ہیں جیسے کہ ابن الاصداہذلی وغیرہ

ابنِ سعد نے ایک روایت بیان کی ہے کہ

" عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبلہ رو ہو کر قریش کے سات افراد کے لئے بددعا فرمائی جن میں (۱) ابوجہل (۲) امیہ بن خلف (۳) عتبہ بن ربیعہ (۴) شیبہ بن ربیعہ (۵) عتبہ بن ابی معیط بھی تھے۔" (طبقات ابن سعد ص: ۳۶۴ ج: ۱)

گوکہ اس روایت میں سات افراد کیلئے بددعا کی بابت بیان کیا ہے لیکن صرف پانچ مشرکین کے نام تحریر کئے بقیہ دو ناموں کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں مورخ یا مترجم نے ان دو دشمنان رسولؐ کے نام اس لئے تحریر نہیں کئے کہ وہ فتح مکہ کے موقعہ پر چار و ناچار مسلمان ہو گئے تھے۔

دشمنانِ رسولؐ کی مذکورہ فہرست میں رسول اللہ کے چچا عبدالعزیٰ کو حیثیت ابولہب شامل کیا گیا ہے حالانکہ عربوں کے عصبیت سے بھرپور معاشرے میں جہاں صلح رحمی (رشتہ داروں سے حسن سلوک) طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہو وہاں ایک چچا اپنے بھتیجے پر اعلانیہ مظالم ڈھائے کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ خصوصاً خاندان بنی ہاشم کے افراد کا جنہیں دیگر قبائل قریش دشمن کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ پروفیسر ذہنی جارچوی نے اپنی کتاب "ابولہب" میں عبدالعزیٰ سے متعلق تمام الزامات کو جمع کر کے مدلل و مفصل بحث کی ہے اور سورۂ "اللھب" کی ایک ایک آیت کا جائزہ لیکر یہ ثابت کیا ہے کہ ان آیات میں بیان کردہ نشانیاں کسی طرح بھی عبدالعزیٰ پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بہر حال ان تمام واقعات کا احاطہ کرنے کی ہمارے پاس گنجائش نہیں ہے۔ ہم صرف اسی ایک سوال پر کہ " کیا واقعی عبدالعزیٰ کا نام' لقب یا کنیت ابولہب تھی ؟"۔ پر اکتفا کر رہے ہیں۔

عبدالعزیٰ کا نام : یہ ایک اہم اور بنیادی سوال ہے کہ کیا واقعی عبدالعزیٰ کا نام، لقب یا کنیت ابولہب تھی۔ کتب سیرۃ و تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پیدائش کے وقت جناب عبدالمطلب نے اپنے اس بیٹے کا نام عبدالعزیٰ رکھا۔ مادری نسبت سے اس کی کنیت ابن لبنیٰ ہوئی۔ شادی کے بعد جب اسکے پہلا لڑکا عتبہ پیدا ہوا تو اس کی کنیت ابو عتبہ مشہور ہوئی۔ مشہور و مستند روایات میں یہی کنیت استعمال کی گئی ہے۔ شعراء نے بھی اسے ابو عتبہ اور ابن لبنیٰ ہی کہا ہے البتہ ابو طالب نے اپنے اشعار میں اسکے دوسرے بیٹے عتیبہ اور تیسرے بیٹے معتب کی مناسبت سے ابو عتیبہ اور ابو معتب بھی کہا ہے۔ لیکن غائبانہ اور مخاطبانہ کلام میں اسے ابو عتبہ ہی کہا جاتا تھا۔ اس ضمن میں چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ جناب عبدالمطلب کی وفات پر حزیفہ بن غانم نے ایک طویل مرثیہ

کہا جسکے چند اشعار جو زیرِ نظر عنوان سے متعلق ہیں تحریر کرتے ہیں۔

ابو عتبة المُلقی الیّ حِبَاءَهُ   اَغرُّ هجانُ اللّونِ من نفرٍ غُرّ

ابو عتبہ، جس سے مجھے فیض پہنچا ہے۔ نورانی پیشانی والا سرخ و سفید رنگ والا نیک لوگوں میں سے ہے۔

آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ۔

ولا تنسَ ما اسدی ابنُ لُبنی فانّه   قد اسدی یدًا محقوقةً منك بالشکرِ

ابن لبنی نے جو احسان کیا ہے اسے بھول نہ جانا کیونکہ یہ ایسا احسان ہے جو تیری شکر گزاری کا طالب ہے یعنی تجھ پر اس کی شکر گزاری لازم ہے۔

وانت ابن لُبنی من قُصیٍّ اذا انتمَوا   بحیثُ انتهی قصدُ الفؤادِ من الصّدرِ

اے ابن لبنی جب لوگ اپنے بزرگوں کی جانب منسوب ہوں تو تو بنی قصی میں شمار ہوگا جہاں سینوں میں رہنے والے دلوں کے مقاصد ختم ہوتے ہیں۔

(سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۰۱ ج: ۱)

۲۔ جب ابو سلمہ بن عبد الاسد کو جناب ابو طالب نے اپنی پناہ میں لیا تو بنی مخزوم کے لوگ انکے پاس آئے اور شکایت کی کہ اے ابو طالب اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تو تم نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا یہاں تک تو خیر تھی لیکن اب تم ہمارے آدمی کی حفاظت ہمارے مقابلے میں کرتے ہو۔ ابو طالب نے جواب دیا کہ "اس نے مجھ سے پناہ طلب کی اور وہ میرا بھانجا بھی ہے اگر میں اپنے بھانجے کی حفاظت نہ کروں گا تو اپنے بھتیجے کی بھی حفاظت نہ کروں گا" عبد العزیٰ جو اس وقت وہاں موجود تھا برہم ہو گیا اور بنی مخزوم کو مخاطب کر کے کہنے لگا "اے گروہ قریش! واللہ! تم نے اس بڑے بوڑھے آدمی کی بہت مخالفت کی۔ اس کی قوم میں سے اسکی پناہ میں آئے ہوئے افراد پر ہمیشہ تم لوگ چھاپے مارتے رہے ہو۔ واللہ! تمہیں اس طرح کے سلوک سے باز آنا ہوگا ورنہ اس مہم میں جس میں وہ مستعد ہو کر کھڑا

ہو جائے، ہم بھی اسکے ساتھ صف بستہ ہو جائیں گے کہ وہ اپنے ارادے پورے کر سکے" راوی کہتا ہے کہ پھر تو سب کہنے لگے اے ابو عتبہ! (اس قدر برہمی کی ضرورت نہیں) بلکہ ہم خود ان باتوں سے باز آجائیں گے جنہیں تم ناپسند کرتے ہو"۔[1]

۳۔ اس واقعہ کے بعد جناب ابو طالب نے عبد العزیٰ کو اپنی اور رسول خداؐ کی مدد پر راغب کرنے کے لئے جو اشعار کہے ان میں سے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

انّ امرأً ابو عُتیبةَ عمُّهُ   لفی روضةٍ ما ان یُسامُ المظالما

جس شخص کا چچا ابو عتبہ ہے بے شک وہ شخص ایسی روش پر ہے جسکے ساتھ ظلم کا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا۔

اقول لهُ واینَ منهُ نصیحتی   ابا مُعتبٍ ثبّت سوادَك قائما

میں اس سے کہتا ہوں کہ اے ابو معتب! اپنی قوم کا جتھا مستعدی سے مستحکم بنا لیکن میری نصیحت کہاں اور وہ کہاں۔ (سیرت ابن ہشام ص ۳۰۶ ج: ۱)

۴۔ اب وہ گفتگو ملاحظہ کیجئے جو ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ اور عبد العزیٰ کے درمیان اس وقت ہوئی جب جناب ابو طالب خاندان بنی ہاشم کو لے کر شعب ابی طالب میں چلے گئے تھے مگر عبد العزیٰ ان کے ہمراہ نہیں گیا۔ اس کے بعد جب پہلی بار اس کا سامنا اپنے سالے کی بیوی یعنی ہندہ زوجہ ابو سفیان سے ہوا تو اس نے کہا "اے عتبہ کی بیٹی! کیا میں نے لات و عزیٰ کی مدد کی؟ کیا میں نے ان لوگوں کو نہیں چھوڑ دیا جنھوں نے لات و عزیٰ کو چھوڑ دیا اور ان کے خلاف دوسروں کی مدد کی؟" ہندہ نے کہا "ہاں، اے ابو عتبہ! اللہ تجھے جزائے خیر دے"[2] یہاں "اللہ تجھے جزائے خیر دے" میں لفظ اللہ کا استعمال بے محل ہے کیوں کہ سلسلہ کلام میں ابو عتبہ

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۰۵ ج: [2] ایضاً سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۸۴ ج: ۱

نے لات و عزیٰ کی مدد کا ذکر کیا ہے نیز اس وقت ہندہ زوجہ ابو سفیان اسلام نہیں لائی تھی۔ لہٰذا اللہ سے جزائے خیر طلب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو کتابت کے وقت غلطی ہوئی یا پھر مترجم نے قلبی لگاؤ کے باعث لات و عزیٰ کے بجائے اللہ تحریر کیا۔

۵۔ ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمایئے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ابو طالب کی وفات کے بعد عبد العزیٰ نے جناب رسالتمآبؐ کو اپنی امان میں لے لیا تھا۔ اسی دوران ابن الغیطلہ نے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی کی جب عبد العزیٰ کو اس کی خبر ہوئی وہ ابن الغیطلہ کے پاس پہنچا اور اس سے بہت بری طرح پیش آیا۔ اس پر ابن الغیطلہ قریش سے مخاطب ہو کر چلایا۔

"اے گروہ قریش! ابو عتبہ بے دین ہو گیا ہے۔"[1]

مذکورہ بالا مستند اقتباسات میں سے کسی ایک میں بھی عبد العزیٰ کو ابو لہب کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا ہے گو کہ پہلا واقعہ جناب عبد المطلب کی وفات (۵۷۹ء یا ۸ ع ف) کا ہے اس وقت عبد العزیٰ کی عمر تقریباً اڑتیس ۳۸ سال تھی۔ دوسرا اور تیسرا واقعہ ۵ء نبوی کا ہے اس وقت اس کی عمر تقریباً ۷۵ سال تھی چوتھا واقعہ ۷ء نبوی کا اور پانچواں واقعہ ۱۰ء نبوی کا ہے اس وقت عبد العزیٰ کی عمر تقریباً ستتر ۷۷ اور اسی ۸۰ سال بالترتیب تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جوانی سے لیکر بڑھاپے تک عبد العزیٰ کو اس کی کنیت خاص ابو عتبہ اور ابن لبنیٰ ہی سے مخاطب کیا جاتا رہا۔ خاندان کے کسی فرد نے کبھی بھی اسے ابو لہب نہیں کہا۔ گو کہ ایک مقام پر ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ "عبد المطلب خود اسے ابو لہب کہا کرتے تھے"[2]۔ لیکن اس بیان کی تصدیق کسی روایت یا واقعہ سے نہیں ہوئی۔

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۱۰ ج: ۱ [2] طبقات ابن سعد ص: ۱۲۶ ج: ۱

عربوں میں نام کے علاوہ کنیت کا رواج عام تھا۔ بعض کی کنیت تو اتنی مشہور ہوئی کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے مثلاً ابو طالب، ابو بکر، ابو جہل وغیرہ۔ عربی معاشرے میں کنیت ایسا نام ہوتا ہے جو باپ، ماں، بیٹا یا بیٹی کی مناسبت سے شہرت پاتا ہے۔ اس کی بنت ترکیبی بہت آسان ہے یعنی کسی نام سے پہلے ابو، ام، ابن یا بنت کا اضافہ کر دیا جائے تو کنیت بن جاتی ہے۔ (جیسے ابو طالب، ابن لبنیٰ، ام ہانی، بنت فاطمہ، وغیرہ) چونکہ کنیت نام کی جگہ استعمال ہوتی ہے اس لئے گرامر کے اعتبار سے ہم اسے بھی اسم کی طرح کنیت خاص اور کنیت عام دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کنیت خاص کی مثال یہ ہے کہ ابو طالب یعنی طالب کا باپ مراد کہ عمران یا عبد مناف بن عبد المطلب۔ یہ امر مصدقہ ہے کہ جناب عمران یا عبد مناف کے بڑے بیٹے کا نام طالب تھا اور اسی کی مناسبت سے آپ کی کنیت ابو طالب مشہور ہوئی۔ اسی طرح ابن لبنیٰ یعنی لبنیٰ کا بیٹا مراد عبد العزیٰ بن عبد المطلب، ام ہانی یعنی ہانی کی ماں مراد فاختہ بنت عبد المطلب، بنت فاطمہ یعنی فاطمہ کی بیٹی مراد حضرت زینبؑ ہیں۔ کنیت خاص میں جس کنیت سے جو آدمی مراد ہے وہی لیا جاتا ہے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جب کہ کنیت عام میں ہر وہ شخص مراد لیا جا سکتا ہے جس میں وہ صفات موجود ہوں جن سے وہ کنیت بنائی گئی ہے۔ مثلاً ابو لہب یعنی شعلہ کا باپ جس سے مراد عبد العزیٰ لیا گیا ہے۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ عبد العزیٰ کے لہب نام کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ یہ کنیت ایک صفت شعلہ رخی کے باعث بنائی گئی۔ حالانکہ اس سے کوئی بھی ایسا شخص مراد لیا جا سکتا ہے جو شعلہ مزاج یا شعلہ چشم ہو نیز ابو لہب سے آتش پرست بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور ابو لہب کہہ کر کسی دوزخی کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ عبدالعزیٰ کا نام اور ایک سے زائد کنیت ہونے کے باوجود تاریخ میں اسے ابو لہب کا نام دے کر اس کثرت سے کیوں استعمال کیا گیا؟ آخر اس نئے نام کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس نئے نام ابولہب کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ عبدالعزیٰ بڑا خوبصورت، صحتمند، سرخ و سفید یعنی شعلہ رو یا شعلہ رُخ تھا اور عربی میں شعلہ کو لہب کہتے ہیں لہٰذا لوگ اسے ابو لہب یعنی شعلہ کا باپ کہنے لگے۔ اس بیان کردہ وجہ تسمیہ میں کچھ وزن نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو جہاں تک خوبصورتی و شعلہ رُئی کا تعلق ہے تو خاندان بنی ہاشم میں سب ہی شعلہ رُخ پیدا ہوئے۔ ہاشم ہوں یا عبدالمطلب، حمزہ ہوں یا عباس، ابو طالب ہوں یا عبداللہ سب ہی خوبصورتی و شعلہ رُخی میں بے مثال تھے پھر یہ نوازش عبدالعزیٰ ہی پر کیوں؟ دوئم یہ کہ لفظ لہب کے لغوی معنی سے اس کی صفت کے مطابق نام تجویز کیا گیا مگر یہ ضروری تو نہیں کہ یہی حقیقت ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ آنحضرتؐ کو اذیت پہنچانے والوں نے اپنی بدبختی و روسیائی کی سیاہی کو کم کرنے کی غرض سے سورہ لہب کے نزول کے بعد لفظ "ابی لھب" کو پیش نظر رکھتے ہوئے عبدالعزیٰ کو ابو لہب کا نام دیا ہو اور اسے لفظ لہب کے مطابق شعلہ رو یا شعلہ رُخ بنا کر پیش کیا ہو تاکہ وہ لوگ اپنی بدبختی کو چھپانے یا کم کرنے کے لئے یہ جواز پیش کر سکیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچانے میں وہی لوگ پیش پیش نہ تھے بلکہ آنحضرتؐ کے اپنے چچا بھی برابر کے شریک تھے۔ بعد والوں نے اسی مقصد کے حصول کی خاطر سورہ لہب کو عبدالعزیٰ عم رسول خدا سے منسوب کر دیا نیز عبدالعزیٰ یا ابو عتبہ کے بجائے ابو لہب کو اس کثرت و تواتر سے استعمال کیا کہ لوگ اصل نام و کنیت تو کیا اصل حقیقت کو بھی بھول گئے۔

بہر حال مذکورہ بالا اشعار، اقتباسات اور دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے چچا عبدالعزیٰ کی کنیت ابو عتبہ اور ابن لہب تھی ابو لہب ہرگز نہ تھی۔ یہ بات یقینی ہے کہ دشمنانِ خاندانِ رسولؐ نے بہت بعد میں جب اموی حکمرانوں کے دور میں مسلمانوں کی تاریخ مرتب ہونا شروع ہوئی تو عبدالعزیٰ کو ابولہب کا نام دیکر شہرت دی تاکہ اسے سورۃ لہب میں مذکورہ ابی لہب کا مصداق قرار دیکر اصل مصداق سے لوگوں کی توجہ ہٹائی جا سکے۔ پھر اسکے متعلق موضوعہ روایات کا سہارا لیکر عامۃ المسلمین کو یہ باور کرا دیا گیا کہ یہی ہے وہ ابو لہب جو رسول کا بدترین دشمن تھا۔

وفودِ قریش: جب قریش مکہ نے دیکھا کہ ایک طرف تو محمدؐ ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے باز نہیں آرہے ہیں اور دوسری طرف ابو طالب انکی حفاظت و حمایت سے دست کش نہیں ہو رہے ہیں۔ تب انہوں نے ایک وفد ابو طالب سے گفت و شنید کیلئے بھیجا۔ ابن ہشام کے مطابق اس وفد کے شرکاء کے نام یہ تھے عتبہ، شیبہ، پسران ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف، ابو سفیان (صخر) بن حرب بن امیہ بن عبد مناف، ابو البختری (العاص) بن ہشام بن الحارث بن اسد، الاسود بن المطلب بن اسد، ابو جہل (عمرو) بن ہشام بن المغیرہ، الولید بن مغیرہ، العاص بن وائل، نبیہ، اور منبہ پسران الحجاج بن حذیفہ۔[۱] اس وفد نے جناب ابو طالب سے شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے دین میں عیب لگاتا ہے، ہم میں سے عقلمندوں کو بے وقوف بتاتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ بتاتا ہے لہٰذا یا تو آپ اسے ان باتوں سے روکیں یا پھر ہمارے اور اس کے درمیان دخل نہ دیں کیونکہ آپ بھی اسی دین پر ہیں جس پر ہم ہیں۔ جناب ابو طالب نے حسنِ تدبر سے قریش سمجھا بجھا کر کو واپس کر دیا۔

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۷۹ ج: ۱، تاریخ طبری ص: ۹۱ ج: ۱

یہاں قریش کا جملہ "آپ بھی اسی دین پر ہیں جس پر ہم ہیں" غور طلب ہے۔ اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابو طالب نے تقیہ کیوں کیا تھا یعنی اپنے دینی عقائد کو کیوں پوشیدہ رکھا تھا۔ واضح ہوتا ہے کہ اگر ابو طالب کا ایمان ظاہر ہو گیا ہوتا تو قریش شکایت لے کر نہ آتے بلکہ جنگ کرنے آتے اور اس طرح تبلیغ اسلام کا وہ انجام ہوتا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال آنحضرتؐ نے اپنی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہی اعلان توحید اور وہی مذمت اصنام۔ آپؐ کے اس عمل سے کفارانِ قریش مکہ کے دلوں میں انتقام کی آگ تیز ہو گئی اور وہ ایک بار پھر جناب ابو طالب کے پاس آئے کہا کہ اے ابو طالب! آپ بزرگ ہیں، باشرف اور محسن آدمی ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ اپنے بھتیجے کو روک دیں مگر آپ نے کچھ نہیں کیا۔ اب ہم صبر نہیں کر سکتے۔ یا تو ہم اسے اپنے متعلق ایسی باتیں کرنے سے روک دیں گے یا اس سے مقابلے کی ٹھرائیں گے۔ پھر آپ دخل نہیں دینا یہاں تک کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک برباد ہو جائے۔[۱] جناب ابو طالب نے کہا تمہارے منہ میں خاک ہو خدا کی قسم میں اسے کبھی بھی تمہارے سپرد نہیں کروں گا۔[۲]

قریش کے چلے جانے کے بعد جناب ابو طالب نے رسالتمآب کو بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا اور قریش کے مطالبہ کی بات بتایا جس کے جواب میں ختمی مرتبتؐ نے وہ تاریخی کلمات ادا فرمائے جو جملہ کتب و تواریخ میں مرقوم ہیں یعنی آپؐ نے فرمایا کہ "چچا جان! واللہ! اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور شرط یہ ہو کہ میں اس معاملے کو چھوڑ دوں تو بھی میں اسے نہ چھوڑوں گا۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ خود اسے

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۸۰ ج: ۱ [۲] تذکرۃ الخواص ص: ۳۰

غلبہ عطا کرے یا میں مر جاؤں"۔ بھتیجے کے یہ کلمات سن کر جناب ابو طالب نے کہا کہ "جاؤ اور جو چاہو کہو، اللہ کی قسم کسی معاوضہ پر بھی میں تمہیں ان کے حوالے ہرگز نہ کروں گا"۔

جناب ابو طالب کے عزم اور بھتیجے کے ساتھ ان کے رویہ کے پیش نظر کفارانِ مکہ ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارۃ کو لے کر ایک بار پھر ابو طالب کے پاس آئے اور کہا "اے ابو طالب! یہ عمارہ عرب کا خوبصورت، شکیل اور شاعر جوان ہے اسے اپنا بیٹا بنالو اور محمد (صلعم) کو ہمارے حوالے کر دو ہم انہیں ختم کر دیں گے۔" ابو طالب نے جواب دیا "خدا تمہارے چہروں کو تباہ کرے اور تم پر ہلاکت نازل ہو۔ خدا کی قسم تم نے بہت بڑی بات کہی۔ تم مجھے اپنا بیٹا دیتے ہو کہ میں تمہارے لئے اس کی تربیت کروں اور اپنا بیٹا تمہیں دوں کہ تم اسے قتل کر دو۔ اگر ایسا کروں تو خدا کی قسم میں بڑا مخنص ہوں" پھر فرمایا کہ "اونٹوں اور انکے بچوں کو الگ کر لو اگر کوئی اونٹنی اپنے بچے کے علاوہ کسی اور کی طرف مائل ہو تو میں محمد (صلعم) کو تمہارے سپرد کر دوں گا۔"

دورانِ گفتگو مطعم بن عدی بن نوفل اور جناب ابو طالب میں سخت کلامی ہوئی۔ معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا۔ دشمنی کھل کر سامنے آگئی۔ جناب ابو طالب نے دشمنی کرنے والوں پر تعریض کرتے ہوئے چند اشعار کہے۔ جو سیرت ابن ہشام ص: ۲۸۲ جلد: ۱ میں مرقوم ہیں۔

جناب ابو طالب سے ناامید ہو کر مشرکین نے آنحضرتؐ سے بلاواسطہ بات چیت کی۔ کبھی حکومت، دولت اور عورت کا لالچ دیا، کبھی کہا کہ ایک سال تم لات و عزیٰ کی پرستش کرو اور ایک سال ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں اور کبھی ہر بات و معاملات میں برابر کا شریک قرار دینے کی پیشکش کی لیکن اللہ کے

رسولؐ ان کی ہر خواہش کو رد کرتے ہوئے اللہ کے دین میں داخل ہونے کی دعوت دیتے رہے۔

عام الحزن : تاریخ اسلام میں نبوت کے دسویں سال کو بڑی اہمیت ہے۔ اسی سال بنی ہاشم شعب ابطالب سے اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔ اسی سال رسالتمآبؐ معراج پر تشریف لے گئے۔ اسی سال ابو طالب جیسے مہربان و مددگار چچا نے رحلت فرمائی اور اسی سال آپؐ کی غمگسار رفیقۂ حیات نے داغ مفارقت دیا۔ اس طرح آپؐ کے مددگار و غمگسار دونوں اس جہاں سے اٹھ گئے۔ جن کا آنحضرت کو بڑا قلق اور بے حد ملال ہوا۔ آپؐ نے اس سال کو "عام الحزن" یعنی غم کا سال قرار دیا۔

جناب ابو طالب کی وفات کے بعد آنحضرت صلعم شدید و عظیم مصائب سے دوچار ہوئے۔ "کفار مکہ آپ کو نہایت بے رحمی و بے باکی سے ستانے لگے۔ وہ آپؐ پر ظلم کرنے میں اتنے دلیر ہوئے کہ دست درازی پر اتر آئے اور آپ کو ایسی اذیتیں پہنچانے لگے جن کا ابو طالب کی زندگی میں تصور بھی ممکن نہ تھا"۔[1]

سفر طائف : باوجود اس کے کہ رسالتمآبؐ کو متواتر صدمات نے گھیرا ہوا تھا اور مشرکین مکہ نے گھر میں رہنا دشوار کر دیا تھا۔ حزن و ملال کے اس عالم میں بھی اللہ کے رسولؐ نے اُس مقصد کی بجا آوری کو اولیت دی جس مقصد عظیم کیلئے اللہ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا۔ قریش کی مخالفت کے باعث جب مکہ میں تبلیغ کا عمل دشوار ہو گیا تو آپؐ طائف تشریف لے گئے تاکہ وہاں کے لوگوں کو حق کی دعوت دیں مگر جب آپؐ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا اور اس دوران جن لوگوں کو دعوت دی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ بازاریوں اور اوباشوں کو آپؐ کے پیچھے

[1] تاریخ طبری ص: ۱۰۹ ج: ۱

لگا دیا جنہوں نے آپؐ کے پیچھے تالیاں بجائیں اور آپؐ پر پتھر برسائے جس سے آپ لہولہان ہو گئے۔ زخموں سے چور اور چلنے سے مجبور، جوں توں کر کے آپؐ نے ایک انگور کے باغ میں پناہ لی۔ جہاں باغ کے مالک عتبہ بن ربیعہ کا غلام عداس (جو مذہبا عیسائی) تھا نے آپؐ کی دلجوئی و تیمارداری کی۔ وہ آپؐ کے انداز کلام، صبر و تحمل اور پاکیزہ اخلاق سے بہت متاثر ہوا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد آپؐ واپس مکہ تشریف لائے۔

قبائل میں تبلیغ : مکہ پہنچ کر رسالتمآب نے حج کے موقعہ پر آنے والے مختلف قبائل کے لوگوں میں تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا مگر کسی نے بھی راہ حق اختیار نہ کی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ صدائے حق مکہ سے نکل کر دور دراز کے علاقوں میں پہنچ گئی۔ الغرض داعی حق مسلسل تیرہ سال تک حق دعوت ادا کرتے رہے۔ شرک بت پرستی میں ڈوبی ہوئی قوم کو کفر و ضلالت سے نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے لیکن ماسوائے چند نفوس جنہیں توفیق ایزدی نصیب ہوئی کسی نے دعوتِ حق کو قبول نہیں کیا۔

بیعت عقبہ : آخر کار وہ وقت بھی آیا جب حج کے موقعہ پر مدینہ سے آئے ہوئے قبیلہ خزرج کے چند لوگوں سے آپؐ کی ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآنی آیات کی تلاوت فرمائی۔ جس سے وہ لوگ بہت متاثر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ جب یہ لوگ واپس مدینہ پہنچے تو اپنی قوم کے دیگر افراد سے آنحضرت صلعم کی ملاقات کا ذکر کیا جس کے نتیجے میں آئندہ سال بارہ افراد نے عقبہ کے مقام پر آپؐ سے ملاقات کر کے آپؐ کی بیعت کی۔ جو بیعت عقبہ اولیٰ کہلاتی ہے۔ اس سے اگلے سال حج کی غرض سے بہتر افراد جن میں دو خواتین بھی تھیں مکہ آئے انہوں نے حج کے آخری ایام میں نہایت خفیہ طور پر رات کی تاریکی میں عقبہ کے مقام پر آنحضرتؐ سے ملاقات کی۔ آنحضرتؐ کے ہمراہ آپؐ کے چچا عباس بن عبد المطلب بھی تھے جو اس وقت تک اپنے آبائی دین پر قائم تھے۔ اس ملاقات میں اہل مدینہ نے نہ

صرف آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی بلکہ آپ کو اور آپؐ کے اصحاب کو مدینہ آنے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ عباس بن عبد المطلب نے ان سے عہد و پیمان کئے جس کے بعد آنحضرتؐ نے ان کی پیشکش کو قبول فرمایا۔ تاریخ میں یہ واقعہ "بیعت عقبہ ثانی" کہلاتا ہے۔

قریش کی سازش : بیعت عقبہ ثانی کے بعد ہی آنحضرتؐ نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو ایک ایک دو دو کر کے پوشیدہ طور مدینہ جانے کی اجازت دے دی لہذا ۱۲ نبوی سے ہجرت مدینہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کفار قریش کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بڑے چراغ پا ہوئے اور مخالفت و ایذا رسانی کی حدود سے نکل کر دشمن جانی بن گئے۔ ان سیاہ کاروں نے اسلام اور بانیٔ اسلام کو ختم کرنے کے لئے دار الندوہ میں ایک میٹنگ منعقد کی جس میں قریش کے ممتاز قبائل کے سرغنہ جنہیں بعض نے روسائے اعظم لکھا ہے شریک ہوئے۔ چند شرکاء کے نام جو تاریخ میں محفوظ ہیں وہ درج ذیل ہیں :-

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے : عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابو سفیان بن حرب۔
بنی نوفل بن عبد مناف میں سے : طعمہ بن عدی، جبیر بن مطعم اور حارث بن عامر۔
بنی عبد الدار بن قصیٰ میں سے : نضر بن حارث بن کلدہ۔
بنی اسد بن عبد العزیٰ میں سے : ابو البختری بن ہشام، زمعہ بن اسود اور حکیم بن حزام۔
بنی مخزوم میں سے : ابو جہل بن ہشام۔
بنی سہم میں سے : نبیہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج۔
بنی جمح میں سے : امیہ بن خلف اور اسکے ساتھی۔

ان کے علاوہ قریش کے اور بھی لوگ تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

ابن ہشام و طبری نے مذکورہ بالا کفار قریش کے علاوہ ابلیس کو بھی بشکل شیخ نجدی اس اجلاس میں شریک قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میٹنگ کے

دن ابلیس ایک خوش شکل بوڑھے کی صورت میں ایک موٹی چادر اوڑھے پہلے سے دار الندوہ کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ جب لوگوں نے اس سے اس کی بابت دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ "میں نجد والوں میں سے ایک شیخ ہوں" اس نے مزید کہا کہ تم لوگ جس مقصد کیلئے جمع ہوئے ہو اس کو سننے اور لوگوں کی خیر خواہی میں رائے دینے آیا ہوں۔ یہ لوگ اسے بھی اپنے ساتھ اندر لے گئے۔[1]

بہر حال میٹنگ کی کاروائی شروع ہوئی۔ سب نے اپنی اپنی تجویز پیش کیں کسی نے اخراج کی تجویز دی تو کسی نے حبس کی لیکن ابو جہل کی تجویز پر سب نے اتفاق کیا اور طے پایا کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے علاوہ ہر قبیلہ سے ایک ایک جوان لیا جائے اور یہ سب مل کر ایک ساتھ آنحضرتؐ پر وار کریں اسطرح یہ خون تمام قبائل میں بٹ جائیگا اور بنی ہاشم تمام قبائل سے بدلہ لینے پر قادر نہ ہوں گے۔ مجبوراً وہ خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ گو کہ یہ تمام کاروائی خفیہ رکھی گئی تھی لیکن آنحضرت کو بذریعۂ الہام اس کی اطلاع ہو گئی۔ جس دن یہ اجتماع ہوا اس دن کا نام "یوم الزحمۃ" رکھا گیا۔

ہجرت : ماہرین لسانیات نے ہجرت کے بہت سے معنی و مطالب بیان کئے ہیں۔ لیکن قرآنی آیات میں مہاجرت سے مراد "دار الکفر سے دار السلام کی طرف چلے آنے کے ہیں"۔ جیسا کہ رسالتمآبؐ و دیگر مسلمانوں نے دار الکفر مکہ سے دار السلام مدینہ ہجرت فرمائی۔ لفظ "ہجرت" ایک اسلامی اصطلاح ہے جس سے مراد ہے کہ کوئی مسلمان محض اللہ کی خاطر اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جائے۔ اللہ کی راہ اور دین کی سلامتی کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے نقل

[1] سیرت ابن ہشام ص: ۵۲۹ ج: ۱، تاریخ طبری ص: ۱۲۸ ج: ۱

مکانی ہجرت نہیں کہلائے گی۔ ہجرت سنتِ انبیاء ہے۔ رسالتمآبؐ سے پہلے متعدد انبیاء نے دین کی خاطر اپنے وطن سے ہجرت کی مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ وغیرہ۔

شہر مدینہ کا اصلی نام یثرب تھا۔ بنی عمالقہ کے یثرب نامی ایک رئیس قبیلہ نے اس شہر کو اپنے نام سے آباد کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام سے اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا جو بعد میں کثرتِ استعمال سے صرف مدینہ رہ گیا۔

شبِ ہجرت : جب کفار مکہ اپنی شوریٰ کے فیصلہ قتل پیغمبر پر آمادہ ہوئے تو ایک رات منصوبہ کے مطابق سر شام ہی سے رسالتمآبؐ کے گھر کو آگھیر اور اس انتظار میں رات بھر دار الشرف کا محاصرہ کئے رہے کہ جونہی صبح کو آنحضرتؐ اپنے گھر سے نکلیں ان کو تلواروں کی باڑ پر رکھ لیا جائے۔ ادھر مشرکین کے ارادۂ بد سے اللہ تعالیٰ نے اول شب ہی آنحضرت کو آگاہ کر دیا اور حکم دیا کہ حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلا کر غار ثور کی طرف چلے جائیں اور وہاں سے مدینہ کا رخ کریں۔ اور جب گھر سے نکلیں تو مٹھی بھر خاک اٹھائیں "شاهت الوُجُوه" کہہ کر ان کی طرف پھینکیں۔ وہ وقتی طور پر اندھے ہو جائیں گے۔ تم ان کے درمیان سے نکل جانا۔ آنحضرتؐ نے حکم الٰہی پر عمل کیا اور حضرت علیؑ سے فرمایا "کفار مکہ نے میرے قتل کا ارادہ کیا ہے تم میرے بستر پر سو جاؤ اور میری چادر اوڑھ لو وہ لوگ سمجھیں گے کہ میں سو رہا ہوں۔ میں غار ثور کی طرف جاتا ہوں تم میرے جانے کے تین دن بعد زنانِ بنی ہاشم کو لے کر اور جن لوگوں کی امانتیں میرے پاس ہیں ان کے مالکوں تک پہنچا کر مدینہ کی طرف کوچ کرنا میں وہاں تمہارا منتظر رہوں گا"۔ حضرت علیؑ حکم خدا اور رسولؐ بجا لائے اور بستر رسولؐ پر سو گئے۔

سورۂ بقرہ آیت ٢٠٧ جس کا ترجمہ ہے کہ "اور لوگوں میں خدا کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں، اور خدا ایسے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے" کی تفسیر میں مولانا ظفر حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی۔ حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ و میکائیلؑ سے فرمایا میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ (اخوت) قرار دیا ہے اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ کی تم میں کون ایسا ہے کہ اپنی زیادہ عمر کا حصہ اپنے بھائی کو دیدے، مگر دونوں نے اس سے انکار کیا۔ تب خدا نے ان دونوں سے فرمایا کہ میں نے نبیؐ اور علیؑ میں بھائی چارا قرار دیا ہے۔ دیکھو علیؑ نے اپنی جان نبیؐ پر کیوں کر نثار کی ہے اور بستر نبیؐ پر کیسا بے خوف سو رہا ہے۔ لہٰذا تم دونوں زمین پر جاؤ اور علیؑ کی حفاظت اس کے دشمنوں سے کرو۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں زمین پر آئے اور جبرئیلؑ علیؑ کے سرہانے اور میکائیلؑ پائنتی میں ان کی حفاظت کرنے لگے۔ وہ کہتے جاتے تھے مبارک ہو اے علیؑ تمہارا مثل کون ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس ہمدردی پر فخر و مباہات کرتا ہے۔ اس واقعہ کو تفسیر ثعلبی' احیاء العلوم امام غزالی میں تفصیلاً تحریر کیا گیا ہے۔[1]

ادھر مشرکین قریش فرش رسولؐ پر علیؑ کا پہرہ دیتے رہے تھے اور سمجھ رہے تھے یہی اللہ کے رسولؐ ہیں۔ جب صبح ہوئی تو وہ یکبار اندر داخل ہوئے۔ ردائے سبز کا گوشہ ہٹایا تو رسولؐ کی جگہ نفسِ رسولؐ کو سوتا پایا۔ یہ دیکھ کر ان پر حیرت و ناکامی کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے خجالت مٹانے کے لئے حضرت علیؑ سے پوچھا" تمہارے صاحب کہاں گئے" جواب ملا "میں نہیں جانتا۔ کیا تم انکو میرے سپرد کر گئے تھے جو پوچھتے ہو"۔

[1] تفسیر قرآن ص: ١٥٩ ج : ١

پھر یہ لوگ آنحضرتؐ کا کھوج لگاتے ہوئے آپؐ کی تلاش میں نکلے۔ نیز دوسرے لوگوں کو بھی آپؐ کی تلاش میں روانہ کیا۔ ادھر آنحضرتؐ خیریت غار ثور میں پہنچ گئے۔ اثنائے راہ میں حضرت ابوبکرؓ بھی آپؐ کے ہمسفر ہوئے۔ علامہ جلال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں کہ :

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکرؓ تین روز تک غار میں ٹھہرے رہے اور عامر بن فہیرہ ان کے لئے کھانا لاتا اور علیؑ اس (کھانے) کا سامان کرتے رہے پس آپ (علیؑ) نے تین اونٹ بحرین کے اونٹوں میں سے خریدے اور ایک راہنما عبداللہ بن اریقط جو ایک کافر تھا، کو رہنمائی کیلئے اجرت پر مقرر کیا تھا۔ جب تیسری رات کا کچھ حصہ گزرا تو حضرت علیؑ اونٹ اور راہبر کو ساتھ لائے ایک اونٹ پر رسول اللہ صلعم اور ایک اونٹ پر ابوبکرؓ سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے"۔

(تفسیر در منثور ص: ٢٣٠ ج: ٣، ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ٣١٢ ج: ٢)

مکہ سے مدینہ تک کی منازل سفر طے کرتے ہوئے جناب رسالتمآب آٹھویں ربیع الاول ١٣ نبوی روز دو شنبہ مطابق ٢٣ ستمبر ٦٢٢ء کو قبا میں جلوہ افروز ہوئے۔ عقیدتمندوں نے والہانہ استقبال کیا اور خدمت گزاری و مہمان نوازی کا شرف بخشنے کی درخواست کی جسے شرفِ قبولیت عطا ہوا۔ آپؐ کے طعام و قیام کا شرف کلثوم بن ہدم کو نصیب ہوا جبکہ رشد و ہدایت' تعلیم و تبلیغ کی مجالس سعد بن خثیمہ کے مکان میں منعقد ہوتی تھیں۔ آپؐ نے قبا میں چودہ روز قیام فرمایا۔ اپنی آمد کے تیسرے دن آپؐ نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح مسجدِ قبا دنیا کی پہلی مسجد ہے۔ اسی روز حضرت علیؑ مکہ سے پاپیادہ قبا میں آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔

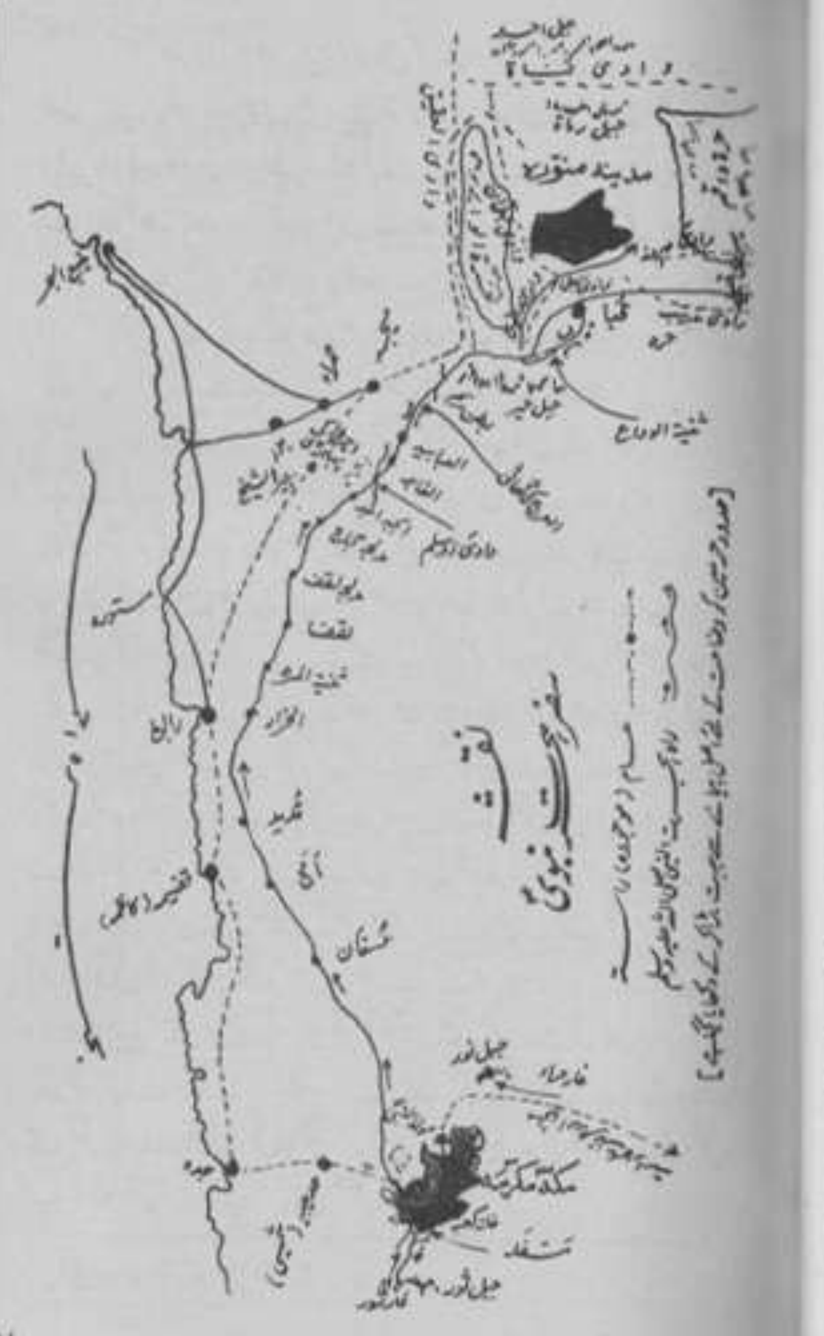

آنحضرتؐ ۲۲ ربیع الاول کو مقام قبا سے مدینہ روانہ ہوئے قبیلہ بنی سالم بن عوف میں پہنچے تو نماز جمعہ کا وقت ہو گیا لہٰذا آپ نے وہاں نماز جمعہ ادا کی اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبہ جمعہ تھا۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو وہاں آپؐ کے منتظر مہاجرین و انصار نے نعرۂ تکبیر کی گونج میں آپؐ کا پرزور استقبال کیا۔ بوڑھے' بچے' مرد و زن سب آپؐ کے دیدار کے مشتاق تھے آپؐ کی زیارت کے لئے سب گھروں سے نکل پڑے۔

مدینہ میں ہر شخص کی خواہش تھی کہ آپؐ اس کے مہمان ہیں لہٰذا آپؐ نے فرمایا "میرے ناقہ کو چھوڑ دو' وہ خدا کی طرف سے مامور ہے"۔ چنانچہ ناقہ کو چھوڑ دیا گیا وہ حضرت ابو ایوب انصاری کے مکان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اس طرح آپؐ کی مہمان نوازی کا شرف جناب ابو ایوب انصاری کو نصیب ہوا۔ یہ اپنے قبیلے کے سردار اور دولتمند اشراف مدینہ تھے۔ ان کا تعلق بنی نجار سے تھا، ان کا نام خالد تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب خالد بن زید بن کلیب بن ثعلبہ بن عوف بن غنم بن مالک بن نجار تھا۔ چونکہ جناب عبد المطلب کی والدہ سلمٰی بنت عمرو بن زید کا تعلق بھی اسی قبیلہ بنو نجار سے تھا لہٰذا اس رشتہ سے جناب ابو ایوب انصاریؓ اولاد عبد المطلب کے ماموں تھے۔ جن میں رسالتمآبؐ بھی شامل ہیں ابو ایوب انصاریؓ جنگ بدر' احد و خندق اور تمام مشاہد میں رسالتمآبؐ کے ہمراہ موجود رہے۔ ان کی وفات ۵۲ھ میں ہوئی۔ ان کی قبر قسطنطنیہ میں ہے زمانہ قحط میں لوگ اس کے توسل سے دعائے استسقاء کرتے تھے۔[1] رسالتمآبؐ نے انکے مکان میں تقریباً سات ماہ قیام فرمایا حتیٰ کہ مسجد نبوی تعمیر ہو گئی اور اس کے ملحق آپؐ کا حجرہ بن گیا تو آپ اس میں منتقل ہو گئے۔

[1] طبقات ابن سعد ص: ۹۰ ج: ۴

تعمیر مسجد : رسالتمآبؐ نے مدینہ پہنچتے ہی بندگان خدا کی عبادت کیلئے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جس کی تعمیر میں سات ماہ کا عرصہ لگا۔ اس دوران تمام مسلمان ایک انصاری کے افتادہ مکان میں نماز ادا کرتے رہے۔ مسجد کی تعمیر کے لئے آنحضرتؐ نے وہ قطعۂ زمین منتخب فرمایا۔ جو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان سے ملحق تھا۔ جس میں چند پرانی قبریں اور چند کھجور کے درخت تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنے اس انتخاب کی بابت انصار سے ذکر کیا تو سب نے بر ضا و رغبت بلا معاوضہ یہ زمین دینے کی پیشکش کی لیکن رسالتمآبؐ نے اسے قبول نہیں فرمایا۔ بالآخر قیمت طے پائی، جو حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ادا کی۔[1]

مسجد کی تعمیر شروع ہوئی' رسالتمآبؐ نے پہلا پتھر اپنے دست مبارک سے رکھا اور جملہ مسلمان' مہاجرین و انصار نے مل جل کر خود اس مسجد کو تعمیر کیا آنحضرتؐ بھی انکے ہمراہ ایک عام مزدور کی طرح کام کرتے تھے۔ بے گھر مسلمانوں کیلئے ایک چبوترہ بنایا گیا جو "صفہ" کہلایا اور مسجد سے ملحق آپؐ کیلئے حجرہ تعمیر کیا گیا۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں حضرت علیؑ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کام کے دوران یہ رجز پڑھتے رہتے تھے۔

لایستوی من یعمر المساجدا   یدأب فیھا قائماً و قاعدا

ومن یری عن الغبار حائدا

ترجمہ: جو شخص مسجدوں کی تعمیر کرتا ہے، ان میں قیام و قعود کرتا ہے۔ اور وہ شخص جو گرد و غبار سے کتراتا نظر آتا ہے' دونوں برابر نہیں ہوں گے۔[2]

مواخات : رسالتمآبؐ نے اپنے اصحاب مہاجرین و انصار کے درمیان باہمی (اخوت) بھائی چارگی قائم فرمائی۔ اس موقعہ پر آپؐ نے ارشاد فرمایا "اللہ کی راہ میں دو دو شخص بھائی بھائی بن جاؤ" ابن اسحاق کا بیان ہے کہ

[1] سیرۃ الحلبیہ ص: ۲۸۰ ج: ۱ [2] سیرۃ ابن ہشام ص: ۵۴۷ ج: ۱

" پھر آپؐ نے علی بن ابطالب رضوان اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا! ھذا اخی (یہ میرا بھائی ہے)۔ رسول اللہ ﷺ' سید المرسلین' امام المتقین' رسول رب العالمین' جن کا اللہ کے بندوں میں کوئی مثل و نظیر نہ تھا اور علی ابن ابطالب رضوان اللہ علیہ بھائی بھائی بن گئے۔ حمزہؓ بن عبد المطلب شیر خدا و شیر رسول خدا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا اور زید بن حارثہ جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ تھے' بھائی بھائی قرار پائے۔ جنگ احد ہونے والی تھی تو حمزہؓ نے موت کا حادثہ پیش نظر رکھتے ہوئے زید ہی کو وصیت کی تھی۔

جعفرؓ بن ابطالب ذوالجناحین الطیار فی الجنۃ (جنت میں اڑتے پھرنے والے) کا بنی سلمہ والے معاذ بن جبلؓ سے بھائی چارا ہوا۔ جعفر بن ابطالب اس وقت (مدینہ منورہ) میں موجود نہ تھے بلکہ سرزمین حبشہ میں تھے"۔ (سیرۃ ابن ہشام ص: ۵۶۲ ج: ۱)

مسلمانوں میں اس بھائی چارے کی وجہ سے ایک طرف تو انصار کا وقار و مرتبہ بلند ہوا اور دوسری طرف مہاجرین کو نہ صرف معاشی لحاظ سے ایک گونہ خوشحالی میسر آئی بلکہ ان کی آبادکاری کا مشکل مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی یہ سب اپنے انصار بھائیوں کے ساتھ آباد ہوئے اور آپس میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ محبت کرنے لگے۔

اسلامی ریاست کا قیام : ویسے اسلامی ریاست کی بنیاد بیعت عقبہ ثانی کے اس معاہدہ کے وقت ہی پڑ گئی تھی جس میں ایک طرف اہل یثرب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلامی احکامات کی اتباع کریں گے اور دشمنوں سے' خصوصاً قریش سے آپؐ کی حفاظت کریں گے' دوسری طرف انہوں نے آنحضرتؐ سے یہ وعدہ لیا کہ آپؐ نہ تو انہیں چھوڑیں گے اور نہ ہی مکہ واپس

آئیں گے۔ لیکن واضح طور پر اسلامی ریاست کے قیام کا آغاز آپؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد ہوا۔ اس وقت مدینہ میں ایسا کوئی انتظامی ادارہ نہ تھا جو مختلف قبائل کو متحد رکھ سکے۔ ہر قبیلہ مکمل طور پر خود مختار اور اپنے معاملات میں آزاد تھا۔ اوس و خزرج بارہ قبائل میں منقسم تھے اور یہود کے دس قبائل تھے۔ یہود مدینہ زور آور تھے جب کہ اوس و خزرج باہمی لڑائیوں میں اپنی قوت ضائع کر چکے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی یہودیوں کے دست نگر بن کر رہ گئے تھے۔ نیز سیاسی اعتبار سے بھی یہودیوں کی بالادستی قائم تھی۔ اس صورتحال کے پیش نظر آنحضرتؐ نے مسلمانوں کی سالمیت و اتحاد اور اہل مدینہ کی باہمی حفاظت کے لئے یہودیوں اور دیگر غیر مسلم قبائل سے معاہدات کئے۔

مسجد نبوی کی تعمیر اور مسلمانوں میں اخوت کے قیام کے بعد آپؐ نے ایک منشور مرتب فرما کر اسلامی ریاست کا قیام فرمایا۔ جس سے نہ صرف مدینہ کو ایک شہری مملکت کی حیثیت حاصل ہوئی بلکہ اس کے ذریعہ تمام منتشر عرب قبائل خصوصاً اہل مدینہ کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی راہ نکلی۔ نیز "منشور مدینہ" انقلابی دستور ثابت ہوا کیونکہ پہلے جو حق کسی فرد یا قبیلے کو حاصل تھا وہ اب عوام الناس کا اجتماعی معاملہ بن گیا اور اس طرح ایک طرف طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوا تو دوسری طرف صحیح معنوں میں اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی۔

میثاق مدینہ کا ایک حصہ انصار و مہاجرین سے متعلق تھا اور دوسرا حصہ یہود مدینہ کے حقوق و فرائض سے وابستہ تھا۔ اہل یہود جو عربوں پر معاشی و معاشرتی برتری رکھتے تھے' کا اس میثاق کو قبول کر لینا بلاشبہ رسالتمآبؐ کی سیاسی بصیرت کا اعجاز تھا۔ اس میثاق کے ذریعہ مدینہ اور اہل مدینہ اندرونی طور پر محفوظ ہو گئے اور اسی کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ نے

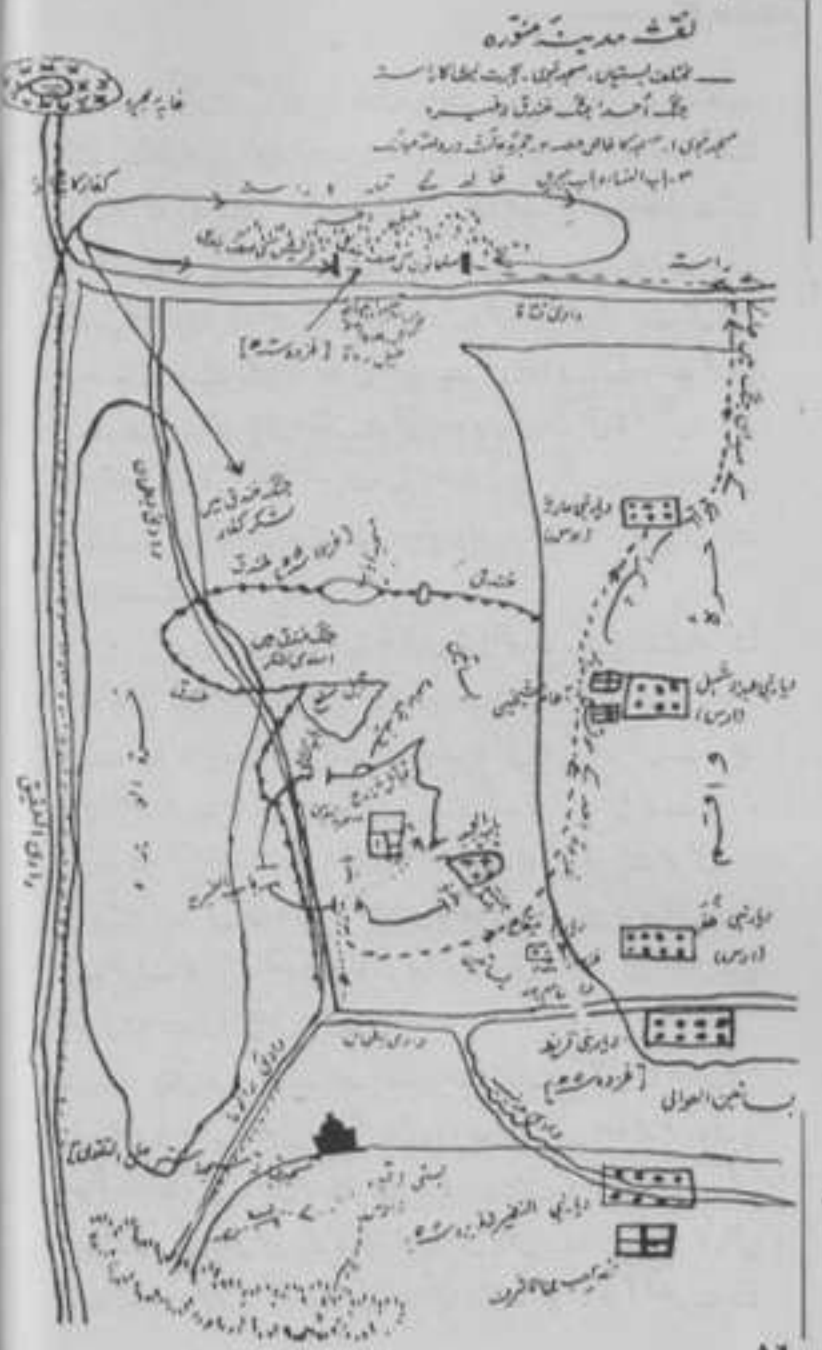

پڑوسی قبائل سے بھی معاہدات کے ذریعہ دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ آپؐ نے قریش سے بھی ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صلح نامہ مسلمانوں کیلئے فتح مبین ثابت ہوا۔ اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد مشرکین مکہ کی بد عہدی فتح مکہ کا باعث بنی۔ جس کے بعد جزیرہ نما عرب میں اسلامی ریاست مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی۔

اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد امن و امان قائم کرنا اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا تھا جس میں ہر مسلمان بے خوف و خطر احکامات خداوندی بجالائے۔ مگر شرک و بت پرستی میں ڈوبے ہوئے مشرکین مکہ ایسا ماحول کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ وہ تو اسلام اور بانی اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر کمربستہ تھے۔ انکے لئے تو آنحضرت کا مکہ سے صحیح سلامت نکل جانا اور اہل مدینہ کا آپؐ سے محبت و الفت سے پیش آنا ہی باعث قلق تھا۔ چہ جائے کہ ان مشرکین کی سازشی کاروائیوں سے محفوظ رہنے کے لئے آنحضرت کا مدینہ میں امن و امان کے انتظامات کو مستحکم بنانا اور گرد و نواح کے قبائل سے امن کے معاہدات کرنا۔ لہذا انہوں نے تنبیہہ آمیز پیغامات کے ذریعہ اہل مدینہ کو ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع کیا جیسا کہ عبداللہ بن ابی سلول کو بھیجے جانے والے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس خط میں تحریر تھا کہ:

"تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں ٹھہرایا ہے اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم ہماری طرف سے ہو کر اس سے لڑو اور اگر اس پر قدرت نہیں رکھتے تو اپنے شہر اور اپنے قبیلے سے اسکو باہر نکال دو۔ ورنہ سمجھ لو کہ قریش نے اکٹھا ہو کر قسم کھائی ہے کہ ہم سب مل کر تمہارے شہر اور تمہارے قبائل پر حملہ کر دیں گے۔ تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے قبضہ میں لائیں گے۔"

(سنن ابو داؤد' باب الخبیر ص: ۶۷ ج: ۲ سیرۃ النبیؐ ص: ۳۰۵ ج: ۱)

یہ صرف تنبیہہ نہ تھی بلکہ قریش مکہ نے یہود مدینہ سے خفیہ سازباز کر کے اس پر عمل بھی کیا۔ وہ سو سو پچاس پچاس آدمیوں کی ٹکڑیوں میں ان قبائل پر چھاپے مارنے' لوٹ مار اور قتل و غارت کرنے لگے جو مسلمانوں کے ساتھ معاہدات کر چکے تھے۔ لہذا شرائط معاہدہ کے مطابق آنحضرتؐ نے ان قبائل کی حفاظت و حمایت میں صحابہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ادھر ادھر بھیجنا شروع کیں۔

یہ مہمات دو قسم کی ہوتی تھیں ایک وہ جن کی سربراہی کسی صحابی کے سپرد کی گئی ہو ایسی مہم کو "سریہ" کہتے ہیں۔ ان کی تعداد میں مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ کم سے کم تعداد تینتیس اور زیادہ سے زیادہ چھیاسٹھ بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ سب سے پہلے سریہ کی سربراہی عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب بن ہاشم نے اور دوسرے سریہ کی سربراہی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم نے کی۔ دوسری قسم ان اہم مہمات کی تھی جن کی سربراہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس فرمائی ہو ان کو غزوات کہتے ہیں۔ ان غزوات کی کل تعداد ستائیس ہے۔ ان کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

غزوات کا مختصر جائزہ

[illegible]	[illegible]	اسباب	اقدام	نتائج
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر شمار	نام غزوہ بمع تاریخ روانگی از مدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
	جمادی الآخر ۲ھ مطابق نومبر ۶۲۳ء	سرکردگی میں مال تجارت فروخت کر کے شام سے واپس آ رہا تھا۔	تھے۔ آنحضرتؐ مقام ذوالعشیرہ میں فروکش ہوئے۔ قریشی قافلہ راہ تبدیل کر کے سمندر کے کنارے سے نکل گیا۔ اپنے قیام کے دوران آنحضرتؐ نے بنی مدلج سے معاہدہ کیا اور اسی موقع پر آپ نے حضرت علیؑ کو ابوتراب کے لقب سے نوازا۔ (سیرت ابن ہشام ص ۲۹۳ ج ۱)	ہوا۔ جس سے قریش کے تجارتی قافلوں پر نظر رکھنے میں مدد ملی۔
۵	غزوۂ بدر رمضان ۲ھ مطابق مارچ ۶۲۴ء	شام جانے والی شاہراہ پر آباد قبائل سے آنحضرتؐ کے معاہدات کو قریش مکہ نے اپنے تجارتی قافلوں کیلئے خطرہ تصور کیا لہٰذا وہ مسلمانوں سے جنگ کیلئے نکلے۔	مشرکین مکہ کو اس امر پر بے حد تشویش ہوئی کہ پیغمبر اسلام صلعم نے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ پر آباد قبائل سے دوستانہ مراسم قائم کر لئے۔ اب ان کو اپنے تجارتی قافلے غیر محفوظ محسوس ہونے لگے لہٰذا وہ پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کیلئے مکہ سے نکلے۔ اطلاع پا کر آنحضرتؐ بھی لشکر اسلامی کو حضرت علیؑ کی علمبرداری میں لیکر بدر کے مقام پر پہنچے دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا جنگ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے کثرت کے باوجود قریش کو ذلیل و رسوا کیا۔ ان کے نامور سردار واصل جہنم ہوئے۔ اس جنگ کی کچھ تفصیل حضرت حمزہؓ کے ذیل میں جلد اول میں تحریر کر چکے ہیں۔ مزید حضرت علیؑ کے ذیل میں آگے تحریر کریں گے۔	پہلا غزوہ تھا جس میں جدال و قتال ہوا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ نہایت اہم، فیصلہ کن اور عظیم الشان معرکہ تھا۔
۶	غزوۂ بنی قینقاع شوال ۲ھ مطابق اپریل ۶۲۴ء	حالانکہ یہودیوں نے آنحضرتؐ سے صلح کے معاہدے کئے تھے مگر ان کے ایک قبیلے بنی قینقاع نے عہد کو توڑا اور	بنی قینقاع کے کچھ لوگوں نے ایک مسلمان عورت سے بدسلوکی کی اس کا مذاق اڑایا جس کی فریاد پر ایک مسلمان نے اس یہودی کو قتل کر دیا جس نے یہ حرکت کی تھی۔ یہودیوں نے جمع ہو کر اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ جو کشیدگی کا باعث ہوا۔	قبیلۂ خزرج کے سردار عبداللہ ابن ابی سلول کی سفارش پر یہودیوں کی جان بخشی ہوئی اور وہ اپنا مال و

نمبر شمار	نام غزوہ بمع تاریخ روانگی از مدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
		نافرمانی کی۔	آنحضرتؐ وہاں تشریف لے گئے اور لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر یہودی نہ مانے اور سخت کلامی پر اتر آئے۔ تب آپ نے جہاد کا اعلان فرمایا۔ آنحضرتؐ نے حضرت حمزہؓ کی علمبرداری میں لشکر ترتیب دیکر یہودیوں کا محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن تک جاری رہا۔ یہودی محاصرہ کی سختیوں سے تنگ آ کر صلح پر آمادہ ہوئے۔	اسباب مسلمانوں کے حوالہ کر کے تقریباً سات سو افراد مدینہ سے نکل کر شام کی طرف چلے گئے۔
۷	غزوۂ سویق ذی الحجہ ۲ھ مطابق مئی ۶۲۴ء	بدر کی ذلت آمیز شکست کے بعد ابوسفیان نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کا عہد کیا اور منت مانی تھی۔ جس کو پورا کرنے اور اپنی سرداری کا بھرم رکھنے کیلئے وہ دو سو سواروں کے ہمراہ مدینہ پر حملہ کی غرض سے نکلا۔	مقتولین بدر کا انتقام لینے کیلئے ابوسفیان نے منت مانی تھی کہ جب تک وہ مسلمانوں سے بدلہ نہیں لے گا اس وقت تک نہ غسل کرے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا۔ اسی عہد کو پورا کرنے کیلئے وہ مدینہ کی جانب چلا مگر ایک منزل پہلے ہی اس نے پڑاؤ کیا اور بنو نضیر کے یہودیوں سے مسلمانوں کی بابت معلومات حاصل کر کے مدینہ کے عریض نامی علاقہ پر حملہ کیا اور سوئے ہوئے ایک انصار صحابی اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر کے بڑی تیزی سے فرار ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے اطلاع پا کر اس کا تعاقب کیا مگر وہ اس قدر تیزی کی حالت میں بھاگا کہ زاد راہ کے طور پر لائے ہوئے ستو (سویق) کے بورے وزن کم کرنے کی غرض سے پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ لگے اسی مناسبت سے اسے غزوۂ سویق کہا جاتا ہے۔	مشرکین پر مسلمانوں کی اچھی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ اتنا بڑا سالار اعظم اس بری طرح سے بھاگا کہ کسی منزل پر قیام بھی نہیں کیا۔ مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کو وافر مقدار میں ستو (سویق) کے بورے ہاتھ لگے۔
۸	غزوۂ قرقرۃ الکدر محرم ۳ھ مطابق جولائی ۶۲۴ء	بنی سلیم اور بنی غطفان کے سرداروں کی شرارت آمیز حرکتوں کا سدباب کرنا۔	سلیم ابن منصور اور غطفان ابن سعد جو اپنے اپنے قبیلوں کے سردار تھے مسلمانوں کے خلاف شر انگیزیوں میں مبتلا تھے۔ کسی بڑے واقعہ کے رونما ہونے سے قبل ان کا استیصال ضروری تھا لہٰذا آنحضرتؐ دو سو صحابہ کے ہمراہ ان کی تلاش میں نکلے۔ وہ تو فرار ہو گئے البتہ چند چرواہے اور مویشی ہاتھ لگے۔ اس مہم کی علمبرداری	اس غزوہ میں تقریباً پانچ سو اونٹ مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

نمبر شمار	نام غزوہ بمع تاریخ روانگی از مدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
			حضرت علیؑ کے سپرد تھی۔	
۹	غزوۂ ذو غطفان ربیع الاول ۳ھ مطابق دسمبر ۶۲۴ء	آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ نجد کے مقام ذوامر میں ایک جماعت آپ کے خلاف جنگی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔	لہٰذا آپ چار سو پچاس گھوڑے سوار صحابہ کے ہمراہ دشمن کے تعاقب میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔ دور تک سفر کیا مگر دشمن کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ آنحضرتؐ کی آمد کی اطلاع پا کر فرار ہو گیا۔	قبائل عرب پر مسلمانوں کا رعب قائم ہو گیا۔
۱۰	غزوۂ بنی سلیم جمادی الاول ۳ھ مطابق اکتوبر ۶۲۴ء	آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی سلیم کے جنگجو مسلمانوں کے خلاف جمع ہو رہے ہیں۔	بنی سلیم کی سرکوبی کیلئے آنحضرتؐ تین سو صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ سے [illegible] (۹۵) میل کے فاصلہ پر واقع مقام بحران پہنچے لیکن دشمن آپ کی آمد کی خبر پا کر منتشر ہو گئے۔	اس مہم میں بھی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔
۱۱	غزوۂ احد شوال ۳ھ مطابق مارچ ۶۲۵ء	جنگ بدر میں مارے جانے والے سرداران قریش کا بدلہ لینے کیلئے مشرکین مکہ نے زور و شور سے تیاریاں کیں اور آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کیلئے مشرکین کا سپہ سالار اعظم ابوسفیان ابن حرب تین ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں سے مقابلہ کیلئے نکلا۔ لشکر کے سرداروں کے	مکہ میں مقیم عباس ابن عبدالمطلب نے قاصد کے ذریعہ مشرکین کی تیاریوں اور لشکر کشی کی اطلاع آنحضرتؐ کو پہنچائی آپ نے فوراً دو مخبر روانہ کئے جو مزید معلومات حاصل کیں۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن اکثر صحابہ نے مدینہ سے نکل کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا لہٰذا احد کے دامن میں فریقین کا مقابلہ ہوا۔ اسلامی لشکر نے دشمن کو پسپا کر دیا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگا۔ مسلمان مال غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ آنحضرتؐ نے میدان کے پشت کی جانب ایک درہ پر کچھ تیر انداز متعین کئے تھے اور انہیں ہدایت کی تھی کہ حالات خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ لیکن وہ دوسروں کو دیکھ کر وہ بھی	اس جنگ میں آنحضرتؐ کی حکم عدولی کے باعث مسلمانوں کی جیتی ہوئی جنگ کو ہار میں بدل دیا۔ اس معرکہ میں مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے جبکہ مشرکین کے کل تئیس آدمی مارے گئے۔ حضرت حمزہؓ شہید ہوئے ان کی لاش کو مثلہ کیا گیا اور ابوسفیان کی

نمبر شمار	نام غزوہ بمع تاریخ روانگی از مدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
		جذبات کو برانگیختہ کرنے کیلئے روسائے کفار کی عورتیں بھی ان کے ساتھ آئیں۔	مال غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ موقع پا کر دشمن نے درہ سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا یہ دیکھ کر دشمن کی بھاگتی ہوئی فوج بھی پلٹ آئی اس طرح مسلمانوں پر دونوں طرف سے حملہ کر دیا۔ مسلمان افراتفری کے عالم میں فرار ہو گئے۔ چند جانثار وہاں بے جگری سے لڑتے اور آنحضرتؐ کی حفاظت کرتے رہے۔ ان میں حضرت علیؑ، حضرت حمزہؓ اور حضرت ابودجانہ نے شجاعت کے اعلیٰ جوہر دکھائے۔ مشرکین اپنی کامیابی کو تکمیل تک پہنچائے بغیر میدان سے فرار ہو گئے اور جنگ کو غیر فیصلہ کن انداز میں چھوڑ دیا۔	زوجہ ہندہ نے ان کے اعضاء کو [illegible] میں پرو کر ہار بنایا اور اسے پہنا۔ نیز ان کا جگر نکال کر چبانے کی کوشش کی مگر نگل نہ سکی۔
۱۲	غزوۂ حمراء الاسد شوال ۳ھ مطابق مارچ ۶۲۵ء	میدان احد سے مشرکین کے چلے جانے کے بعد آنحضرتؐ نے خیال کیا کہ کہیں ان کی نیت خراب نہ ہو جائے اور وہ پلٹ کر مدینہ پر حملہ کر دیں۔ آپ نے ان کا تعاقب کیا۔	جنگ کے تھکے ہوئے اسلامی لشکر نے رات آرام کیا دوسرے روز آنحضرتؐ اپنی خستہ حال جماعت کو لیکر مشرکین مکہ کے تعاقب میں مقام حمراء الاسد تک گئے اور تین روز وہاں قیام فرمایا۔ گو کہ اس وقت آپ خود زخموں سے چور تھے لیکن جنگی اعتبار سے یہ ایک انتہائی اہم معاملہ تھا۔ اگر اس وقت مشرکین مدینہ پر حملہ آور ہو جاتے تو مسلمانوں کا بہت بڑا نقصان ہوتا۔ اس موقع پر رایت لشکر حضرت علی ابن ابی طالب تھے۔	اس مہم سے آنحضرتؐ کی بصیرت، دور بینی اور جنگی مہارت کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔
۱۳	غزوۂ بنی نضیر ربیع الاول ۴ھ مطابق اگست ۶۲۵ء	مدینہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر آباد یہودیوں کا ایک قبیلہ بنی نضیر دھوکے سے آنحضرتؐ کی جان لینے کی منصوبہ بندی کر رہا	یہودیوں کی اس حرکت پر آنحضرتؐ نے انہیں دس دن کے اندر اندر مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا جس پر وہ لوگ آمادہ بھی ہو گئے لیکن منافقین عبداللہ ابن ابی کے اکسانے پر انہوں نے آنحضرتؐ کو سخت جواب دیا۔ لہٰذا ان کی سرکوبی کیلئے آپ ایک جماعت کے ہمراہ روانہ ہوئے اور لشکر کا علم حضرت علیؑ کے سپرد	اس مہم میں دو یہودیوں نے اسلام قبول کیا۔ آنحضرتؐ کو زمینوں اور نخلستانوں کے علاوہ ملنے والی تمام چیزیں آنحضرتؐ کے خالصہ

نمبر شمار	نام غزوہ و تاریخ زندگی المدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
		تھا جس کا علم آنحضرت کو بذریعہ الہام ہو گیا۔	کیا۔ دشمن قلعہ بند ہو گیا۔ اس کا محاصرہ کیا گیا۔ جو پندرہ دن جاری رہا۔ محاصرہ کی سختیوں سے تنگ آ کر وہ صلح پر آمادہ ہوئے اور آنحضرت کے حکم کے مطابق مدینہ سے نکل گئے۔ ان میں سے کچھ شام چلے گئے مگر زیادہ خیبر میں آباد ہو گئے۔	میں تجارتی گلیں اور زراعت کے حاصل شدہ فوائد کے اخراجات کے لئے مخصوص کر دی گئیں۔
۱۴	غزوۂ بدر الموعد شوال ۴ھ مطابق مئی ۶۲۶ء	میدان احد سے جاتے ہوئے ابوسفیان یہ اعلان کر گیا تھا کہ آئندہ سال وہ بدر کے مقام پر مقابلہ کیلئے آئیگا۔	ابوسفیان میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت تو تھی نہیں مگر وہ اپنے عہد کو پورا کرنے اور سرداری کا بھرم رکھنے کیلئے جنگ کی تیاری کرنے لگا ساتھ ہی حیلہ سازی و مکاری سے کام لیکر نعیم بن مسعود کے ذریعہ پروپیگنڈا کرایا کہ ابوسفیان بہت زبردست تیاری کے ساتھ حملہ آور ہونے والا ہے۔ اس پروپیگنڈے سے بہت سے صحابہ متاثر ہوئے لیکن آنحضرت نے جہاد کا اعلان فرمایا۔ اور حضرت علی کو علمدار لشکر مقرر فرمایا۔ نیز حکم دیا کہ مسلمان مال تجارت ساتھ لیکر چلیں۔ ابوسفیان دو ہزار مشرکین کے ہمراہ مرالظہران تک آیا اور وہیں سے واپس لوٹ گیا۔	اس مہم سے مشرکین پر مسلمانوں کی ہیبت طاری ہو گئی۔ اس موقعہ پر بدر میں لگنے والے بازار میں مسلمانوں نے اپنا مال تجارت فروخت کیا جس میں بہت نفع ہوا۔
۱۵	غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ محرم ۵ھ مطابق ۱۵ جون ۶۲۶ء	آنحضرت کو اطلاع ملی کہ نجد میں واقع ذات الرقاع کے قبائل انمار اور ثعلبہ مسلمانوں سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔	آنحضرت تقریباً چار سو اصحاب کے ہمراہ ان کی سرکوبی کیلئے ذات الرقاع پہنچے مگر مسلمانوں کی آمد کی اطلاع پا کر دشمن پہاڑوں میں جا چھپا اور حملہ کرنے کیلئے موقع کی تلاش میں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب آنحضرت نے صلوٰۃ خوف ادا کی۔ آپ نے کچھ روز وہاں قیام فرمایا کہ دشمن کا انتظار کیا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔	اس مہم میں آپ کے پندرہ روز صرف ہوئے لیکن دشمن سے مقابلہ نہ ہوا۔
۱۶	غزوۂ دومۃ الجندل	دمشق کی جانب سرحد پر واقع دومۃ	آنحضرت تقریباً ایک ہزار صحابہ کی ہمراہ پندرہ دن کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچے	اس مہم میں چند اونٹ مسلمانوں

نمبر شمار	نام غزوہ و تاریخ زندگی المدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
	۵ ربیع الاول ۵ھ مطابق ۲۲ اگست ۶۲۶ء	الجندل کا حاکم اکیدر بن عبدالملک مسلمانوں کے تجارتی قافلوں کو پریشان کرتا تھا۔	تو چند چرواہوں کے علاوہ کسی کو نہ پایا۔ ان سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی دشمن فرار ہو گیا۔ ان چرواہوں میں سے ایک نے اسلام قبول کیا۔	کے ہاتھ لگے جو مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ اس مہم میں تقریباً ایک ماہ لگا۔
۱۷	غزوۂ بنی مصطلق ۲ شعبان ۵ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۶۲۶ء	قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنی مصطلق جو مریسیع نامی ایک چشمہ کے قریب رہتی تھی اس کا سردار حارث بن ابی ضرار دیگر قبائل کو جمع کر کے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔	آنحضرت نے صحابی اسلمی کے ذریعہ واقعہ کی تحقیق کرائی اس کے بعد اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عبداللہ ابن ابی اور اس کی منافق جماعت بھی اسلامی لشکر میں شریک ہوئی۔ اس مہم میں حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔ جب طویل سفر طے کر کے اسلامی لشکر وہاں پہنچا تو جمع ہونے والے دیگر قبائل تو فرار ہو گئے البتہ وہاں کی آبادی نے ان کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر ہتھیار ڈال دیئے۔ دشمن کے دس آدمی قتل ہوئے اور تقریباً چھ سو گرفتار ہوئے جن میں حارث کی بیٹی جویریہ بھی تھیں جو بعد میں آنحضرت کی زوجیت میں آئیں۔	اس غزوہ میں وضو کیلئے پانی نہ ملنے کے باعث تیمم کا حکم نازل ہوا۔ اسی مہم کے دوران حضرت عائشہ کا ہار گم ہوا اور ان پر تہمت لگی۔
۱۸	غزوۂ خندق ۲ شوال ۵ھ مطابق ۲۴ مارچ ۶۲۷ء	قریش مکہ، یہود مدینہ اور مشرکین عرب نے باہمی اتحاد کر کے اسلام کو ختم کرنے کیلئے بہت بڑا لشکر جمع کر کے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔	آنحضرت کو جب اس طوفان عظیم کی خبر ملی تو آپ نے دفاعی انتظامات پر توجہ دی۔ اللہ کے ساتھ آپ نے دشمن لشکر مدینہ میں روک کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ شہر مدینہ اپنے محل وقوع کے باعث بہت محفوظ مقام تھا اس کے تین طرف پہاڑی سلسلے اور گھنے جنگلات تھے صرف شمال مغربی حصہ میدانی تھا۔ حضرت سلمان فارسی کے مشورے سے آپ نے اس حصہ میں خندق کھدوائی جو	دشمنان اسلام کی متحدہ آخری کوشش ناکام ہوئی جس کے بعد ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کو کسی بھی صورت شکست نہیں دے

نمبر شمار	نام غزوہ و تاریخ زندگی المدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
			تقریباً ساڑھے تین میل لمبی، اوسطاً دس گز چوڑی اور پانچ سے دس گز گہری تھی۔ شوال کے آخر میں لشکر کفار حملہ آور ہوا تو خندق کو دیکھ کر حیران ہو گیا کیونکہ اس سے قبل انہوں نے یہ طریقہ نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا فریقین میں تیر اندازی ہوتی رہی پھر مشرکین کے چند بہادروں نے کم چوڑائی والے حصہ سے خندق کو عبور کیا۔ ان بہادروں میں عمرو بن عبدود بھی تھا جس کے نام سے بڑے بڑے لوگوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ لشکر اسلام میں سے حضرت علی نے مقابلہ کر کے اس کو واصل جہنم کیا۔ دشمن کا محاصرہ جاری تھا کہ اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور ایسی زوردار آندھی چلی کہ کفار کے خیمے اکھڑ گئے۔ مشرکین کا سپہ سالار اعظم ابوسفیان اونٹ پر سوار ہو کر فرار ہوا اس کے پیچھے اس کا لشکر بھی چل پڑا۔ اس طرح اللہ نے مسلمانوں کو کفار کے شر سے محفوظ کر دیا۔	سکے۔ اس طرح غزوۂ احزاب کے نتائج مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہوئے۔
۱۹	غزوۂ بنی قریظہ ۲۳ ذیقعدہ ۵ھ مطابق ۱۵ اپریل ۶۲۷ء	مدینہ میں آباد یہودیوں کا قبیلہ بنی قریظہ غزوۂ خندق کے موقع پر عہد شکنی کا مرتکب ہوا اور اعلانیہ آنحضرت کی تکذیب و مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔	لہٰذا غزوۂ خندق کے بعد آنحضرت نے اس اندرونی دشمن کی طرف توجہ فرمائی اور بنو قریظہ کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ رایت لشکر حضرت علی کے سپرد فرمایا۔ محاصرے سے تنگ آ کر بنی قریظہ نے آنحضرت سے درخواست کی کہ سعد بن معاذ جو بھی فیصلہ کریں گے انہیں منظور ہوگا۔ چونکہ سعد بن معاذ کے قبیلہ اوس اور بنی قریظہ کے قدیم تعلقات تھے۔ اس لئے یہودیوں نے یہ درخواست کی تھی۔ آنحضرت نے ان کی درخواست قبول کی اور حضرت سعد کو قریظہ کی بستی میں بھیج دیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور بچوں، عورتوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے "۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد ہوا۔	بنی قریظہ کے کم سے کم چھ سو بالغ مرد قتل کئے گئے اور مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ اس واقعہ کے بعد مدینہ سے یہودیوں کی آبادی کا خاتمہ ہو گیا۔

نمبر شمار	نام غزوہ و تاریخ زندگی المدینہ	اسباب	اقدام	نتائج
۲۰	غزوۂ بنی لحیان ۵ صفر ۶ھ مطابق جولائی ۶۲۷ء	عسفان کے قریب مقام رجیع میں آباد بنو لحیان نے آنحضرت سے درخواست کی کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں لہٰذا چند صحابہ کو دینی تعلیم دینے کیلئے بھیج دیں۔ آپ نے دس صحابہ کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ بنولحیان نے بدعہدی کی اور دھوکے سے صحابہ کو قتل کر دیا۔	آنحضرت کو صحابہ کے قتل کا سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے بنولحیان کے خلاف لشکر کشی کا ارادہ فرمایا لیکن دشمن سے پوشیدہ رکھنے کیلئے لوگوں سے ملک شام جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور راستہ تبدیل کر کے تیز رفتاری سے غران پہنچے جہاں بنولحیان کے مکانات تھے۔ لیکن دشمن کو آپ کی آمد کی اطلاع ہو گئی وہ پہاڑ کی چوٹیوں پر روپوش ہو گیا۔ آپ نے ایک دو دن وہاں قیام فرما کر دشمن کو تلاش کرایا مگر دشمن کا کہیں پتہ نہ چلا۔ پھر آپ عسفان پہنچے وہاں بھی تلاش کیا لیکن وہ روپوش ہو چکے تھے۔ اس مہم میں آپ کو چودہ روز لگے۔	دشمن روپوش ہو چکا تھا اس لئے مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔
۲۱	غزوۂ غابہ ربیع الاول ۶ھ مطابق اگست ۶۲۷ء	غزوۂ بنی لحیان سے آئے ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ آنحضرت کو اطلاع ملی کہ عیینہ بن حصن فزاری نے غابہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے اونٹ چرانے والے حضرت ابوذر کے بیٹے کو قتل کر دیا اور آپ کی بیس اونٹنیاں ہنکا کر لے گئے۔	مدینہ سے چار میل دور بمقام غابہ کی چراگاہ میں اہل مدینہ کے جانور چرتے تھے۔ ان میں آنحضرت کی اونٹنیاں بھی تھیں۔ جن کو دشمن لٹیرے ہنکا کر لے گئے۔ آنحضرت نے مقداد بن اسود کو لٹیروں کی تلاش میں بھیجا جنہوں نے لٹیروں پر تیر اندازی کر کے دس اونٹنیاں چھڑا لیں اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے ذی قرد کے چشمہ پر پہنچ گئے جہاں محرز بن نضلہ شہید ہوئے اور دشمن کے کئی آدمی مارے گئے۔ اسی اثناء میں آنحضرت پانسو آدمیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔ لٹیرے مقابلہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ آنحضرت ایک شب و روز قیام کر کے واپس ہوئے۔	اس مہم میں مسلمانوں کو وہ مال غنیمت ہاتھ لگا جو دشمن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ ان میں کچھ اونٹ اور بکرے وغیرہ بھی تھے۔ آنحضرت نے یہ مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔
۲۲	غزوۂ حدیبیہ ۳ شوال ۶ھ مطابق	آنحضرت کو مدینہ آئے تقریباً چھ سال ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں	حقیقتاً یہ کوئی جنگی مہم نہ تھی بلکہ ایک دینی فریضہ تھا جس کی ادائیگی کیلئے آنحضرت چودہ سو مسلمانوں کے ہمراہ احرام باندھ کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور قربانی کے	صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین قرار دیا اور سورہ فتح

نمبر شمار	نام غزوہ مع تاریخ وقوعہ	اسباب	اقدام	نتائج
	۱۳ مارچ ۶۲۸ء	آنحضرتؐ اور دیگر مسلمان مکہ نہیں جاسکے تھے۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے عمرہ کی غرض سے مکہ جانے کا اعلان فرمایا۔	جانور ساتھ لئے۔ اس پر بھی مشرکین مکہ نے مزاحمت کی اور مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ آخرکار حدیبیہ کے مقام پر ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے اور مسلمان عمرہ ادا کئے بغیر واپس ہوگئے۔ مورخین نے اس واقعہ کو غزوات کی فہرست میں اس لئے شامل کیا کہ آنحضرتؐ اس سفر مبارک میں مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ ہم اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کے عنوان سے آئندہ صفحات میں تحریر کریں گے۔	نازل فرمایا۔
۲۳	غزوۂ خیبر ۷ محرم ۷ھ مطابق مئی ۶۲۸ء	صلح حدیبیہ کے کچھ ہی دن بعد آنحضرتؐ کو خبر ملی کہ یہودی بنو غطفان سے گٹھ جوڑ کرکے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کی تیاری کررہے ہیں۔ آپ نے واقعہ کی تصدیق کے بعد جہاد کا اعلان فرمایا۔	آنحضرتؐ محرم کی آخری تاریخوں میں چودہ سو افراد کی جماعت کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور چھیانوے میل کا سفر (آٹھ منزلیں) طے کرکے رات کے وقت خیبر کے قریب پہنچے اور ایک میدان میں قیام فرمایا اور صبح ہوتے ہی حملہ کردیا۔ خیبر میں بہت سے قلعے تھے۔ اسلامی لشکر نے ایک ایک کرکے ان سب کو فتح کرلیا۔ ان میں سب سے مضبوط قلعہ قموص تھا جس میں سردار قوم کنانہ ابن ابی الحقیق کا خاندان رہتا تھا۔ یہودیوں کا بہادر ترین شخص مرحب اس قلعے کا محافظ تھا۔ حضرت علیؓ نے مقابلہ کرکے اس کا کام تمام کیا جس سے یہودیوں کی قوت ختم ہوگئی اور یہ قلعہ بھی فتح ہوگیا۔ اس معرکہ میں ترانوے یہودی مارے گئے اور سترہ مسلمان شہید ہوئے۔ خیبر کی فتح کے بعد اہل فدک نے بغیر لڑے اطاعت قبول کرلی جبکہ وادی القریٰ کے یہودیوں نے معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دئیے۔ اس مہم میں کل ڈیڑھ ماہ کا عرصہ لگا۔	فتح خیبر سے یہودیوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان سے جو خطرہ لاحق تھا وہ ختم ہوگیا۔ اس معرکہ میں مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت اور زرخیز زرعی زمین و باغات بھی قبضے میں آئے۔ حی ابن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی گرفتار ہوگئیں۔ آنحضرتؐ نے انہیں آزاد کرکے شرف زوجیت بخشا۔
۲۴	غزوۂ عام الفتح ۱۰ رمضان ۸ھ مطابق	صلح حدیبیہ کے موقع پر بنو خزاعہ مسلمانوں کے اور بنو بکر مشرکین	آنحضرتؐ نے قریش مکہ کو تین شرائط پیش کیں۔ ۱) خون بہا ادا کیا جائے۔ ۲) بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہوجائیں۔ ۳) صلح حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان	فتح مکہ اسلام کی عظیم ترین فتح تھی۔ بیت اللہ کو رسول اللہ نے

نمبر شمار	نام غزوہ مع تاریخ وقوعہ	اسباب	اقدام	نتائج
	۱۱ جنوری ۶۳۰ء	کے حامی ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد بنو بکر اور قریش نے مل کر بنو خزاعہ کے بہت سے افراد کو سوتے میں قتل کردیا۔ لہٰذا عمرو بن سالم خزاعی نے دربار رسالت میں فریاد کی۔	کریں۔ قریش نے تیسری شرط قبول کرلی۔ تب آنحضرتؐ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مرالظہران پہنچ کر اسلامی لشکر وسیع علاقہ میں پھیل گیا اور آگ روشن کرلی۔ اسی شب ابو سفیان اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو عباس بن عبدالمطلب نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے ابوسفیان کو اپنی پناہ میں لے کر آنحضرتؐ کے روبرو پیش کیا اور آنحضرتؐ سے ابوسفیان کی سفارش کی۔ رحمت للعالمین نے اپنے بدترین دشمن کو معاف فرمایا۔ جب اسلامی لشکر مکہ میں داخل ہوا تو کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی صرف ایک مقام پر جدال و قتال کا معمولی سا واقعہ پیش آیا جس میں قریش کے اٹھائیس آدمی مارے گئے اور تین مسلمان شہید ہوئے۔ ۲۰ رمضان ۸ھ کو آنحضرتؐ مکہ میں داخل ہوئے۔ چند روز وہاں قیام فرمایا پھر غزوۂ حنین کے لئے تشریف لے گئے۔	بتوں سے پاک کیا۔ کفار قریش جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی دشمنی پر کمربستہ رہتے تھے۔ وہ اب دست بستہ حضور کے روبرو قائل تھے۔ اللہ کے رسول نے اپنے ان بدترین دشمنوں کی عام معافی کا اعلان فرمایا جس کے بعد وہ بیعت کرکے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور طلقاء کہلائے۔
۲۵	غزوۂ حنین ۶ شوال ۸ھ مطابق ۲۷ جنوری ۶۳۰ء	فتح کے بعد قبائل عرب جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے لیکن قبائل ہوازن اور ثقیف نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔	ماسوائے بنی کعب اور بنی کلاب کے قبائل ہوازن و ثقیف کی تمام شاخیں اسلام کے خلاف معرکہ آرائی میں شریک ہوگئیں اور بنی ہوازن کا سردار مالک بن عوف متحدہ لشکر کا سپہ سالار ہوا۔ اطلاع ملنے پر آنحضرتؐ نے تحقیق کرانے کے بعد مقابلہ کی تیاری شروع کردی۔ بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ آنحضرتؐ مکہ سے حنین کے لئے روانہ ہوئے اور دس شوال کو وہاں پہنچے۔ دوسری صبح اسلامی لشکر صف بندی کرکے آگے بڑھا تو یکایک کھائیوں اور تنگ راستوں سے دشمن نے اچانک اتنا شدید حملہ کیا کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ آنحضرتؐ اور چند جانثاروں کے علاوہ تمام مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے۔ آنحضرتؐ اور عباس بن عبدالمطلب کے بلانے پر کچھ مسلمان واپس لوٹے اور جم کر لڑے۔ دشمن بھاگ	اس جنگ میں مسلمانوں نے اپنی کثرت پر ناز کیا جس کے نتیجہ میں ابتداً مسلمانوں کو شکست کی سی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن بعد میں اللہ نے ان کو فتح دی۔ اور بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کو عطا کیا۔

نمبر شمار	نام غزوہ مع تاریخ وقوعہ	اسباب	اقدام	نتائج
			کھڑا ہوا لیکن بنو مالک مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ جب مالک قتل ہوا تو وہ بھی فرار ہوگئے اور اوطاس کے مقام پر پہنچے۔ اسلامی لشکر نے تعاقب کیا اور وہاں مقابلہ ہوا۔ دشمن کے بہت سے آدمی مارے گئے۔	
۲۶	غزوۂ طائف ۱۳ شوال ۸ھ مطابق ۳ فروری ۶۳۰ء	بنی ہوازن و ثقیف کا سالار مالک بن عوف میدان حنین سے فرار ہوکر اپنے لشکر کے ہمراہ طائف پہنچا اور قلعہ بند ہوگیا۔ اسلامی لشکر نے اس کا تعاقب کیا۔	طائف مکہ سے جنوب مشرق میں تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلندی پر ہونے کے باعث نہایت سرسبز و شاداب، صحت افزا و پر فضا مقام ہے۔ آنحضرتؐ وادی حنین سے طائف پہنچے اور شہر کا محاصرہ کرلیا جو اٹھارہ دن جاری رہا۔ اسلامی لشکر منجنیقوں سے سنگباری کرتا رہا جبکہ دشمن اپنے قلعوں سے تیروں کی بارش کرتا رہا۔ جب محاصرہ نے طول پکڑا اور کوئی نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آیا تو آنحضرتؐ نے محاصرہ اٹھانے کا اعلان فرمایا۔ اس کے بعد آپ مکہ ہوتے ہوئے تقریباً ڈھائی ماہ بعد ۲۵ یا ۲۶ ذیقعدہ ۸ھ کو مدینہ پہنچے۔	گو کہ طائف کی جنگ تکمیل کو نہیں پہنچی لیکن اس کے باعث دوسرے ہی سال طائف کا وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا اور ثقیف کا پورا قبیلہ مشرف بہ اسلام ہوا۔
۲۷	غزوۂ تبوک آخر رجب ۹ھ مطابق آخر اکتوبر ۶۳۰ء	مختلف ذرائع سے آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ قیصر روم کے اشارہ پر بنو غسان و دیگر عیسائی قبائل مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے فوج جمع کررہے ہیں۔	تصدیق ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے اعلان جہاد فرمایا۔ اور تیس ہزار کے لشکر کے ہمراہ آپ تبوک کیلئے روانہ ہوئے۔ تبوک شمال کی جانب مدینہ سے تقریباً ۳۶۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ چودہ دنوں کا طویل اور دشوار ترین سفر طے کرکے آپ تبوک پہنچے۔ بیس دن وہاں قیام فرمایا مگر رومی فوج مقابلہ پر نہیں آئی۔ تب آپ نے مدینہ کی جانب مراجعت فرمائی۔	غزوہ کے دوران دومۃ الجندل وغیرہ کے حکمرانوں اور باشندوں نے آپ کی سیادت کو تسلیم کیا اسلامی سلطنت کا اثر جزیرہ عرب کے شمالی سرحد تک وسیع ہوگیا۔

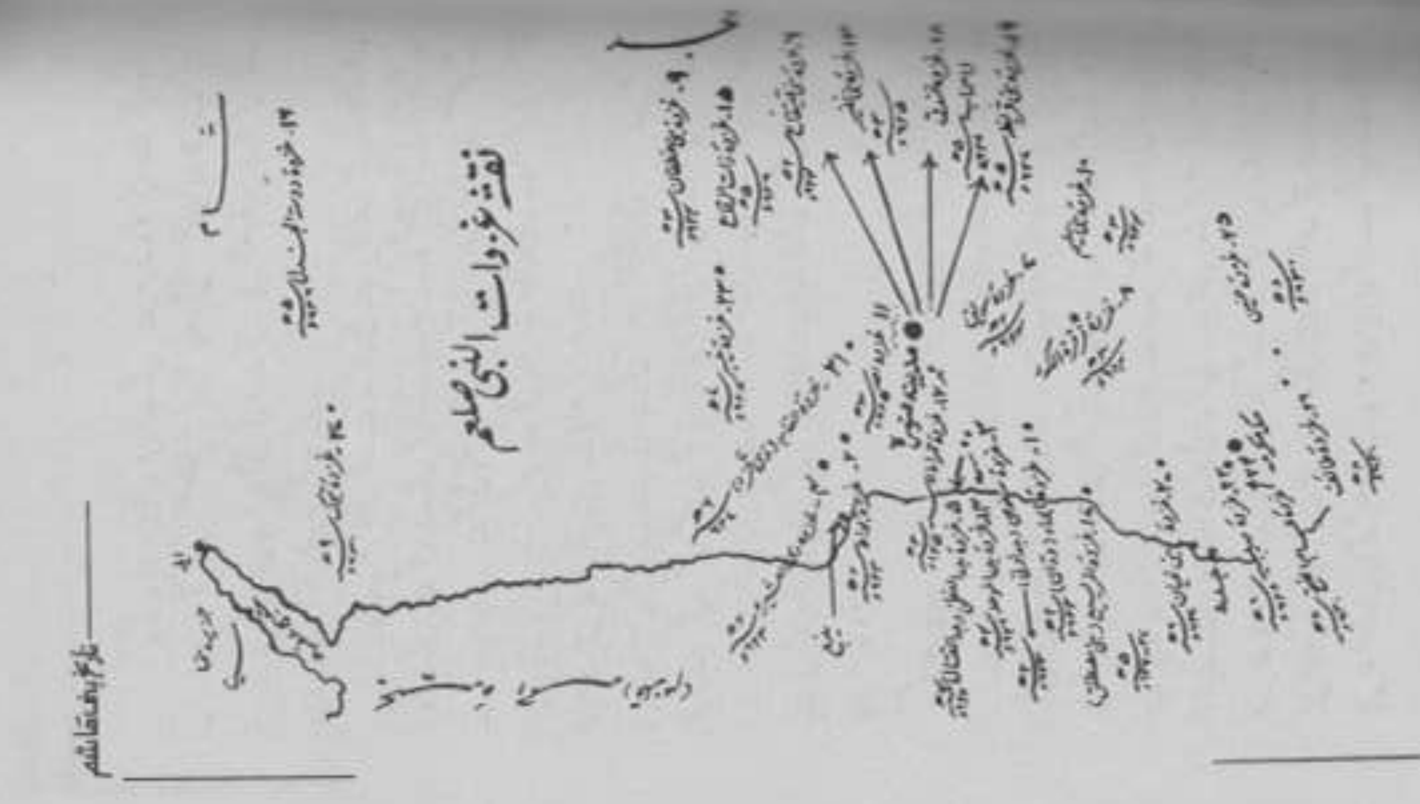

مذکورہ بالا ستائیس غزوات میں سے صرف نو غزوات یعنی بدر، احد، خندق، قریظہ، مصطلق، خیبر، عام الفتح، حنین اور طائف ایسے غزوات ہیں جن میں جدال و قتال کی نوبت آئی۔ بقیہ تمام غزوات بلا کسی جنگ وجدال کے پُرامن طور پر ختم ہو گئے۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان غزوات میں سے کسی ایک میں بھی اللہ کے رسولؐ نے شمشیر زنی کی ہو اور آپؐ کے دستِ مبارک سے کوئی کافر یا مشرک مارا گیا ہو بلکہ رسول اللہ صلعم کے اس فریضہ کو نفسِ رسول حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ادا فرمایا۔ ان غزوات میں کفار و مشرکین کے بیشتر سردار و نامور افراد حضرت علیؑ کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان مقتولین کی اولادیں حضرت علیؑ سے دشمنی رکھتی تھیں۔ گو کہ وہ اسلام قبول کر چکے تھے لیکن پھر بھی ان کے دلوں میں عہدِ جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کافر مقتولین کا بدلہ لینے کی آرزو تڑپتی رہتی تھی جس کا اعلان و اظہار خاص خاص موقعوں پر ظاہر ہو جاتا تھا۔

صلح حدیبیہ : مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں پر بیت اللہ کے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔ درآنحالیکہ عہدِ جاہلیت میں بھی کعبۃ اللہ کی زیارت سے کوئی دشمن بھی محروم نہیں کیا جاتا تھا۔ رسالتمآبؐ کو مکہ چھوڑے چھ سال ہو گئے تھے مگر اس پوری مدت میں مشرکین نے کسی ایک مسلمان کو بھی حج یا عمرہ تک کیلئے حدودِ حرم میں داخل نہ ہونے دیا۔ اللہ کے رسولؐ کو ایک روز خواب کے ذریعہ بشارت ہوئی کہ آپؐ اپنے صحابہ کے ہمراہ بال منڈوائے کعبۃ اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ لہٰذا آپؐ نے گرد و نواح کے تمام مسلمانوں میں اعلان کرا دیا کہ آپؐ عمرہ کی ادائیگی کیلئے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے ہیں جو مسلمان ساتھ چلنا چاہے وہ سفر کی تیاری کرے۔ آپؐ نے یہ بھی حکم

دیا کہ کوئی شخص کسی بھی قسم کا ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھے ماسوائے پرتل (نیام) میں رکھی ہوئی ایک تلوار کے جس کی عربوں کے دستور کے تحت اجازت تھی۔

الغرض تیاریاں شروع ہو گئیں اور یکم ذیقعدہ ۶ ہجری مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۸ء کو تقریباً چودہ سو مسلمانوں کا یہ مبارک قافلہ اللہ کے رسولؐ کی معیت میں اللہ کے گھر کا طواف کرنے کیلئے مدینہ سے روانہ ہوا۔ تقریباً چھ میل کی مسافت طے کر کے مقام ذوالحلیفہ میں جسے اب بئر علی کہتے ہیں قیام پذیر ہوا۔ سب نے عمرہ کا احرام باندھا۔ قربانی کیلئے جو ستر اونٹ ساتھ لائے تھے ان کی گردنوں میں قربانی کی نشانی کے طور پر قلاوے ڈالے جو ہدی کے اونٹ ہونے کی خاص علامت ہوتی تھی۔ رسالتمآبؐ کی ان احتیاطی تدابیر نے مشرکینِ مکہ کو پریشانی میں ڈال دیا۔ تمام تر صلح جویانہ اقدام کے باوجود قریشِ مکہ کو آپؐ کی آمد سخت ناگوار تھی لہٰذا وہ اس پُرامن قافلہ کو روکنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

رسالتمآبؐ نے قریش کے ارادوں کا پتہ لگانے کے لئے بنی کعب کے ایک شخص کو آگے بھیجا ہوا تھا اس نے مقام عسفان میں آکر آپؐ کو اطلاع دی کہ قریش پوری تیاری کے ساتھ مکہ سے باہر ذی طویٰ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں اور مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لئے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ کُراع الغمیم[۱] بھیج دیا ہے اور خاص لشکر قریش کی چھاؤنی مقام بلاح میں جمع ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر آنحضرتؐ نے راستہ تبدیل کیا اور حدیبیہ[۲] کے مقام پر پہنچ کر قیام فرمایا۔ اسی مقام پر بنی خزاعہ کا سردار بُدیل بن ورقاء اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آیا آنحضرتؐ سے آمد کی غرض

۱؎ مقام عسفان سے مکہ کی جانب آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ۲؎ مکہ سے شمال مغرب کی طرف تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ایک کنویں کے نام پر یہاں کی آبادی بھی حدیبیہ کہلاتی تھی۔ آج کل اس مقام کو شمیسیہ کہتے ہیں یہ مکہ کو جدہ سے ملانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔

دریافت کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "ہمارا مقصد بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف ہے"۔ ان لوگوں نے واپس جاکر قریش کو آپؐ کے ارادہ سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ وہ ان زائرینِ حرم کا راستہ نہ روکیں مگر قریش اپنی ضد پر اڑے رہے۔

اس کے بعد قریش کی طرف سے عروہ بن مسعود ثقفی آیا اس نے بھی کوشش کی کہ آنحضرتؐ اپنا ارادہ ترک کر دیں اور واپس لوٹ جائیں لیکن آپؐ کا جواب سن کر اور حالات کا مشاہدہ کر کے جب وہ واپس پہنچا تو اس نے قریش سے کہا کہ میں " قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں مگر خدا کی قسم میں نے اصحابِ محمد کو جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فدائی دیکھا ہے ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے یہاں بھی نہیں دیکھا"[۱] اس کے بعد قریش نے حابش کے سردار حلیس بن علقمہ کو جو ان کا حلیف تھا آنحضرتؐ کے پاس بھیجا مگر جب اس نے دیکھا کہ سارا قافلہ احرام باندھے ہوئے ہے تو وہ آنحضرتؐ سے کوئی بات کئے بغیر واپس مکہ لوٹ گیا اور قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہا کہ اگر انہوں نے زائرین کو روکا تو وہ ان کا ہرگز ساتھ نہ دے گا اور نہ ان کی حمایت کرے گا۔[۲] اس دوران قریشِ مکہ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو مشتعل کریں کہ وہ مشتعل ہو کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں جو ان کیلئے لڑائی کا بہانہ بن سکے مگر اللہ کے رسولؐ نے ان کی ہر تدبیر ہر چال کو اپنے حسنِ تدبر سے ناکام بنا دیا۔

قریش کی بھیجی ہوئی اب تک کی تمام سفارتیں ناکام ہو گئیں کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا لہٰذا رسالتمآبؐ نے خراش بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا۔ خراش کے پہنچتے ہی کفارِ قریش ان پر ٹوٹ پڑے ان کے اونٹ کو کاٹ دیا اور قریب تھا کہ خراش کو بھی مار ڈالیں لیکن قومِ حبش کے لوگوں نے درمیان

۱؎ تفہیم القرآن ص: ۳۷ ج: ۵ ۲؎ اسوۃ الرسول ص: ۱۰ ج: ۳

میں پڑ کر ان کی جان بچائی اور وہ بھاگ کر آنحضرتؐ کے پاس واپس آئے۔ قریش کی ان ظالمانہ حرکتوں کا مقصد مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا اور انہیں واپس جانے پر مجبور کرنا تھا۔ آنحضرتؐ نے ایک بار پھر کوشش کی اور چاہا کہ حضرت عمر بن خطابؓ کو قریش کے پاس پیامِ صلح کی غرض سے بھیجیں۔ مگر انہوں نے معذرت چاہی ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ :

"پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو بلایا کہ انہیں مکہ روانہ کریں اور وہ اشراف قریش کو رسول اللہ صلعم کا پیغام پہنچا دیں کہ ان کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا : یارسول اللہؐ! مجھے اپنے متعلق قریش سے ڈر ہے، مکہ میں بنی عدی ابن کعب کا کوئی آدمی بھی نہیں جو میری حمایت کر سکے، قریش سے مجھے عداوت ہے اور ان کے معاملے میں میری جو سختی ہے اسے وہ خوب جانتے ہیں۔ لیکن میں آپؐ کو ایسے آدمی کا نام کیوں نہ تجویز کر دوں جو مجھ سے زیادہ باعزت ہیں یعنی عثمان بن عفان"۔ (سیرۃ ابنِ ہشام ص: ۳۶۷ ج: ۳)

لہٰذا آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ کو بلا کر اس مہم پر جانے کو کہا۔ وہ اپنے خاندان کے فرد ابان بن سعید بن عاص کی امان میں مکہ پہنچے اور آنحضرتؐ کا پیغام پہنچایا۔ مکہ میں حضرت عثمان کا خاندان کثیر اور طاقتور تھا۔ انہوں نے اپنے اس عزیز کو جو کافی عرصہ بعد مکہ گیا تھا مہمانداری کیلئے روک لیا۔ ادھر مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے مسلمانوں سے ایک درخت کے نیچے بیعت لی۔ جو بیعتِ رضوان کہلائی۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ :

"لوگوں کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے موت پر بیعت لی تھی مگر جابر بن عبداللہ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہم سے بیعت نہیں لی تھی مگر ہم سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ ہم کسی حالت میں

بھاگیں گے نہیں۔" (سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۷۹ ج: ۲)

بہر حال یہ خبر جھوٹی ثابت ہوئی۔ آخر کار قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو جو بڑا فصیح و بلیغ تھا اور بقول زرقانی خطیب عرب کہلاتا تھا کی قیادت میں ایک وفد صلح کی بات کرنے کی غرض سے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سہیل نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا جو خاصی طوالت کا باعث بنا اور کافی رد و کد کے بعد فریقین نے شرائط صلح تسلیم کر لیں جب معاملہ بالکل طے ہو گیا صرف تحریر باقی تھی تو حضرت عمرؓ بن خطاب سخت برہم ہوئے۔ وہ اس صلح کے سخت مخالف تھے۔ آنحضرتؐ سے ان کے مکالمہ کی تفصیل کتب تاریخ و سیرۃ میں درج ہے۔

ابن ہشام اور طبری لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی اس تقریر کے بعد آنحضرت صلعم نے حضرت علی مرتضیٰؑ کو بلا کر صلحنامہ لکھوایا۔ جس کی بابت ابن اثیر کا بیان ہے کہ

"رسول مقبول صلعم نے حضرت علیؑ کو بلا کر ارشاد کیا کہ لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم سہیل نے کہا کہ یہ ہم نہیں جانتے۔ لکھو باسمک اللھم چنانچہ یہی لکھا گیا۔ پھر جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ سے کہا کہ لکھو یہ صلح نامہ وہ ہے جس کی بناء پر محمد رسول اللہؐ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی۔ سہیل نے کہا کہ اگر ہم تمہیں رسول اللہؐ جانتے تو قتال پر آمادہ کیوں ہوتے لہذا چاہئے رسول اللہؐ اپنا اور اپنے والد کا نام لکھوا دو۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اچھا رسول اللہؐ کے لفظ کو نکال دو انہوں نے عرض کی کہ میری مجال نہیں کہ میں رسول اللہؐ کے لفظ کو محو کر سکوں۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے وہ کاغذ لے لیا اور لفظ رسول اللہؐ کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ کر حضرت علیؑ سے فرمایا کہ ایک دن تمہیں بھی ایسا ہی معاملہ پیش آئیگا"۔
(ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۱۹۰ ج: ۳)

اس معاہدہ کی شرائط کو کفار قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے جبکہ مسلمان اس پر مضطرب تھے۔ "حضرت عمرؓ جیسے بالغ النظر مدبر تک کا یہ حال تھا کہ وہ کہتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد کبھی میرے دل میں شک نے راہ پائی تھی مگر اس موقع پر میں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔"[1] مسلمانوں میں سے کوئی بھی ان مصلحتوں سے آگاہ نہ تھا جنہیں اللہ کے رسولؐ بہتر طور پر جانتے تھے۔ صلحنامہ کی تکمیل کے بعد مسلمانوں نے وہیں پر قربانیاں کیں، سر منڈوائے اور سر کے بال کتروائے اور احرام ختم کئے۔ مگر دل شکستگی کا اتنا غلبہ تھا کہ آنحضرتؐ کے تین مرتبہ حکم دینے کے باوجود انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ رسالتمآبؐ کو اس پر سخت صدمہ ہوا۔ آپؐ نے صلح ہونے کے بعد تین روز تک حدیبیہ میں قیام فرمایا۔

جب یہ قافلہ صلح حدیبیہ کو اپنی شکست اور ذلت سمجھتا ہوا مدینہ کی طرف واپس آ رہا تھا تو راستے میں سورہ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ صلح جس کو وہ شکست سمجھ رہے ہیں حقیقتاً فتح عظیم ہے اس کے فوائد کچھ ہی عرصہ میں ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔ اور فی الواقع یہ صلح ایک عظیم الشان فتح ثابت ہوئی۔

صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے متعدد فوائد کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف مشرکین مکہ کی مخالفانہ اور سازشی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور آنحضرتؐ کو ان کی جانب سے جو جنگ کا خطرہ رہتا تھا اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا جس کے باعث آپؐ نے نہ صرف قبائل عرب کے رؤسا کو اسلام کی دعوت دی بلکہ دیگر ممالک کے سلاطین کو بھی اپنے سفیروں کے ذریعہ پیغامات ارسال کئے اس طرح اشاعت اسلام کا سلسلہ عرب کی حدود سے نکل کر دنیا میں پھیل گیا۔

[1] تفہیم القرآن ص: ۳۹ ج: ۵

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ ایک جنگ کو روکنے کیلئے صلح کا معاہدہ کیا جاتا ہے جس سے وہ جنگ تو موقوف ہو جاتی ہے لیکن جلد یا بدیر کوئی ایک فریق شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کے نتیجہ میں دوسری جنگ ناگریز ہوتی ہے اس طرح ہر صلح دو جنگوں کا درمیانی وقفہ قرار پاتی ہے۔ اسی قاعدہ کے مطابق اس جنگ کو روکنے کے لئے جو قریش مکہ "زائرین مدینہ" سے لڑنے پر آمادہ تھے، حدیبیہ کے مقام پر صلح کا معاہدہ کیا گیا۔ لیکن معاہدہ کے ایک فریق یعنی مشرکین مکہ نے اپنی کج فطرتی اور شرارت نفسی سے مجبور ہو کر جلد ہی معاہدہ کی شقوں کی خلاف ورزی کرنا شروع کر دیں۔ جن کے نتیجہ میں غزوہ عام الفتح یا فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا اور رسالتمآب کو ماہ رمضان میں لشکر اسلام کے ساتھ مکہ کی طرف جانا پڑا۔

معاہدہ کی خلاف ورزی: صلح حدیبیہ کی شرائط میں ایک شرط یہ تھی کہ قبائل عرب کو آزادی ہو گی کہ وہ جس فریق سے چاہیں معاہدہ کریں۔ بنو خزاعہ بن کعب نے آنحضرتؐ سے معاہدہ کر کے اسلام کی سرپرستی حاصل کی۔ اور بنو بکر نے قریش کی حمایت حاصل کرنے کیلئے ان سے معاہدہ کیا اور قتل و قصاص کی قدیم روایت پھر سے شروع کر دی۔ بنو بکر نے قریش کی مدد سے بنو خزاعہ پر شب خوں مارا۔ بنو خزاعہ بے یار و مددگار تھے جبکہ بنو بکر کی حمایت میں تقریباً تمام عمائدین قریش نے بھیس بدل کر اس شب خون میں شرکت کی۔ الغرض بنو بکر نے ایک ہی حملے میں بنو خزاعہ کے بیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بنو خزاعہ حملہ کی تاب نہ لا کر حرم محترم میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ بقول طبری:

"جب خزاعہ حرم میں آپہنچے تو بنو بکر نے اپنے سردار نوفل سے کہا کہ اب ہم حرم میں ہیں اسلئے تم اپنے خدا سے ڈرو اور لڑائی سے باز ہو مگر اس نے اس پر کچھ اعتنا نہیں کیا بلکہ یہ گستاخانہ جملہ کہا کہ آج میرا کوئی خدا

نہیں میں کسی کو نہیں جانتا۔ اے بنی بکر اپنا بدلہ لے لو میں جانتا ہوں کہ تم ضرور اسی حرم میں چوری کرتے ہو اور کرو گے تو پھر کیوں حرم میں اپنا بدلہ نہیں لیتے" (تاریخ طبری ص: ۳۸۷ ج: ۱)

آخر کار بدیل بن ورقاء خزاعی نے کسی نہ کسی طرح ان کی جان بچائی۔ جس کے بعد عمرو بن سالم خزاعی اس ظلم کی فریاد لیکر رسالتمآبؐ کی خدمت میں پہنچا۔ بعد میں بدیل بھی تقریباً چالیس آدمیوں کے ہمراہ خدمت رسولؐ میں پہنچ گیا۔ ابن ہشام کے مطابق آنحضرتؐ اس وقت اپنے تمام اصحاب کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ سالم نے آپؐ کے روبرو پہنچ کر چند اشعار کہے جو مع ترجمہ سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۹۴ ج: ۲ پر درج ہیں۔ سالم نے اپنا قدیم قرابت کا واسطہ دے کر رسالتمآبؐ سے مدد کی درخواست کی۔ محدث شیرازی نے تحریر کیا ہے کہ

"آپ نے یہ سن کر فرمایا! اے عمرو (بن سالم) بس کرو۔ یہ کہہ کر آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے اس حالت میں ردائے مبارک زمین پر گھسٹتی جاتی تھی اور فرماتے جاتے تھے کہ اگر میں بنو خزاعہ بن کعب کی مدد نہ کروں تو (خدا کی طرف سے) میری مدد نہ کی جائے۔ یہ کہہ کر آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگ حفاظت الٰہی اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔"

(روضۃ الاحباب ص: ۴۱۷ ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۱۳۵ ج: ۳)

گو کہ واقعات و حالات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپؐ بلا تاخیر قریش مکہ پر فوج کشی فرمائیں لیکن رحمت عالم نے صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا۔

ابو سفیان کی ناکام سفارت: آنحضرتؐ نے قریش مکہ کو تین شرائط پیش کیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو قبول کریں۔ قریش مقتولین کا خوں بہا ادا کریں یا بنی بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں یا پھر معاہدہ حدیبیہ کے ٹوٹنے کا اعلان کریں۔ گو کہ قریش میں جنگ کی قوت تو ختم ہو چکی تھی

لیکن جہالت کی شان باقی تھی۔ اسی غرور و نخوت کے باعث انہوں نے تیسری شرط منظور کرلی لیکن جلد ہی انھیں اپنی حماقت کا احساس ہو گیا لہٰذا سب سر جوڑ کر بیٹھے' مشاورت ہوئی آخر کار فیصلہ ہوا کہ کسی کو آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیج کر معاہدہ کی تجدید کی جائے۔ کس کو بھیجا جائے کوئی تیار نہیں کیونکہ بنی بکر کی حمایت اور بنی خزاعہ کے قتل میں سب ہی شریک تھے۔ اتفاقاً اس معرکہ میں ابو سفیان موجود نہ تھا لہٰذا یہ کام اس کے سپرد کیا گیا۔ ابو سفیان کا مدینہ آنا' اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کے ہاں جانا' دربار رسالت میں حاضر ہونا' اصحاب رسول سے مدد طلب کرنا' یکطرفہ اعلان تجدید کر کے واپس ہونا اور قریش مکہ کا اس کے عمل سے ناامید ہونا وغیرہ جملہ واقعات تمام مستند سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں نے تحریر کئے ہیں۔ البتہ جس نے جتنا مناسب جانا اتنا لکھا ہے۔ زرقانی کا بیان جس کا اردو ترجمہ جناب فوق بلگرامی نے تحریر کیا ملاحظہ ہو۔

"ابو سفیان مدینہ پہنچے تو پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ کے ہاں گئے اور چاہا کہ بستر رسول ﷺ پر بیٹھیں تو ام حبیبہ نے جھپٹ کر اس بستر کو الٹ دیا۔ ابو سفیان بولے۔ بیٹی کیا تو نے میری وجہ سے بستر کو الٹ دیا۔ ام حبیبہ نے کہا۔ ہاں! اس لئے کہ تم مشرک ہو اور مشرک نجس ہوتے ہیں۔ اور مجھے یہ ہرگز گوارہ نہیں کہ تم فرش رسول اللہ ﷺ پر بیٹھو۔ ابو سفیان بولے کہ تم مجھ سے جدا ہو کر شر میں مبتلا ہو گئیں۔ ام حبیبہ نے کہا نہیں، بلکہ خدائے سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے اسلام کی طرف ہدایت فرمائی۔ اے باپ تعجب ہے کہ تم سرداران قریش اور اکابرین قریش میں شمار ہوتے ہو اور اب تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے اور پتھروں کی پوجا کرتے ہو جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔ یہ سن کر ابو سفیان وہاں سے اٹھ آئے"۔

(ترجمہ: اسوۃ الرسول ص: ۱۳۶ ج: ۳)

ابو سفیان پھر حضرت علی مرتضیٰ کی خدمت میں آیا۔ اس وقت جناب سیدہ پاس بیٹھی تھیں اور جناب امام حسن علیہ السلام بچے تھے وہ آپ کی گود میں تھے۔ وہ عرض کرنے لگا کہ آپ ہماری قوم میں باعتبار صلہ رحم کے مجھ سے قریب ہیں۔ میں اس وقت ایک حاجت لیکر آیا ہوں اور اس حاجت کو ناکام ہو کر آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ آنحضرتؐ سے میری سفارش فرما دیجئے، آپ نے کہا وائے ہو تجھ پر اے ابو سفیان۔ خدا کی قسم جب آنحضرتؐ کسی امر کا ارادہ فرما لیتے ہیں تو پھر کسی کو اس میں کلمہ و کلام کی گنجائش نہیں رہتی تب ابو سفیان نے کہا۔

"اے ابوالحسنؑ میں دیکھتا ہوں کہ میرے معاملات دشوار تر ہو گئے آپ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم میں کوئی ایسی شے نہیں جانتا جس سے تیرا اطمینان ہو جائے مگر تو قریش کا سردار ہے اپنی طرف سے لوگوں میں اعلان صلح کر کے چلا جا ابو سفیان بولا۔ کیا اس سے مجھے اطمینان کر لینا چاہئے۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے تو اس سے یقین نہیں ہے کہ تجھے اس سے اطمینان کر لینا چاہئے۔ مگر تو کر ہی کیا سکتا ہے۔ تیرے لئے تو سوائے اس کے دوسرا چارہ نہیں ہے"۔

(زرقانی ص: ۳۳۷ ج: ۲ ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۱۳۶ ج: ۳)

(زرقانی کے علاوہ سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۱۱ ج: ۲ طبع مصر ص: ۳۹۶ ج: ۲' طبع لاہور' تاریخ طبری ص: ۱۶۳۳' طبع جرمن ص: ۳۹۰ ج: ۱' طبع کراچی)

انہی واقعات کو مولانا شبلی نعمانی صاحب نے مخصوص نقطہ نظر کے تحت اپنے مفید مطلب انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"ابو سفیان نے مدینہ آکر آنحضرتؐ کی خدمت میں درخواست کی' بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا' ابو سفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا' ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب

فاطمہ زہراؑ کے پاس آیا' حضرت حسنؑ پانچ برس کے بچے تھے' ابو سفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا' تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائیگا۔ "جناب سیدہؑ نے فرمایا بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل' بالآخر ابو سفیان نے حضرت علیؑ کے ایماء سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ " میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی"۔ (سیرۃ النبیؐ ص: ۵۱۰ ج: ۱)

مولانا شبلی صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس میں دو امور خصوصی توجہ کے حامل ہیں اول تو یہ کہ حضرت ام حبیبہؓ کے مشہور و معروف واقعہ کو یکسر قلمزد کر دیا حالانکہ ام المومنین ام حبیبہؓ کا واقعہ جو کتب تواریخ میں مرقوم ہے اور جو ان کی دین سے وابستگی' تقویٰ و پرہیزگاری اور احترام رسولؐ کی بہترین مثال ہے اسے مولانا صاحب نے کیوں نظر انداز کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مولانا صاحب کو کفار قریش کے سپہ سالار اعظم اور مشرکین مکہ کے سردار قوم کی تذلیل کا کوئی پہلو نظر آیا ہو یا پھر یہ واقعہ اموی حکمرانوں کے مورث اعلیٰ کی شان و مراتب کی نفی کرتا ہو۔

دوئم یہ کہ مذکورہ اقتباس کے آخر میں یہ مبہم و بے ربط جملہ تحریر ہے کہ " بالآخر ابو سفیان نے حضرت علیؑ کے ایماء سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی"۔ مولانا صاحب کے اس جملہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے منشائے رسولؐ کے خلاف ابو سفیان کو اس امر کی ترغیب و جرات دلائی۔ حالانکہ واقعیت اور حقیقت حال دونوں اس کے خلاف ہیں۔ ابن ہشام' طبری' زرقانی' محدث شیرازی و دیگر مورخین کے تفصیلی بیانات سے واضح ہے کہ حضرت علیؑ نے ابتداء ہی میں اس کی سفارش و معاونت سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس کی شدید منت و سماجت پر آپ نے اسے یہ صورت بتائی مگر

ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ "خدا کی قسم مجھے تو اس سے یقین نہیں ہے کہ تجھے اس سے اطمینان کر لینا چاہئے۔ مگر تو کر ہی کیا سکتا ہے تیرے لئے تو سوائے اس کے دوسرا چارہ ہی نہیں ہے۔" لہٰذا یہ کسی طرح بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ ابو سفیان کے اعلان کرنے میں حضرت علیؑ کی رضا و ایما کا کوئی دخل تھا۔

بہر حال جب ابو سفیان مکہ واپس پہنچا تو قریش کے دریافت کرنے پر اس نے تمام حالات بیان کئے۔ لوگوں نے پوچھا "پھر محمد نے اس کی تصدیق کی یا نہیں؟" جواب نفی میں ملا تو لوگوں نے کہا " تیرا برا ہو' خدا کی قسم! یہ شخص تو تم سے کھیل کھیل گیا۔ جو تم کہہ کر آئے ہو اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا"۔ ابو سفیان نے کہا" خدا کی قسم! اس کے سوا کوئی چیز سمجھ میں نہیں آئی۔"[1] خود مولانا شبلی صاحب نے تحریر کیا کہ جب" ابو سفیان نے مکہ میں جا کر یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ تو نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں' نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔"[2] اس طرح ابو سفیان کی ناکام و بے نتیجہ سفارت اپنے انجام کو پہنچی۔

• • • • • • • • • • • • • • • • • • • •

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۹۷ ج: ۲' [2] سیرۃ النبیؐ ص: ۵۱۱ ج: ۱

فتح مکہ

اللہ رب العزت نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن منشاء الٰہی کے تحت مبعوث بہ رسالت فرمایا تھا ان میں سے ایک کعبۃ اللہ کو جہالت و ضلالت کی ظلمت اور فسق و فجور کی غلاظت سے پاک کرنا تھا۔ نیز مدت دراز کے بعد مصلائے ابراہیمی کو شرک و بت پرستی کے قبیح خانہ سے تکبیر و تہلیل کے تسبیح خانہ میں تبدیل کر دینا آپ کی رسالت کے خاص فرائض میں داخل تھا۔ گو کہ ظہور اسلام کے بعد ہی سے کفار قریش آپؐ کے درپے آزار ہو گئے تھے لیکن رسالتمآبؐ نے تبلیغِ دین، تعلیم اخلاق اور تاسیسِ ملت کے فرائض جس حسن و خوبی اور صلح جوئی سے ادا فرمائے وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ ہجرت کے بعد بھی آٹھ سال تک مشرکین مکہ تین سو اسی میل کی مسافت طے کر کے رسالتمآبؐ پر متواتر جارحانہ حملے کرتے رہے اور انہدامِ اسلام و قتل پیغمبرؐ کی مسلسل کوششیں کرتے رہے۔ لیکن محسنِ انسانیت کے محاسن تدبیر سے وہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہے اور بالآخر مجبور ہو کر صلح کرنے پر آمادہ ہوئے۔ لیکن اپنی سرشت سے مجبور ہو کر جلد ہی انہوں نے شرائط معاہدہ کی خلاف ورزیاں کرنا شروع کر دیں۔ جنہیں آنحضرتؐ نظر انداز کرتے رہے لیکن جب قریش نے بنی بکر کے ساتھ مل کر اسلام کے حلیف قبیلے بنی خزاعہ کے لوگوں کو قتل کیا تو آنحضرتؐ ان کی فریاد سن کر بے چین ہو گئے۔ اور قریش کی یہی بد عہدی فتح مکہ کا باعث بنی۔

رسالتمآبؐ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا نیز ہدایت فرمائی کہ یہ تیاری جلد اور انتہائی رازدارانہ ہو یہاں تک کہ قریش کو اس کی بھنک نہ پہنچ پائے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کا خط : جب تمام تیاریاں اپنے تکمیلی مراحل میں تھیں تو ایک صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے مسلمانوں کی تیاری سے قریش مکہ کو مطلع کرنا چاہا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے ایک خط مزنیہ قبیلہ کی ایک عورت کے ذریعہ مکہ بھیجا۔ اللہ رب العزت نے اپنے حبیبؐ کو بذریعہ وحی اس کاروائی سے آگاہ فرمایا لہٰذا آپؐ نے حضرت علیؑ کو اس عورت سے خط لانے کے لئے روانہ کیا۔ اس واقعہ کی تفصیلی حقیقت ابن ہشام، طبری، مواہب لدنیہ، شرح زرقانی وغیرہ میں مرقوم ہے۔

"عروہ بن زبیر سے منقول ہے کہ جب رسالتمآبؐ مکہ کے قصد سے تیغ لشکر فرمانے لگے تو حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو ایک خط میں آنحضرتؐ کے ارادہ اور جمعیت لشکر کی خبر دی۔ محمد بن جعفر کے قول کے مطابق حاطب نے اپنے اس خط کو قبیلہ مزنیہ کی ایک عورت کو دیا تھا۔ اور دوسرے لوگوں کی روایت کے مطابق سارہ نامی ایک عورت کے سپرد کیا کہ اس خط کو قریش تک پہنچا دے۔ یہ عورت قبیلہ بنی عبد المطلب میں کسی کی لونڈی تھی۔ اس نے وہ خط اپنے سر کے بالوں میں رکھ لیا اور اوپر سے پٹیاں گوندھ لیں اور خط لے کر چل دی۔ آنحضرتؐ کو وحی کے ذریعہ سے حاطب کی اس حرکت کی خبر مل گئی۔ پس آپؐ نے حضرت علی ابن ابطالب اور زبیر بن العوام (بقول زرقانی باسناد صحیح مقداد اور باسناد عسقلانی عمار یاسر) کو بلایا اور حکم فرمایا کہ ایک عورت کو حاطب نے ہمارے حالات کی خبر لکھ کر قریش کے پاس بھیجی۔ تم لوگ اسے تلاش کر کے لاؤ۔ یہ دونوں صاحب چلے اور اسکو مقام خلیقہ ابن ابی احمد[1] میں پہنچ کر گرفتار کر لیا اور اسکے سامان کی

[1] یہ مقام مدینہ سے بارہ میل ہے

ہر چند تلاشی کی مگر کچھ نہ دستیاب ہوا۔ یہ حالت دیکھ کر جناب علی مرتضیٰ نے فرمایا کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ (نعوذ باللہ) جناب رسالتمآبؐ نے غلط ارشاد فرمایا۔ یا ہم لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ ہم تو خط اسی کے پاس سے ضرور نکالیں گے اور اس عورت سے کہا کہ وہ خط دیدے ورنہ تجھے برہنہ کر دیں گے (برہنہ کر کے تلاشی لیں گے)۔ یہ ارشاد سن کر وہ عورت سخت خوفزدہ ہو کر کہنے لگی آپ ہمیں چھوڑ دیں ہم وہ خط نکال دیتے ہیں۔ حضرت علیؑ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی چٹیوں کی گرہوں کو کھولا اور وہ خط عقدہ کشا کے سامنے رکھ دیا۔ حضرت علیؑ پھر اس کو مع خط کے آنحضرتؐ کی خدمت میں لے آئے۔

(اسوۃ الرسول ص: ۱۴۹ ج: ۳)

رسالتمآبؐ کی مدینہ سے روانگی : یکم تا دس رمضان سفر کی تیاری میں گزرے اور اس اثناء میں وہ قبائل مدینہ پہنچ گئے جنہیں آنحضرتؐ نے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس طرح دس ہزار فوج جرار دسویں رمضان ۸ھ مطابق یکم جنوری ۶۳۰ء غالباً دو شنبہ یعنی پیر کو رسالتمآبؐ کی سربراہی میں مدینہ سے جانب مکہ روانہ ہوئی۔ اس سفر میں تمام شریک سفر مسلمان تھے۔ کوئی غیر مسلم حلیف یا شریک معاہد شامل نہ تھا۔

مدینہ سے چل کر آپؐ دوسری منزل تک پہنچے تو ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن امیہ جنکی ماں عاتکہ بنت عبد المطلب تھیں خدمت رسولؐ میں حاضر ہوئے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ابو سفیان بن حارث کا نام مغیرہ تھا اور انکی اولاد میں کسی کا نام سفیان نہ تھا۔ نہیں معلوم پھر انکی کنیت ابو سفیان کیوں مشہور ہوئی۔ بہر حال ابو سفیان (مغیرہ) اور عبد اللہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قریش کے ساتھ مل کر آنحضرتؐ کی مخالفت کی تھی۔ آنحضرتؐ نے انھیں دیکھ کر منہ پھیر لیا تب ام المومنین ام سلمہؓ نے عرض کی "یا رسول اللہؐ ابو سفیان آپ کے

حقیقی چچا کا بیٹا ہے اور عبد اللہ آپ کی حقیقی پھوپھی (عاتکہ) کا لڑکا ہے اتنے قریبی تو رحمت سے محروم نہ ہونے چاہئیں۔" آنحضرتؐ نے انکی سابقہ حرکات کا ذکر فرمایا۔ تب حضرت علیؑ نے ان دونوں کو مشورہ دیا کہ جن الفاظ میں برادران یوسفؑ نے معافی کی درخواست کی تھی تم بھی رسالتمآبؐ سے انہی الفاظ میں معافی کی استدعا کرو۔ آنحضرتؐ کے عفو و رحم سے امید ہے کہ آپ ضرور معاف فرمائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ آیت پڑھی۔ (ترجمہ) "خدا کی قسم شک نہیں کہ تم کو اللہ نے ہم پر برتری دی اور بیشک ہم قصوروار ہیں۔" رسالتمآبؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ "جاؤ آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔ خدا تم کو بخش دے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔" اسی موقع پر ابو سفیان (مغیرہ) بن حارث نے انتہائی جوش و نشاط کے عالم میں چند اشعار پڑھے جو سیرۃ ابن ہشام میں درج ہیں۔

الغرض دس ہزار جانثاروں کا یہ لشکر فتح و نصرت الٰہی کے یقین کامل کیساتھ منازل طے کرتا ہوا مکہ سے ایک منزل سے بھی کم مسافت کے فاصلے پر واقع مقام مرّ الظہران پہنچا تو رسالتمآبؐ نے یہیں قیام و آرام کرنے کیلئے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ لشکر اسلامی نے پڑاؤ ڈالدیا اور وادی کے وسیع و عریض علاقے میں خیمے نصب کئے۔ رات کو خیموں کے سامنے جگہ جگہ الاؤ روشن کئے۔ قریش کو اس لشکر کی خبر پہنچی تو انہوں نے بدیل بن ورقا، حکیم بن حزام اور ابو سفیان بن حرب کو مخبری کیلئے بھیجا۔ ابو سفیان جب وہاں پہنچا تو میدان میں چاروں طرف آگ روشن دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں باتیں کر رہے تھے انکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنا بڑا لشکر کس کا ہے۔ اتفاقاً عباس بن عبد المطلب ادھر پہنچے تو انہوں نے ابو سفیان کی آواز کو پہچان کر اسے پکارا۔ اس نے جواب دیا ان دونوں کی گفتگو کو ابن ہشام نے حضرت عباسؓ کی زبانی تحریر کیا ہے کہ:

" ابوسفیان بولا۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں یہ کیا ہے۔ میں نے کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا لشکر ہے اور قریش کے لئے خدا کی قسم اب صبح ہے۔ ابوسفیان بولا اب میرے بچنے کا کوئی حیلہ ہے۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ میں نے کہا یہ سمجھ لے فتح ہوتے ہی تیری گردن ماری جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ میرے خچر کے پیچھے سوار ہو۔ میں تجھے رسول خداؐ کی خدمت میں لیجاکر امان دلوادوں"۔

بہر حال جناب عباسؓ بن عبدالمطلب نے اسے اپنے پیچھے بٹھایا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے روانہ ہوئے۔ جب یہ لشکر اسلامی کے درمیان سے گزرتے ہوئے حضرت عمرؓ بن خطاب کے الاؤ کے قریب پہنچے تو انہوں نے ابوسفیان کو پہچان لیا اور کہا " یہ تو دشمن خدا ابوسفیان ہے "۔ حضرت عمرؓ دوڑ کر رسول اللہؐ کے پاس جانے لگے۔ عباس نے بھی اپنے خچر کو ایڑ لگادی۔ دونوں بارگاہ رسالت میں پہنچ گئے۔ عمرؓ نے رسول اللہ صلعم سے کہا "یارسول اللہؐ! یہ ابوسفیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی عہد و پیمان کے اس پر قدرت دیدی ہے۔ آپ مجھے اس کی گردن تلوار سے اڑانے دیجئے"۔ اس پر عباسؓ نے کہا "یارسول اللہ! میں نے اس کو پناہ دیدی ہے"۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ میں کافی تکرار ہوئی۔ آخر کار آنحضرتؐ نے عباسؓ سے فرمایا " اچھا جاؤ ہم نے اسے پناہ دی کل صبح لے کر آنا" عباس اسے اپنے ساتھ لے گئے اور صبح کو آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آنحضرتؐ نے ابوسفیان کو اسلام کی دعوت دی مگر اس نے تردد کیا تب عباسؓ نے اس سے کہا کہ "تم کو کیا ہوا ہے بہتر ہے کہ کلمہ حق کا اعلان کردو ورنہ تمہاری گردن ماردی جائے گی"۔ تب جان کے خوف سے ابوسفیان نے کلمہ شہادت ادا کیا۔[1]

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۴۷۸ ج: ۲' تاریخ طبری ص: ۳۹۵ ج: ۱

ابوسفیان کی مکہ واپسی : لشکر اسلامی کا نظارہ کرنے کے بعد حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے کہنے پر ابوسفیان وہاں سے مکہ پہنچا اور اہل مکہ کو اسلامی لشکر کی آمد کی اطلاع دی۔ اس واقعہ کی تفصیل ہم مولانا ادریس کاندھلوی کے الفاظ میں نقل کر رہے ہیں جو انہوں نے البدایۃ والنہایۃ ص: ۲۹۳ ج: ۴ کی عبارت کے ترجمہ میں تحریر کئے ہیں :-

" بعد از ابوسفیان آپ سے رخصت ہوا۔ اور عجلت کر کے مکہ واپس آیا اور باآواز بلند یہ اعلان کیا کہ محمد ﷺ لشکر کیساتھ آرہے ہیں۔ تیری رائے میں کسی کو یہ طاقت نہیں کہ ان کی مقاومت کر سکے۔ اسلام لے آؤ سلامت رہو گے۔ البتہ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کو امن ہے۔ یا جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے اس کو بھی امن ہے۔ یا جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے یا ہتھیار ڈالدے اس کو بھی امن ہے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند نے اس کی مونچھ پکڑلی اور یہ کہا کہ اے بنی کنانہ یہ بڑا فرتوت اور احمق ہو گیا ہے معلوم نہیں کیا کیا بک رہا ہے اور بہت گالیاں دیں لوگ جمع ہو گئے ابوسفیان نے کہا اس وقت ان باتوں سے کچھ نہ ہوگا۔ اے لوگو تم اس عورت کے دھوکہ میں ہرگز نہ آنا۔ کوئی شخص محمد ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کو امن ہے اور جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے اس کو بھی امن ہے لوگوں نے کہا! ارے کم بخت خدا تجھے ہلاک کرے تیرے گھر میں کتنے آدمی آسکیں گے۔ ابوسفیان نے کہا کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کو بھی امن ہے۔

اور ابوسفیان نے اپنی بیوی ہند سے کہا کہ خیریت اسی میں ہے کہ تو اسلام لے آ۔ ورنہ ماری جائے گی۔ جا اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، لوگ اس اعلان کو سنتے ہی بھاگے کوئی مسجد حرام کی طرف اور کوئی اپنے گھر کی طرف۔ (سیرۃ المصطفیٰ ص: ۳۲ ج: ۳)

مکہ میں اسلامی لشکر کا داخلہ : دو یا تین روز مرالظہران میں قیام کے بعد دس رمضان ۸ھ کو رسالتمآبؐ لشکر اسلامی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ آپؐ نے بیت اللہ کی حرمت و عظمت کے پیش نظر ایسی حکمت عملی وضع فرمائی کہ جس سے بلا کشت و خون مکہ فتح ہو جائے لہٰذا آپؐ نے حفظ ماتقدم کے طور پر وادیٔ ذی طویٰ میں رک کر متفرق فوجی دستے ترتیب دیئے تاکہ وہ مختلف راستوں سے شہر مکہ میں داخل ہوں۔ ان دستوں کو آپؐ نے سخت تاکید کے ساتھ جدال، و قتال سے منع فرمایا۔ ان فوجی دستوں میں مہاجرین کا ایک دستہ زبیر بن عوام کی سربراہی میں قائم فرمایا اور انہیں مکہ کے بالائی حصہ میں واقع کداء نامی پہاڑی کی سمت سے داخل ہونے کا حکم دیا۔ دوسرا دستہ انصار کا سعد بن عبادہ کی سرکردگی میں دیکر ہدایت فرمائی کہ وہ نشیبی حصہ میں واقع کدیٰ نامی پہاڑی کے دامن سے داخل ہوں۔ لیکن سعد بن عبادہ نے روانگی کے وقت کہا کہ " آج بے دریغ قتل کا دن ہے۔ آج کعبہ کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جائیگا"۔ ان کے اس جملے کو مہاجرین میں سے کسی صاحب نے سن لیا۔ ابن ہشام کے مطابق وہ صاحب حضرت عمرؓ تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " یہ عمرؓ بن خطاب تھے جنہوں نے حضرت رسول خدا صلعم سے شکایت کی اور کہا یارسول اللہ آپ نے سنا جو سعد بن عبادہ نے کہا"۔[1] مولانا شبلی وغیرہ نے اس شکایت کو ابوسفیان سے منسوب کیا ہے جو ہمارے خیال میں اس لئے درست نہیں کہ ابوسفیان کسی طرح بھی مہاجرین میں شامل نہیں ہے۔ بہر حال اس شکایت پر رسالتمآبؐ نے فرمایا " آج خانہ کعبہ کی عظمت کا دن ہے اور خانہ کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا"۔ اور آپؐ نے حضرت علیؑ بن ابیطالب سے کہا کہ "تم فوراً سعد کے پاس پہنچو اور علم ان سے لے لو اور تم خود علم لیکر مدینہ میں داخل ہو"۔[2]

[1] تاریخ طبری ص: ۳۹۸ ج: ۱' روضۃ الاحباب ص: ۳۲۶ [2] سیرۃ ابن ہشام ص: ۴۸۲ ج: ۲

نقشہ فتح مکہ

لہٰذا سعد بن عبادہ کو تفویض شدہ علم حضرت علیؑ ہی لیکر مکہ میں داخل ہوئے۔ تیسرا دستہ خالد بن ولید کی سربراہی میں قائم کیا گیا جس میں مختلف قبائل کے لوگ شریک تھے۔ اس دستے کو زیریں مکہ میں مسفلع کے قریب سے داخل ہونے کی ہدایت فرمائی۔ اسکے علاوہ مہاجرین وانصار کے افراد کا ایک دستہ ابو عبیدہ بن جراح کی سرکردگی میں قائم ہوا جو رسالتمآبؐ کے سامنے سے آگے بڑھا۔ اس طرح کوکبۂ رسالت اذاخر نامی گھاٹی سے نمودار ہو کر بالائی مکہ میں جلوہ افروز ہوا۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان احتیاطی تدابیر کے باوجود خالد سے کوتاہی ہو ہی گئی جس پر آنحضرتؐ نے سخت برہمی کا اظہار فرمایا۔ خالد کی اس جھڑپ میں بقول شبلی نعمانی "کفار مکہ تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگے"۔ جبکہ محدث شیرازی کا بیان ہے کہ "بنی بکر کے بیس آدمی اور بنی ہذیل کے چار آدمی مارے گئے اور خالد کے دو آدمی کام آئے"۔ عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق جسے طبرانی نے نقل کیا ہے" خالد کی سپاہ نے ستر آدمیوں کی جان لی"۔ اور اس طرح رسالتمآبؐ کی حرم محترم کے احترام میں کی جانے والی حکمت عملی شبوتاژ ہو گئی اور اسی بناء پر بعض کہتے ہیں کہ مکہ بزور شمشیر فتح ہوا جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ صلح وامن کے ساتھ قبضہ میں آیا۔

الغرض بیس رمضان ۸ھ کو مکہ فتح ہو گیا۔ گو کہ خالد بن ولید مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے لیکن ان کی فطری جبلت میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جس کی ایک اور مثال وہ واقعہ ہے جو فتح مکہ کے بعد ماہ شوال ۸ھ میں بنی خزیمہ کو دعوتِ حق کے موقع پر رونما ہوا۔ اس واقعہ کو ہم مولانا ادریس کاندھلوی کی عبارت سے نقل کر رہے ہیں:

"ماہ شوال میں محض تبلیغ اسلام اور دعوت حق کیلئے ساڑھے تین سو مہاجرین وانصار کو خالد بن ولیدؓ کے زیر کمان بنی خذیمہ کی طرف بھیجا۔

یہ لوگ یلملم کے قریب ایک تالاب کے کنارہ جس کا نام عمیصاء ہے وہاں رہتے تھے، خالد بن ولید نے جاکر ان کو اسلام کی دعوت دی۔ گھبراہٹ میں اچھی طرح یہ تو نہ کہہ سکے کہ ہم مسلمان ہیں یہ کہنے لگے صبأنا صبأنا "ہم نے اپنا پہلا دین چھوڑ دیا ہے" خالد بن ولید نے اس کو کافی نہ سمجھا۔ بعض کو قتل کیا اور بعض کو گرفتار۔ جب آنحضرت کی خدمت میں پہنچے اور واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دومرتبہ یہ فرمایا: اللھم انی ابرأ الیک مما صنع خالد (بخاری وفتح الباری ص:۴۵ ج:۸) اے اللہ میں اس سے بالکل بری ہوں جو خالد نے کیا۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو روپیہ دیکر بنو خذیمہ میں بھیجا تاکہ ان کا خون بہا ادا کر آئیں۔ حضرت علیؑ نے جاکر ان کا خون بہا ادا کیا۔ اور جب تحقیق و دریافت کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ اب کسی کا خون بہا باقی نہیں رہا تو جو روپیہ باقی بچ رہا تھا وہ بھی احتیاطاً انہیں میں تقسیم کر دیا۔ واپس ہو کر جب بارگاہ نبوی میں سارا قصہ بیان کیا تو آپ بے حد مسرور ہوئے اور یہ فرمایا: أصبت واحسنت"۔ (ترجمہ: سیرۃ المصطفیٰ ص:۵۵ ج:۳)

اس کے علاوہ بنو خذیمہ کے مسلمانوں کے ساتھ خالد بن ولید کی زیادتی اور تقریباً ایک سو افراد کے قتلِ عام کی تفصیل ابوالفداء نے تاریخ ابو الفداء میں اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تفصیل سے لکھی ہے۔ جب کہ ابن ہشام نے سیرۃ ابن ہشام میں اس پورے واقعہ پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس واقعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خالد بن ولید جناب رسول خدا صلعم کی منشاء و مقصد کو سمجھنے سے قاصر تھے اور وہ کمال ارشاد پیغمبرؐ کے بجائے اپنی سمجھ سے زیادہ کام لیتے تھے۔

قیام پر استفسار: رسالتمآبؐ جب مکہ میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ سے مکہ میں قیام کی بابت دریافت کیا۔ اس ضمن میں مولانا شبلی صاحب کا بیان قابل غور ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:

"لوگوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہاں فرمائیں گے۔ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ ابو طالب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے۔ اس لئے وہی وارث ہوئے۔ انہوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے۔ اس بناء پر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں۔ اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا۔ جہاں قریش نے (ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا)"

(سیرۃ النبیؐ ص:۵۱۶ ج:۱)

گو کہ ابن ہشام، طبری، ابو الفداء، وغیرہ نے اس واقعہ کی تصریح نہیں کی البتہ بخاری صاحب نے تحریر کیا ہے اور بعد والوں نے اسلاف کی تقلید کو باعث افتخار جان کر اپنی تصانیف کی زینت بنایا ہے۔ شبلی صاحب نے بھی اس واقعہ کو مفید مطلب بنا کر اپنے مخصوص انداز میں نقل فرمایا ہے۔ جس کا اندازہ مضمون کی بے ربطی سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ قیام کی بابت لوگوں کا آنحضرتؐ سے دریافت کرنا، پھر خود ہی مقام قیام کی نشاندہی کرنا، اس کے فوراً بعد وراثت کا شرعی جواز پیش کر کے عقیل وابوطالب کا کفر ظاہر کرنا، عقیل کا اپنے موروثی مکانات کو فروخت کر دینا اور جس پر آنحضرتؐ کا پُر افسوس ارشاد اور آخر میں قیام کے مقام کی مبہم نشاندہی کرنا یہ سب کچھ اس عجلت سے بیان کیا گیا ہے کہ مفہوم واضح ہونے کے بجائے مزید الجھ گیا ہے اور غالباً مصنف چاہتے بھی یہی تھے۔ بہر حال تفصیلی بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں البتہ ہم صرف ابو طالب کا ترکہ اور مکانات کی فروخت سے متعلق مختصر گفتگو کر رہے ہیں۔

جہاں تک ابوطالب کے ترکہ کا تعلق ہے تو یہ امر یقینی ہے کہ جناب ابوطالب کے چار فرزند ان طالب، جعفر، عقیل اور علی آپ کے جائز، قانونی ودستوری وارث تھے اور یہ بھی مصدقہ ہے کہ جناب ابوطالب کی وفات ہجرت سے قبل ۱۰ نبوی میں ہوئی تھی۔ اس وقت صرف جعفر مہاجرین حبشہ کی رہنمائی کیلئے حبشہ میں تھے۔ بقیہ فرزندان مکہ میں موجود تھے۔ لہٰذا اصولاً جناب ابوطالب کا ترکہ تو آپ کی وفات کے وقت ہی تقسیم ہو چکا تھا۔ رسالتمآبؐ کے ہمراہ حضرت علیؑ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ اب طالب اور عقیل ہی مشرکین مکہ کے ساتھ مکہ میں رہ گئے جو اپنے موروثی مکانات پر قابض و متصرف تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر طالب لاپتہ ہو گئے جس کے بعد اولاد ابوطالب میں صرف عقیل ہی مکہ میں قیام پذیر رہے۔ ممکن ہے کہ عقیل نے اپنی ضرورت یا کفار کے خوف سے اپنے آبائی مکانات کو فروخت کر دیا ہو جس کا انہیں قانونی حق تھا۔ البتہ رسالتمآبؐ کے قدیم مکان کو نہ تو عقیل فروخت کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی ان سے خرید سکتا تھا کیونکہ وہ آنحضرتؐ کے قانونی وجائز وارث نہیں تھے۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کے مکانات کا جو حشر ہوا اس کی بابت شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے بیان کو ہم مولانا ادریس کاندھلوی کے الفاظ میں نقل کر رہے ہیں:

"کفار مکہ تمام مہاجرین کے مکانات اور جائداد اور املاک پر قبضہ کر چکے تھے۔ جب آپؐ خطبہ سے فارغ ہو گئے، جبکہ جناب کعبہ پر کھڑے ہوئے تھے کہ ابو احمد (عبداللہ) ابن جحش اٹھے اور اپنے اس مکان کی واپسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہا جس کو ابوسفیان نے ان کی ہجرت کے بعد چار سو دینار میں فروخت کر دیا تھا۔ آپؐ نے ان کو بلا کر کچھ آہستہ سے فرمایا، سنتے ہی ابو احمد بن جحش خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد جب ابن جحش سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم

ے کیا کہا تھا۔ ابو احمد نے کہا آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر تو صبر کرے تو تیرے لئے بہتر ہوگا اور اس کے معاوضہ میں تجھ کو جنت میں ایک مکان مل جائے گا۔ میں نے عرض کیا میں صبر کروں گا۔

ان کے علاوہ اور بھی بعض مہاجرین نے چاہا کہ ان کے مکانات ان کو دلائے جائیں آپؐ نے فرمایا تمہارا جو مال اللہ کی راہ میں جاچکا ہے میں اس کی واپسی پسند نہیں کرتا۔ یہ سنتے ہی تمام مہاجرین خاموش ہو گئے اور جو گھر اللہ اور اس کے رسولؐ کیلئے چھوڑ چکے تھے پھر اس کی واپسی کا کوئی حرف زبان پر نہیں آیا اور جس مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے اور جس مکان میں حضرت خدیجہؑ سے شادی ہوئی آپؐ نے اس کا ذکر تک نہیں فرمایا"۔

(الصارم المسلول ص: ۱۵۳، مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن

حوالہ سیرۃ المصطفیٰ ص: ۳۸ ج: ۳ مطبوعہ اشرفی بک ڈپو دیوبند)

حافظ ابن تیمیہ کے مذکورہ بیان سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ عقیل بن ابیطالب پر رسالتمآبؐ کے قدیم مکان کو فروخت کرنے کا الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس اس بیان سے اصل صورتحال یہ سامنے آئی کہ دیگر مہاجرین کے مکانات کی طرح رسالتمآبؐ کے قدیم مکان پر بھی کفار قریش کے سردار ابوسفیان نے قبضہ کیا تھا خریدا نہ تھا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ سیرت و تاریخ کی کتابوں میں افراد بنی ہاشم کی تحقیر و تذلیل کی خاطر مشتہر ہونے والے بے شمار بیانات کی طرح یہ بیان بھی ایک ناکام کوشش تھی جس کے ذریعہ عقیل کا غصب و تصرف غیر ماذون ثابت کرنا، عقیل و ابوطالب کے کفر کا اعلان کرنا اور اخلاق بنی ہاشم کی توہین ظاہر کرنا مقصود تھا جو بار آور ثابت نہ ہو سکا۔ بہر حال آنحضرت کے ارشاد کے مطابق شعب ابیطالب میں آپؐ کا خیمہ لگا دیا گیا۔

ام ہانی کا گھر دار الامان : سفر کے باعث رسالتمآبؐ کا جسم و لباس گرد آلود ہو گیا تھا لہٰذا آپؐ نے اپنے خیمہ میں غسل فرمایا۔ اسی اثناء میں ام ہانی بنت ابیطالب آگئیں جناب فاطمہ زہرہ سلام اللہ علیہا سے آنحضرت کی بابت دریافت کیا۔ اتنے میں آپؐ حجاب سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا۔ اهلاً و مرحبا یا ام هانی ماجاء بك. خوش آمدید اے ام ہانی، کیوں کر آنا ہوا۔ ام ہانی نے عرض کی کہ میرے شوہر کے دو عزیز میرے گھر میں آکر چھپ گئے ہیں اور میرے بھائی علی ان کا پیچھا کرتے ہوئے میرے دروازے تک پہنچ گئے وہ ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپؐ میری خاطر ان کی جان بخشی فرمادیں۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا قداجرنامن اجوت یا ام هانی، جاؤ ام ہانی جس کو تم نے امان دی اس کو میں نے بھی امان دی۔[1]

اس کے بعد آپ ام ہانی کے گھر تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا کہ کچھ کھانے کو لاؤ، ام ہانی نے عرض کی کہ نان اور سرکہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جسے میں حضورؐ کے سامنے پیش کرنے میں شرمندگی محسوس کرتی ہوں آپؐ نے ارشاد فرمایا، روٹی کے ٹکڑے کرکے سرکہ ملے پانی میں بھگو کر اوپر سے نمک چھڑک دو۔ ام ہانی کہتی ہیں کہ "پس آنحضرتؐ نے وہ کھانا کھایا اس کے بعد خدا کا شکر ادا کیا اور مجھ سے ارشاد فرمایا اے ام ہانی سب سے بہتر وہ دستر خوان ہے جس پر سرکہ موجود ہو اور اس گھر میں فقر نہیں آتا جس گھر میں سرکہ موجود ہوتا ہے"۔[2] اسکے بعد آپؐ نے ام ہانی کے گھر میں آٹھ رکعت نماز شکرانہ دو دو رکعت کرکے صوت خفی کے ساتھ پڑھی۔

حرم محترم میں داخلہ : جناب رسالتمآبؐ شعب ابیطالب سے جہاں [illegible] تھے اور بروایت دیگر خانۂ ام ہانی سے برآمد ہوئے جانثاروں کے

[1] [illegible] ص: ۳۸۷ ج: ۲ [2] ترجمہ زرقانی ص: ۷۵ ج: ۳ طبع مصر

ہجوم میں آپؐ ناقہ پر سوار ہوئے، پروانہ رسالت گرد و پیش تھے۔ اللہ رب العزت کی کیا شان ربوبیت ہے کہ جس ذات مقدسہ سے کفار مکہ نے تعلقات قومی و مالی منقطع کر دیئے تھے، خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی تھی، آمد و رفت مسدود کر دی تھی، آب و دانہ قرق کر لیا تھا، حسبی و نسبی رشتے مقطوع کر دیئے تھے اور اپنے زعم ناقص میں اس مقدس ہستی کو مع اس کے خاندان کے شعب ابی طالب میں محصور تصور کر لیا تھا آج وہی برگزیدہ ہستی اسی مقام سے کس شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہو رہی ہے۔ تمام عمائدین و اکابرین اور سرداران قریش دست بستہ و گردن خمیدہ و حاضر خدمت ہیں۔ سرمستان غرور و جہالت اور سرکشتگان کفر و ضلالت کی جماعت قطار در قطار باب بیت اللہ تک حسرت و عبرت کے عالم میں خاموش کھڑی کوکبہ رسالت کی عظمت و شان کو دیکھ رہی ہے۔ ان کی دو رویہ قطار کے درمیان سے مہاجرین و انصار اور عقیدتمندان جانثار نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اور وہ پیکر مطہر اپنی زبان اقدس سے قرآنی آیت انا فتحنا لك فتحاً مبینا کی تلاوت فرماتے ہوئے خراماں خراماں گزر رہے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبات قلبی کا یہ عالم ہے کہ شکر الٰہی میں بار بار خم ہوتے جاتے ہیں اور معرفت و حقیقت میں ڈوبا ہوا یہ کلمہ ارشاد فرماتے جاتے ہیں "پروردگار اصل کامرانی عاقبت کی کامرانی ہے"۔

بت شکنی : آفتاب رسالت کا جلوس پر نور حرم محترم تک [illegible] رسالتمآبؐ جس ناقہ پر سوار تھے اسی پر آپؐ نے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ چونکہ خانہ کعبہ مقفل تھا لہٰذا آپؐ نے حضرت بلال کو قفل کی چابی لانے کیلئے حضرت عثمان بن طلحہ کے گھر بھیجا اور آپؐ کعبہ کے باہر حرم میں نصب شدہ بتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی چھڑی کی نوک سے ایک ایک بت کو

ٹھوکے دیتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ "جَآءَ الحَقُّ وَ زَهَقَ البَاطِلُ اِنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" یعنی حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے کی ہی چیز تھی۔ اور وہ بت منہ کے بل گرتے جاتے تھے۔ تمام چھوٹے بت گر گئے مگر بڑے بت جو خانہ کعبہ کی چھت پر اور بلندی پر تھے رہ گئے۔ ان کو گرانے کی بابت مورخین نے تفصیل سے لکھا ہے ہم ان میں سے چند کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ مواہب لدنیہ میں امام قسطلانی لکھتے ہیں کہ :

"خزاعہ کے بت باقی رہ گئے تھے۔ جو کعبہ معظمہ کی چھت پر نصب تھے اور سیسہ کی بنی ہوئی شکلیں قارورے کی طرح مدور اور مخروطی تھیں۔ آپ نے حضرت علی سے ارشاد فرمایا کہ انہیں توڑ ڈالو یہ کہہ کر آپ نے ان کو اٹھایا یہانتک کہ آپ (حضرت علیؑ) اسی طرح اوپر چڑھ گئے اور انکو نیچے گرا کر چور چور کر دیا اور اہل مکہ تعجب سے دیکھنے لگے"۔

اس بیان کی شرح میں زرقانی لکھتے ہیں کہ :

"صاحب مواہب لدنیہ نے ابن نقیب کا کلام یہانتک لکھ کر تمام کر دیا۔ لیکن ابن نقیب نے اس قصہ کے سیاق عبارت میں اختصار کیا اور ابن ابی شیبہ اور حاکم نے حضرت علیؑ سے اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ حضرت علیؑ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلعم کعبہ کے پاس آئے اور میں بھی کعبہ سے لگ کر کھڑا ہو گیا مجھ سے ارشاد ہوا بیٹھ جاؤ میں کعبہ کے پہلو میں بیٹھ گیا تو آپ میرے کاندھے پر سوار ہو گئے اور مجھ سے ارشاد کیا کھڑے ہو جاؤ میں حسب الحکم اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن آپ نے میرے ضعف جسمانی کو دیکھ لیا تو پھر فرمایا بیٹھ جاؤ میں ویسے ہی بیٹھ گیا تو مجھ سے ارشاد ہوا اے علیؑ میرے کندھے پر سوار ہو جاؤ میں نے ایسے ہی تعمیل کی۔ جب میں آپ کے دوش مبارک پر چڑھا تو مجھے اس وقت خیال ہوا کہ اگر میں چاہوں تو آسمان کے کناروں تک پہنچ جاؤں۔ پھر میں

بیت اللہ پر چڑھ گیا اس پر کانسی کی مورت رکھی تھی اور وہ تانبے کی اور لوہے کی میخوں سے جڑی ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اس بڑی مورت کو اکھاڑ کر پھینک دو اور آیت جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا پڑھتے رہے یہاں تک کہ میں نے اس کو ہلا ہلا کر اس پر قابو پالیا۔ (ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۱۷۵ ج: ۳)

انہی واقعات کو امام احمد حنبل نے مسند میں، اور امام نسائی نے خصائص میں روایت کیا ہے۔ جبکہ حافظ جمال الدین محدث شیرازی نے روضۃ الاحباب مطبوعہ لکھنؤ ص: ۴۳۱ میں مزید تفصیل سے لکھا ہے۔

کعبۃ اللہ کے باہر نصب شدہ تمام بت گرا دیے گئے۔ اللہ کا واحد و عظیم گھر بیرونی آلائشوں سے تو پاک ہو گیا لیکن اندرونی غلاظت ابھی باقی تھی جس کو صاف کرنے کے لئے رسالتمآبؐ کلید بردار کا انتظار فرما رہے تھے۔ یہ تاخیر کیوں ہوئی وضاحت ملاحظہ فرمائیے۔

کلید بردار: کعبہ کی کلید برداری کا منصب قریش میں بڑی اہم امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہ منصب قصیٰ نے اپنے بیٹے عبد الدار کو عطا کیا تھا جو نسل در نسل اس کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ عثمان بن طلحہ جو فتح مکہ کے وقت کلید بردار تھے اسی نسل سے تھے۔ قریش کا یہ عقیدہ تھا کہ "قریش کے ہاتھ سے نہ کوئی کعبہ لے سکتا ہے اور نہ قریش ان کے خاندان سے کعبہ کی کنجی لے سکتے ہیں"۔

کلید بردار کی تاخیر کی وجوہ محدث شیرازی نے یوں بیان کی ہیں:

"آنحضرت ﷺ مسجد الحرام کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور بلال کو بھیج کر عثمان بن طلحہ سے کہلا بھیجا کہ خانہ کعبہ کی کنجی لاؤ۔ کنجی ان کی ماں سلافہ بنت سعد کے پاس تھی۔ عثمان ماں کے پاس کنجی لانے گیا اس میں دیر لگی۔ دھوپ کی تمازت سے آنحضرت صلعم کا پسینہ مبارک

مبارک پر جاری ہو گیا۔ آپؐ نے حاضرین سے کہا عثمان کو کیوں دیر ہوئی۔ وہاں ماں کعبہ کی کنجی بیٹے کو نہیں دیتی تھی۔ کہتی تھی جب کنجی تم سے لے لیں گے تو پھر تم کو نہ دیں گے۔ عثمان کہتے تھے تم کنجی مجھے دے دو میں خود اسے رسول اللہ صلعم کے پاس لے جاؤں نہیں تو کوئی دوسرا آئیگا اور تم سے کنجی لے جائے گا۔ ماں بیٹے میں یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ سلافہ کے دروازے پر آپہنچے اور عمرؓ نے باآواز بلند پکارا عثمان باہر آؤ رسول اللہؐ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سن کر سلافہ نے کنجی بیٹے کو دے کر کہا کہ بیٹا یہ کنجی لے جا میرے نزدیک تیرا کنجی مجھ سے لینا اس سے بہتر ہے کہ تیم اور عدی (کے لوگ) اس کو مجھ سے لے لیں۔

(روضۃ الاحباب ص: ۴۳۱ ترجمہ: اسوۃ الرسول ص: ۱۷۹ ج: ۳)

الغرض کافی ردو کد اور تاخیر کے بعد در کعبہ کھلا۔ رسالتمآبؐ اندر تشریف لے گئے دیکھا دیواروں پر ہر طرف تصویریں بنی ہیں جن میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی ہیں۔ انکی پرستش کی جاتی تھی لہٰذا ان کا مٹانا اشد ضروری تھا۔ اس کی بابت اسامہ بن زید سے منقول ہے کہ "آنحضرتؐ نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں ایک ڈول میں پانی لے آیا آپ نے کپڑا پانی میں تر کر کے وہ تمام تصویریں مٹا ڈالیں"۔ [1]

آنحضرتؐ کا خطبہ: جب کعبۃ اللہ اندرونی طور پر بھی کثافت سے پاک ہو گیا تب آپؐ نے وہاں نماز پڑھی، تکبیریں کہیں اور تسبیح، تحلیل کے ذریعہ شکر خداوندی بجالائے۔ محدث شیرازی کی روایت ہے کہ لوگوں کا ہجوم عام ہو جانے کے خیال سے کعبہ کے دروازے بند کروا دیے گئے اور بقول امام بخاری کعبہ میں صرف تکبیریں کہیں نماز نہیں پڑھی۔ جبکہ دیگر علمائے محدثین کے مطابق نماز بھی پڑھی اور تکبیریں بھی کہیں۔ اس کے

[1] زرقانی ص: ۳۸۸ ج: ۲، روضۃ الاحباب ص: ۴۳۲

بعد دروازے کھلوا دیے گئے آپؐ باہر تشریف لائے۔ مسجد الحرام کا تمام صحن خلقت خدا سے بھرا تھا کہیں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ جناب رسالتمآبؐ نے در کعبہ پر بلند ہو کر یہ مختصر مگر جامع و پُر اثر خطبہ ارشاد فرمایا۔

"ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکہ و تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا وعدہ سچا ثابت ہوا۔ اس نے اپنے بندے کی نصرت فرمائی۔ محض اسی نے تمام گروہوں کو شکست دی۔ سن لو، ہر موروثی استحقاق ہر خون اور مال جس کا دعویٰ کیا جائے وہ میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے۔ بجز خدمت بیت اللہ کے حق اور حجاج کو پانی پلانے کا حق کے، سن لو، جو خطا قتل ہوا ہو وہ کوڑے اور لاٹھی سے عمداً قتل کئے جانے والے کے مشابہ ہے، پس اس میں دیت مغلظہ ہے یعنی سو اونٹ، جن میں سے چالیس ایسے اونٹ ہونگے جن کے پیٹ میں بچے ہوں (گیا بھن ہو) اے گروہ قریش! اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت و آباء و اجداد پر فخر زائل کر دیا، سب انسان آدم سے پیدا ہوئے اور آدم مٹی سے۔ (سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۸۸ ج: ۲)

اور پھر آپؐ نے سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۳ کی تلاوت فرمائی:

"ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے ہی تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔ بے شک خدا بڑا واقف کار خبردار ہے"۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ اگر کسی کا نسب واقعی اعلیٰ ہے کہ اس پر فخر کیا جائے تو یہ مذموم نہیں البتہ نسبی فخر کا غلط استعمال معیوب ہے۔ کیونکہ نسبی مفاخرت کے وصف کو خود باری تعالیٰ نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے مثلاً سورہ آل عمران میں ارشاد ہے:

ترجمہ: بے شک اللہ نے آدم و نوح اور خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو سارے جہاں سے برگزیدہ کیا بعض کی اولاد کو بعض سے اور خدا سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

نیز جناب رسالتمآبؐ نے بھی ایک سے زیادہ مقامات پر اپنی نسبی فضیلت کا اعلان فرمایا ہے۔ جیساکہ صحیح ترمذی کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ:

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم میں اسمٰعیل کو، اولاد اسمٰعیل میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھ کو برگزیدہ فرمایا۔

جناب رسالتمآبؐ نے اس ارشاد میں اپنے نسب کے محاسن تو صیلی کو واضح فرمایا ہے جو بلاشبہ باعث فخر ہیں۔ البتہ اگر کوئی مجہول النسب طبقہ یا فرد اپنے مالی یا دنیاوی اقتدار کے باعث کسی اعلیٰ نسب طبقے یا فرد سے، خواہ وہ کتنا ہی نادار یا مفلوک الحال کیوں نہ ہو شرافت نسبی میں ہمسری کا دعویٰ کرے تو یہ مذموم ہے۔ رسالتمآبؐ کے اس خطبہ میں اسی مفاخرت بے جا کو منع فرمایا ہے جو حقیقتاً قریش مکہ آنحضرتؐ کے مقابلہ میں اپنے ہم نسبی کے غلط گمان پر شیخیاں بگھارتے تھے۔

عفو عام: خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع پر نظر ڈالی تو ان میں قریش کے وہ بوصلہ مند سردار بھی تھے جو اسلام اور بانیٔ اسلام کو مٹانے کی جستجو میں شب و روز سرگرداں رہتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کی زبان آتش فشاں رسالتمآبؐ پر بد کلامی کی آگ اگلتی رہتی تھی۔ ان میں وہ ظالم و جابر بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون رسالتمآبؐ کی پیاسی تھی۔ ان میں وہ سورما بھی تھے جنہیں مسلمانوں کا مدینہ میں بھی سکون سے رہنا گوارہ نہ تھا۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے غریب مسلمانوں کو سلگتی آگ پر لٹا کر انکے سینوں پر آنکھیں گاڑ رکھی تھیں۔ رحمت عالم نے تمام لوگوں کا جائزہ لینے کے بعد مجمع کو

مخاطب کر کے دریافت کیا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں آج تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ چونکہ یہ لوگ آپ کی خو بو سے واقف، حسب و نسب سے آگاہ، اخلاق و کردار کے جاننے والے اور مزاج شناس تھے لہٰذا پکار اٹھے۔ "اخ کریم و ابن اخ کریم" تو شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا ہے۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "لاتثریب علیکم الیوم اذھب فانتم الطلقاء" یعنی تم پر آج کے دن کوئی الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔ اس اعلان کے ذریعہ رسالتمآبؐ نے اپنے تمام دشمنوں کو معافی دیدی لیکن چند افراد جو بارگاہ رسالت میں حد درجہ گستاخ اور دریدہ دہن تھے ان کی بابت حکم ہوا کہ جہاں کہیں ملیں قتل کر دیے جائیں۔ رسالتمآبؐ نے جن مجرمین کا خون فتح مکہ کے دن مباح فرمایا تھا ان کی کل تعداد پندرہ تھی۔ جن کے نام درج ذیل ہیں:

عبداللہ بن خطل، قمر تنی، قُریبہ (یہ دونوں ابن خطل کی کنیزیں تھیں)، سارہ (یہ بھی کنیز تھی)، حویرث بن نقید، مقیس بن صبابہ، عبداللہ بن سعد، عکرمہ بن ابوجہل، ہبار بن الاسود، وحشی بن حرب (قاتل حضرت حمزہ)، کعب بن زہیر، حارث بن طلال، عبداللہ بن زبعری، ہبیرہ بن ابی وہب، اور ہندہ بنت عتبہ (زوجہ ابوسفیان)۔ ان پندرہ مجرمین میں سے صرف پانچ قتل کئے گئے جن کے نام ذیل میں درج ہیں بقیہ نے بارگاہ رسالت میں معافی کی درخواست کی جسے رحمت عالم نے قبول فرما کر انھیں معاف کر دیا۔ ان مقتولین میں عبداللہ بن خطل کو ابوبرزہ اسلمی اور سعد بن حرث نے خانہ کعبہ میں قتل کیا۔ قمر تنی یا قریبہ ان دونوں میں کوئی ایک قتل ہوئی۔ حویرث بن نقید اور حارث بن طلال ان دونوں کو حضرت علیؑ بن ابیطالب نے قتل کیا اور مقیس بن صبابہ کو عبداللہ لیثی نے قتل کیا۔

دعوت عام: جناب رسالتمآبؐ مسجد الحرام سے چاہ زمزم پر تشریف لے گئے۔ جب ظہر کا وقت ہوا تو آپؐ نے بلال کو حکم دیا کہ کعبہ معظم پر جا کر اذان دیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کی شان تھی کہ اللہ کے جس گھر میں تین سو ساٹھ بت آویزاں تھے اور جہاں مشرکین قریش کے خوف سے کوئی آہستہ سے بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کا نام نہیں لے سکتا تھا وہاں آج اللہ جل شانہٗ کی عظمت و بزرگی کا اعلان ببانگ دہل کیا جا رہا ہے۔ اذان ہوئی۔ نماز پڑھی گئی۔ نماز کے بعد رسالتمآبؐ صفا میں ایک بلند مقام پر تشریف فرما ہوئے اور بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قریش مکہ بیعت کیلئے حاضر ہونے لگے۔ یہ وہی قریش مکہ تھے جنہوں نے اللہ کے اس برگزیدہ بندے کو انتہائی ذلت و حقارت اور ظلم و شقاوت کے ساتھ اس کے اپنے شہر و دیار سے نکال باہر کیا تھا۔ اب وہی قریش خود آ آ کر اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر بے احترام سے اس کی اطاعت کی بیعت کر رہے تھے اور اللہ کے مقدس کلام "ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا۔" اور دیکھ لیا لوگوں نے کہ دین خدا میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں"۔ کی بشارت کو عملی صورت میں پورا کر رہے تھے۔

اس موقع کا ایک واقعہ عباس بن عبدالمطلب نے یوں بیان کیا ہے کہ "رسالتمآبؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارے دونوں بھتیجے عتبہ و معتب پسران عبدالعزیٰ (ابی لہب) کہاں ہیں وہ مجھے دکھائی نہیں دیتے آخر وہ دونوں کہاں ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ "جو مشرکین قریش روپوش ہو گئے ہیں انھیں کے ساتھ یہ دونوں بھی کہیں دور چلے گئے ہیں"۔ آپ نے فرمایا ان دونوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں آپ کے ارشاد کے مطابق سوار ہو کر مقام عرنہ گیا اور وہاں سے ان دونوں کو اپنے ساتھ لایا۔ آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا۔ دونوں نے اسلام قبول کیا اور آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

پھر آپ کھڑے ہو گئے اور دونوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے باب کعبہ کے قریب ملتزم پر آئے اور دیر تک دعا مانگتے رہے۔ پھر وہاں سے واپس ہوئے اور چہرہ انور پر مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ حضرت عباس کہتے ہیں: میں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمیشہ مسرور رکھے۔ آپؐ کے چہرہ کو مسرور دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے یہ درخواست کی تھی کہ مجھ کو میرے چچا کے یہ دونوں بیٹے عتبہ اور معتب عطا کر دیے جائیں سو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ دونوں عطا کر دیے اور میرے لئے ان دونوں کو ہبہ کر دیا"۔[1]

گو کہ دنیا والوں نے رسالتمآبؐ کو اپنے خاندان والوں سے جدا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن آپؐ نے ہر اچھے اور برے حالات میں اپنے خاندان کے افراد سے الفت و محبت کا اظہار فرمایا جس کی بہت سی مثالوں میں سے مذکورہ واقعہ ایک بہترین مثال ہے۔ سید المرسلین، رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے مثال محاسن اخلاق، رحم و مروت اور عفو درگذر کے پیش نظر ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر فتح مکہ کے وقت عبدالعزیٰ عم رسول خدا حیات ہوتا تو نہ صرف معاف کیا جاتا بلکہ مشرف بہ اسلام ہو کر دیگر طلقاء کی طرح رضی اللہ عنہ کہلاتا۔ لیکن اس کی بدنصیبی یہ ہوئی کہ وہ جنگ بدر کے چند دن بعد ہی فوت ہو گیا اور بعد والوں نے اس کا ایک اور نام ابولہب رکھ کر اس کے خلاف بے سروپا روایتیں اس یقین اور تواتر سے بیان کیں کہ علامہ اقبال جیسے مفکر و مدبر نے بھی اس کو "بدی کا ازلی سمبل" قرار دے دیا۔

الغرض مکہ معظمہ کی مکمل فتح کے بعد سالہا سال سے جاری کفر و اسلام کا قضیہ قریش مکہ کی حد تک تو ختم ہو گیا البتہ قرب و جوار کے بعض

[1] الخصائص الکبریٰ ص: ۲۹۴ ج: ۱ حوالہ سیرۃ المصطفیٰ ص: ۵۲ ج: ۳

قبائل میں اس کے آثار ابھی باقی تھے۔ رسالتمآبؐ ہنوز مکہ ہی میں تشریف فرما تھے کہ اطلاع ملی کہ وادی حنین میں آباد بنو ہوازن اور بنو ثقیف متحد ہو کر اسلام کے خلاف صف آرائی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ مکہ سے دس یا بارہ ہزار فوج کے ہمراہ حنین کی طرف روانہ ہوئے۔

فتوحات حنین و طائف اور تقسیم غنائم سے فارغ ہو کر ۱۸ ذیقعدہ کو رسالتمآبؐ جعرانہ سے مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ پہنچ کر آپؐ نے عمرہ ادا فرمایا اور مکہ کے انتظامی امور پر توجہ فرمائی۔ عتاب بن اسید کو مکہ کا امیر مقرر فرما کر آپؐ نے مکہ سے مدینہ مراجعت فرمائی اور ذیقعد ۸ھ کے آخری ایام میں آپؐ مدینہ پہنچے۔

اعلان برأت: سورۂ توبہ کا آغاز ہی لفظ برأت سے ہوتا ہے اسی لئے اسے سورۂ برات بھی کہتے ہیں ویسے مفسرین نے سورۂ توبہ کے دس نام معہ وجہ تسمیہ تحریر کئے ہیں لیکن مشہور ترین نام توبہ اور برأت ہی ہیں۔[1] اعلان برأت کا واقعہ یہ ہے کہ ذی قعدہ ۹ھ میں رسالتمآبؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ حج کی غرض سے مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ اور سورۂ برات کی آیات جو نقض عہد کرنے والوں کے بارے نازل ہوئی تھیں ان کا اعلان کرنے کو انھیں دیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی روانگی کے بعد آپؐ نے حضرت علیؑ کو بلایا اور اپنی اونٹنی عضباء پر سوار کر کے حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے روانہ کیا اور حکم دیا کہ یہ آیات ان سے لیکر موسم حج میں وہ خود سنائیں۔ حضرت علیؑ نے ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچ کر وہ آیات حضرت ابوبکرؓ سے لے لیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو خیال ہوا کہ شاید انکی بابت کوئی حکم نازل ہوا ہے اس لئے وہ فوراً مدینہ واپس ہوئے اور خدمت رسولؐ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یارسول اللہ کیا میرے بارے میں کوئی حکم نازل ہوا ہے۔

[1] تفسیر خازن ص: ۴۶ ج: ۳، فتح القدیر ص: ۳۱۶ ج: ۲

آپؐ نے فرمایا کہ برأت کا اعلان سوائے میرے یا میرے خاندان کے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس لئے اعلان برأت کے لئے میں نے علیؓ کو بھیجا ہے۔[1]

اس واقعہ کو متعدد مفسرین و محدثین نے حضرت ابو رافعؓ، انسؓ بن مالک، سعدؓ بن وقاص اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اسناد سے قدرے مختلف الفاظ میں روایت کیا ہے کہ (ترجمہ): حضور نے حضرت ابوبکرؓ کو موسم حج میں سورۂ برات دیکر بھیجا ہی تھا کہ جبرئیل امین نازل ہوئے کہ اس سورۃ کی تبلیغ آپؐ کی طرف سے نہیں کر سکتا مگر آپؐ یا کوئی آدمی جو آپ سے ہو۔ اس پر رسالتمآبؐ نے حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے بھیجا حتی کہ وہ آپ کو مکہ اور مدینہ کے درمیان جا کر مل گئے پس ان سے سورۃ پکڑ لی اور اس کو لوگوں پر مقام حج میں پڑھا۔[2]

بہر حال حضرت علیؓ ان آیات کو لے کر مکہ پہنچے اور یوم النحر یعنی قربانی والے دن مقام منیٰ میں جمرۂ عقبہ کے نزدیک کھڑے ہو کر آپؓ نے نہایت بیباکی سے سورۂ برات کی آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائی۔ اور اعلان فرمایا کہ آج کے بعد کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہوگا۔ نیز امسال کے بعد کوئی شخص ننگے بدن حج نہیں کرے گا۔ اور وہ تمام معاہدات جو مشرکین سے کئے گئے تھے وہ اب سے چار ماہ بعد ختم ہو جائیں گے۔

عام الوفود: اہل عرب کے تمام قبائل کو فتح مکہ کے بعد یہ یقین ہو چکا تھا کہ اسلام سے سرکشی ان کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں لہٰذا ان میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بانیٔ اسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ سے صلح کا معاہدہ کرلیں۔ ویسے تو آنحضرتؐ کے مدینہ پہنچتے ہی ۸ھ کے آخری ایام میں وفود آنا شروع ہو گئے لیکن ان سفارتی وفود کا کثرت سے تسلسل ۹ھ اور

[1] فتح الباری ص: ۶۵ ج: ۸، [2] تفسیر در منثور ص: ۲۱۰ ج: ۳، سیرۃ الحلبیہ ص: ۲۳۳ ج: ۲، خصائص نسائی ص: ۴۵ ترمذی شریف ص: ۵۰۵، کنز العمال ص: ۱۵۳ ج: ۶، مستدرک حاکم ص: ۵۱ ج: ۳ وغیرہ

۱۰ھ میں جاری رہا۔ ابن سعد وغیرہ نے ان وفود کی تعداد ساٹھ سے زیادہ بتائی ہے جب کہ عسقلانی نے مواہب میں چونتیس وفود کا ذکر کیا ہے۔ اسی کثرت کے باعث بعض مورخین نے ۹ھ کو عام الوفود کا نام دیا ہے۔ ان وفود میں چند کے علاوہ تمام وفود مشرف بہ اسلام ہوئے اور دولت ایمانی سے مالا مال ہو کر واپس لوٹے۔ اسلام قبول کرنے والے چند بااثر قبائل کے نام یہ تھے۔ بنو تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، بنو اسد، بنو ہمدان، بنو ازد، بنو طے وغیرہ۔

وفد بنو نجران: رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہونے والے قبائلی وفود میں ایک وفد بنو نجران کا تھا۔ نجران ایک بڑا شہر جو ضلع کی حیثیت رکھتا تھا اور مکہ سے یمن کی طرف سات منزل کے فاصلہ پر واقع تھا وہاں عیسائی عرب آباد تھے۔ اس شہر کو نجران بن زید بن یشجب بن یعرب بن قحطان نے آباد کیا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام نجران رکھا گیا۔ یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا جس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے۔ یہاں کا لاٹ بشپ (بڑا پادری) جو حبر اور اسقف کہلاتا تھا اس کا اصل نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا اور جو قبیلہ بکر بن وائل سے تھا۔ اس کے علم، فضل، مذہبی قابلیت اور دینی پختگی کے باعث شاہان روم اس کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور اسے بڑی بڑی جاگیریں عطا کی ہوئی تھیں۔

دیگر قبائل کی طرح آنحضرتؐ نے اہل نجران کو بھی اسلام کی دعوت کا مراسلہ ارسال کیا۔ جس پر نصارائے نجران نے باہمی صلاح مشورہ کے بعد ایک چودہ رکنی وفد عبدالمسیح ملقب بہ عاقب کی سربراہی میں مدینہ بھیجا۔ عاقب کی انتظامی معاونت کے لئے سید ایہم کو اور مذہبی مشاورت کے لئے ابو حارثہ کو مقرر کیا۔ یہ وفد بڑی شان و شوکت سے مدینہ میں داخل ہوا۔ ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہوا اور انہوں نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنا چاہی تو صحابہ نے انھیں روکا مگر رسالتمآبؐ نے صحابہ کو

منع کیا اور انھیں عبادت کرنے کی اجازت دیدی۔ نصاریٰ نے اپنے طریقہ کے مطابق مشرق کی جانب منہ کر کے اپنی نماز پڑھی۔ انہوں نے دوران قیام مختلف مذہبی مسائل پر آنحضرتؐ سے گفتگو کی۔[1] سب سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت اور ابنیت کے بارے میں مباحثہ و مکالمہ ہوا۔[2] رسالتمآبؐ نے وحی الٰہی کے مطابق جواب دیئے۔ ان مباحث کے دوران سورۂ آل عمران کی اسی آیات نازل ہوئیں۔ گو کہ نصارائے نجران پر حق واضح ہو چکا تھا مگر وہ دیدہ و دانستہ اتباع حق سے انکار کر رہے تھے۔ آخر کار رسالتمآبؐ نے جب ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی مسلمان ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جب تک تم صلیب کو پوجتے ہو، عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو تم کیوں کر مسلمان ہو سکتے ہو۔ جب یہ لوگ کسی طرح بھی حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو رسالتمآبؐ نے مباہلہ کی دعوت دی۔ جس کے لئے وہ آمادہ ہو گئے۔[3]

واقعہ مباہلہ: سورۂ آل عمران کی اکسٹھویں آیت جسے آیۂ مباہلہ کہتے ہیں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا ظفر حسن صاحب نے تحریر کیا ہے کہ:

"بنو نجران کا ایک وفد جس میں چالیس آدمی تھے تین سرداروں کی ماتحتی میں جو اسقف، عاقب اور سید کہلاتے تھے ۲۴ ذی الحجہ ۱۰ھ میں وارد مدینہ ہوا۔ حضرتؐ نے ان سے پوچھا کس ارادہ سے آئے ہو۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے مناظرہ کریں گے چنانچہ آپ کئی روز انھیں سمجھاتے رہے مگر وہ نہ مانے۔ بہر حال یہ طے پایا کہ مباہلہ کیا جائے۔ مباہلہ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہر فریق یہ کہتا تھا کہ اگر میرا حریف اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو یا اللہ تو اس پر عذاب نازل کر۔ جب مباہلہ طے پا گیا تو آیت نازل ہوئی (ترجمہ) "باوجود علم آجانے کے اگر یہ تم سے

[1] شرح مواہب ص: ۴۱ ج: ۴، فتح الباری ص: ۷۳ ج: ۸، [2] مباحث کی تفصیل کیلئے تفسیر در منثور ص: ۳ ج: ۲، [3] وفد نجران کے تفصیلی واقعات کیلئے حافظ ابن قیم کی الہدی الصحیح ص: ۵۵-۲۲ ج: ۱ ملاحظہ ہو

جھگڑا کریں تو ان سے کہو ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر خدا کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر لعنت کریں۔" آیۂ مباہلہ کی عملی تفسیر دکھانے کے لئے حضورؐ مباہلہ کے لئے بیت الشرف سے اس طرح نکلے کہ امام حسن کی انگلی پکڑے ہوئے تھے اور امام حسین کو گود میں لئے ہوئے حضرت فاطمہ آپؐ کے پیچھے اور حضرت علیؓ ان کے پیچھے۔ جب نصاریٰ کے پادری کی نظر ان پر پڑی تو اس نے اپنے گروہ سے کہا تم ان سے ہرگز مباہلہ نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دعا کریں کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دے تو وہ ضرور ہٹا دے گا۔ اگر محمدؐ کو اپنی صداقت پر پورا یقین نہ ہوتا تو آتش غضب الٰہی میں جلوانے کے لئے کبھی اس کنبہ کو ساتھ نہ لے کر آتے۔ چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے گریز کیا اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔" (تفسیر القرآن ص: ۲۳۰ ج: ۱)

تقریباً یہی واقعات الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد مفسرین محدثین و مورخین نے تحریر کئے ہیں ان میں چند ایک یہ ہیں۔ (صحیح مسلم ص: ۲۷۸ ج: ۲، امام حاکم نے مستدرک میں، محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں اور محدث شیرازی نے روضۃ الاحباب ص: ۵۲۳ میں)

آیت تطہیر: واقعہ مباہلہ کے زمانہ ہی میں ان پاک و پاکیزہ ہستیوں (پنجتن پاک) کی شان میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی جس کی بابت محدثین نے امہات المومنین حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایتیں بیان کی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

"حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ میرے گھر (حجرہ) میں تھے جب آپؐ پر آیت تطہیر نازل ہوئی۔ پیغمبرؐ نے تب فاطمہ، حسن اور حسین کو اپنی چادر میں لے لیا اور علی بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے

تھے پیغمبرؐ نے انھیں بھی اپنی چادر میں لے لیا اور فرمایا۔ اے اللہ صرف یہ میری آل ہے ان سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھنا اور ان کو ایسا پاک رکھنا جو حق طہارت ہے۔ ام سلمہؓ نے درخواست کی یا رسول اللہؐ کیا میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ پیغمبرؐ نے جواب دیا تم وہیں تمہر و جہاں پر ہو اور خیر کے ساتھ تم نسری رہو۔"

(جامع ترمذی ص: ۳۹۳' استیعاب ص: ۳۰۷ ج: ۲' ریاض النضرہ ص: ۱۸۸ ج: ۲' الغابہ ص: ۲۹ ج: ۳' ازالۃ الخفاء ص: ۲۶۰ مقصد ۲' مستدرک ص: ۱۰۸ ج: ۲)

حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ "ایک دن رسول اللہؐ نقش و نگاروالی کالی چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لائے۔ اسی وقت حسن ابن علیؑ آگئے اور پیغمبر نے انھیں اپنی چادر میں لے لیا فوراہی ان کے پیچھے حسینؑ بھی آگئے ان کو بھی رسول نے اپنی چادر میں لے لیا۔ اس کے بعد فاطمہؑ آئیں پیغمبر ان کو بھی چادر میں لے لیا آخر میں علیؑ آئے اور رسول نے ان کو بھی اپنی چادر میں لے لیا۔ فوراہی آپ نے آیۂ تطہیر تلاوت فرمائی"۔

انما یرید اللہ لیذھب عن کم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا ○ (سورۂ احزاب آیت: ۳۳)۔ ترجمہ: اے (پیغمبر کے) اہل بیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔"

(صحیح مسلم ص: ۲۸۳ ج: ۲' مسند احمد حنبل ص: ۳۳۰ ج: ۱)

جملہ مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آیت تطہیر خانہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ میں اس وقت نازل ہوئی جب جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ' فاطمہؑ' حسن و حسین علیہما السلام کو اپنے ساتھ ایک چادر میں ڈھانپ کر فرمایا اللھم ھؤلاء اھلبیتی۔ اے اللہ یہ میرے اہلبیت ہیں۔ آیت تطہیر سے متعلق محدثین نے ایک ہی مفہوم کی تقریباً تیس حدیثیں بیان کی ہیں۔

تمام علمائے مفسرین و محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت علیؑ' فاطمہؑ' حسن و حسین علیہما السلام اہلبیت رسولؐ ہیں اور اس میں بھی کسی کو شک نہیں کہ آیت تطہیر انہی بزرگواروں کے لئے نازل ہوئی۔ مگر اس کے باوجود بعض حضرات کا خیال ہے کہ اہلبیت میں ازواج النبی بھی شامل ہیں۔ اس گمان کی غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ آیت تطہیر قرآن کریم میں ان آیات کے درمیان ہے جن میں اللہ تعالی نے ازواج محرمات کو تنبیہ و تاکید فرمائی ہے۔ لیکن سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت تطہیر کا ٹکڑا کہیں اور کا ہے جسے جامع قرآن نے یہاں مصلحتاً لاکر رکھا ہے۔ مفسرین نے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ ازواج رسول کسی طرح بھی اہلبیت رسولؐ میں شامل نہیں کی جا سکتیں کیوں کہ:

۱) اگر آیت تطہیر میں ازواج رسول بھی شامل ہوتیں تو جس طرح اس سے قبل اور بعد کی آیات میں جمع مونث حاضر کا صیغہ استعمال ہوا اس آیت میں بھی باقی رہتا لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ آیت تطہیر میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ استعمال ہوا جیسے عنکم' یطھرکم۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کا مقصود وہ گروہ ہے جس میں مردوں کی کثرت ہو۔

۲) اگر آیت تطہیر کو درمیان سے نکال لیا جائے اور ما قبل و مابعد کی آیات کو ملا کر پڑھا جائے تو کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ ان کا ربط اور بڑھ جاتا ہے۔ جس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس مقام کی نہیں ہے۔

۳) اگر آیت تطہیر میں ازواج النبی شامل ہوتیں تو قواعد کے مطابق آیت میں ضمیر و صیغہ مونث ہی ہونا ضروری تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

۴) آیت تطہیر کے ضمن میں منقول حدیث کے ایک راوی زید بن ارقم کا قول ہے کہ " ازواج' اہلبیت نہیں ہیں کیونکہ یہ تو آج ہیں کل طلاق دیدی الگ ہو گئیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن پر خدا نے صدقہ حرام کیا ہے۔"

۵) اگر آیت تطہیر میں ازواج شامل ہوتیں تو رسالتمآبؐ حضرت ام سلمہؓ کو جن کے گھر میں یہ آیت نازل ہوئی اور جو خود بڑی ممدوح اور پکی ایماندار بی بی تھیں' کبھی بھی چادر میں داخل ہونے سے منع نہ فرماتے اور یہ نہ فرماتے کہ " تم نیکی پر ہو مگر اہلبیت میں شامل نہیں بلکہ ازواج میں ہو۔" آنحضرتؐ کے اس دو ٹوک فیصلے سے اس کی قطعی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ کوئی جدید مورخ ازواج کو اہلبیت میں شامل کیا کرے۔

اہلبیت رسولؐ صرف وہی برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں رسالتمآبؐ نے اکثر و بیشتر اپنے قول و عمل سے روشناس کرایا۔ اور جن کی کل تعداد (بشمول رسول مقبولؐ) پانچ ہے اور یہی پنجتن پاک ہیں جو تحت الکساء میں بھی ہیں اور میدان مباہلہ میں رسالت کی تصدیق کرنے والے بھی ہیں۔

حجۃ الوداع: فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں ہونے والا حج قریش مکہ نے عہد جاہلیت کے طریقہ پر ادا کیا۔ اس میں کوئی مسلمان شریک نہ تھا۔ ۹ھ میں حج کی فرضیت کا حکم نازل ہونے کے بعد مسلمانوں کا ایک قافلہ حج بیت اللہ کی غرض سے مکہ پہنچا۔ اس موقعہ پر کفار نے اپنے طریقہ سے اور مسلمانوں نے اپنے طریقہ سے حج ادا کیا۔ اس کے بعد ۱۰ھ میں ہونے والا حج رسالتمآبؐ کی رہنمائی میں کلی طور پر اسلامی طریقہ سے ہوا۔

ماہ ذیقعدہ ۱۰ھ میں رسول مقبول نے حج بیت اللہ کا قصد فرمایا اور اعلان کرایا کہ جو مسلمان آپؐ کے ہمراہ حج کیلئے جانا چاہے وہ تیاری کرے۔ جناب رسولؐ خدا ۲۵/ ذیقعدہ ۱۰ھ مطابق ۲۲/ فروری ۶۳۲ء بروز شنبہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مہاجرین و انصار اور اصحاب جانثار کے بے شمار گروہ آپؐ کے ہمراہ ہوئے اس سفر میں شریک افراد کی تعداد نوے ہزار سے ایک لاکھ بیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔ آپؐ کی دختر حضرت فاطمہ زہرہ سلام علیہا اور جملہ ازواج محرمات رضی اللہ عنہا بھی شریک سفر تھیں۔

چھ میل کا سفر طے کر کے مقام ذوالحلیفہ میں شب بھر قیام فرمایا۔ دوسرے روز احرام باندھے اور بلند آواز سے " لبیك اللھم لبیك لا شریك لك لبیك"۔ (اے اللہ ہم تیرے سامنے حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں ہم حاضر ہیں) کی صدائیں بلند کرتے ہوئے اللہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مقام سرف پر پہنچ کر آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جن کے ساتھ ھدی (قربانی کے جانور) نہیں ہیں وہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں۔ نو دن کی مسافت کے بعد ۴/ ذی الحجہ بروز یکشنبہ کو یہ نورانی قافلہ مکہ معظمہ میں داخل ہوا۔ جب شہر مکہ میں آنحضرتؐ کی آمد کی خبر پہنچی تو بنی ہاشم کے لڑکے خوشی سے دوڑتے ہوئے آپؐ تک پہنچ گئے رسالتمآبؐ نے فرط محبت سے ان بچوں میں سے کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے اپنی سواری پر بٹھالیا۔

حضرت علیؑ کی شمولیت: رسالتمآبؐ نے ماہ رمضان میں حضرت علیؑ کو بنی نجران سے جزیہ کی وصولی کے لئے بھیجا ہوا تھا۔ حضرت علیؑ کو جب آپؐ کے مکہ جانے کا علم ہوا تو آپ یمن سے سیدھے مکہ پہنچے اور حج میں شریک ہوئے۔ آپ رسول اللہؐ سے اس حالت میں ملے کہ احرام باندھا ہوا تھا۔ سفر کا حال بیان کیا جب آپ تفصیل بیان کر چکے تو رسالتمآبؐ نے فرمایا "جا کر بیت اللہ کا طواف کرو اور اسی طرح احرام کھول دو جس طرح تمہارے ساتھیوں نے کھول دیا ہے"۔ حضرت علیؑ نے کہا "یا رسول اللہؐ میں نے ویسا احرام باندھا ہے جیسا کہ آپؐ نے باندھا ہے"۔ رسالتمآبؐ نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ اس پر حضرت علیؑ نے کہا جس وقت میں نے احرام باندھا تھا اس وقت نیت کرتے ہوئے کہا تھا اے اللہ "میں وہ احرام باندھتا ہوں جو تیرے نبی اور تیرے رسول محمدؐ نے باندھا ہے"۔ تب رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا "کیا تمہارے پاس ھدی ہے"؟ حضرت علیؑ نے جواب دیا نہیں ہے۔ پھر

- شرح المواہب ص: ۱۰۵ ج: ۳' نسائی باب استقبال حج'

رسول اللہؐ نے انھیں اپنے جانوروں میں شریک کرلیا۔ جب حج سے فارغ ہوئے تو رسول اللہؐ نے دونوں کی طرف سے جانور قربان کئے۔[1] اس مشارکت کی بات صحیح مسلم میں مرقوم ہے کہ :

"جابرؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول خداؐ نے اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ قربان کئے۔ ان کے علاوہ جس قدر قربانی کیلئے اونٹ رہ گئے تھے ان کی قربانی کیلئے علیؑ کو حکم دیا اور رچھا دیا اور ان کو (علیؑ کو) اپنی قربانی میں شریک کیا۔ پھر ہر ایک اونٹ میں سے تھوڑا سا گوشت لینے کا حکم دیا پس وہ ایک ہنڈیا میں پکوا کر دونوں صاحبوں نے کھایا اور اس کا شوربا پیا۔" (بحوالہ اسوۃ الرسول ص: ۳۶۵ ج: ۳)

ادائیگی مناسک حج : رسالتمآبؐ کے مناسک کی ادائیگی کی بات مورخین نے تفصیل سے لکھا ہے لیکن ہم یہاں ڈاکٹر نثار احمد صاحب کے بیان کی روشنی میں مختصراً تحریر کررہے ہیں۔ رسول اللہؐ نے مکہ پہنچ کر کعبہ کا طواف کیا' مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا فرمایا۔ صفا و مروہ میں دعا و تہلیل کی۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے مگر آپؐ نے جن لوگوں کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے انھیں عمرہ تمام کرکے احرام اتارنے کا حکم دیا۔ آٹھویں تاریخ کو منیٰ میں قیام فرمایا۔ نویں تاریخ کو جمعہ تھا صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے عرفات تشریف لے گئے جہاں مقام نمرہ میں قیام فرمایا ہے۔ پھر کو ناقہ پر سوار ہو کر میدان میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ غروب آفتاب کے وقت وہاں سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچے دسویں تاریخ کو فجر کی نماز پڑھ کر طلوع آفتاب سے پہلے وہاں سے کوچ فرمایا۔ فضل بن عباسؓ آپؐ کے ناقہ پر ساتھ تھے۔ اہل حاجت دائیں بائیں حج کے مسائل دریافت کرتے جاتے تھے اور آپؐ بآواز بلند مناسک حج کی تعلیم دیتے جاتے تھے۔ مقام جمرہ سے فارغ ہو کر میدان

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۶۰۳ ج: ۲

منیٰ میں تشریف لے گئے جہاں مسلمانوں کا عظیم مجمع تھا۔ آپؐ نے وہاں خطبہ ارشاد فرمایا اس کے بعد قربان گاہ پہنچے۔ قربانی کے سو اونٹ تھے کچھ آپ نے خود اپنے دست مبارک سے ذبح کئے باقی کو حضرت علیؑ کے سپرد کر کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ قربانی سے فارغ ہو کر سر کے بال منڈوائے اس کے بعد مکہ تشریف لائے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر منیٰ تشریف لے گئے اور ۱۲ ذی الحجہ تک وہیں قیام فرمایا۔ ۱۳ تاریخ کو پھر مکہ تشریف لائے۔ ۱۴ ذی الحجہ کو نماز فجر کے بعد آپؐ نے مہاجرین و انصار کے ہمراہ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔[1]

مقام خم : مقام خم مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے وہاں ایک تالاب تھا عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اس لئے عام طور سے روایتوں میں اس مقام کو غدیر خم یا خم غدیر کہا گیا ہے۔ یہ کوئی منزل نہ تھی یعنی یہاں قافلے قیام نہیں کرتے تھے اور نہ ہی وہاں کوئی آبادی تھی یہ ایک لق و دق میدان تھا۔ جب آپ ۱۸ ذی الحجہ کو مقام غدیر خم پہنچے تو یہ تاکیدی حکم نازل ہوا :[2]

ترجمہ : "اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا اور تم ڈرو نہیں خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ خدا ہرگز کافروں کی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔" (سورۃ المائدہ آیت : ۶۷)

یہ حکم ملنے کے بعد آپؐ نے تمام مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم دیا لہٰذا جو آگے چلے گئے تھے انہیں واپس بلایا گیا اور جو پیچھے رہ گئے تھے ان کا انتظار کیا گیا اب سب جمع ہو گئے تو نماز ظہر کی تیاری ہوئی گرمی شدید تھی درختوں پر

[1] نقل سیرۃ ص: ۵۳۰ [2] تفسیر در منثور سیوطی ص: ۲۰۹ ج: ۲ طبع مصر

کپڑا تان کر آپؐ کے لئے سایہ کیا گیا آپؐ نے نماز ظہر پڑھائی اس کے بعد اللہ کے آخری نبیؐ نے اپنا آخری خطبہ ارشاد فرمایا جسے خطبہ غدیر کہتے ہیں۔

خُطْبہ غَدِیرِ خُم :

الحمد لله ونستعينه و نؤمن به ونتوكّل عليه و نعوذبا لله من شرور انفسنا وسيّات اعمالنا الذى لاهادى لمن ضل ولا مضل لمن هدى واشهدان لااله الا الله وان محمداً عبده ورسوله اما بعد ايها الناس قدنبانى اللطيف الخبيرانّه لم يعمّر نبى الأمثل نصف عمرالذى قبله وانى اوشك ان ادعى فاجيب وانى مسئول و انتم مسئولون فماذا انتم قائلون قالو انشهدانّك قد بلغت و نصحت وجهدت فجزاك الله خيراً قال الستم تشهدون ان لا اله الا الله و ان محمداً عبده ورسوله وان جنته حق وناره حق ان الموت حق و ان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من فى القبور قالوابلىٰ نشهد بذالك قال اللهمّ اشهد ثم قال ايها النّاس الا تسمعون قالوانعم قال فانى فرط على الحوض وانتم واردون علىّ الحوض وان عرضه مابين صنعاء وبصرى فيه اقداح عددالنجوم من فضة فانظر واكيف تخلفونى فى الثقلين فنادى منادوما الثقلين يا رسول الله قال الثقل الاكبر كتاب الله طرف بيدالله عزّوجلّ وطرف بايديكم وطرف بايديكم فتمسكوابه لاتضلوا والآخر الاصغر عترتى وان اللطيف الخبير نبانى انهما لن يفترقا حتىٰ يرو علىّ الحوض فسألت ذالك لهما ربى فلا تقد موهما فتهلكوا ولا تقصر واعنهما فتهلكو ثمّ اخذ بيد على فرفعها حتىٰ دولى بياض ابالهما وعرفه القوم اجمعون فقال ايهاالناس من اولى الناس

بالمؤمنينَ من انفسهم قالوالله ورسوله اعلم قال ان الله مولاى وانامولىٰ المومنين و انااولى بهم من انفسهم فمن كنت مولاه فعلى مولاه يقولها ثلث مرات وفى لفظ احمد امام الحنابلة اربع مرات ثم قال اللهم وال من والاهٗ وعاد من عاداه واحب من احبه وابغض من ابغضه وانصرمن نصره واخذل من خذله وادرالحق معه حيث داراالافليلغ الشاهدالغائب ثم لم يتفرّقوا حتىٰ نزل امين وحي الله بقوله اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى للاية فقال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم الله اكبر على اكمال الدين واتمام النعمة ورضى الرب برسالتى والولا ية لعلى من بعدى ثم طفق القوم يهنون اميرالمومنين صلوات الله عليه وممن هناه فى مقدم الصحابة الشيخان ابوبكروعمر كل يقول بخٍ بخٍ لك يا ابن ابى طالب اصبحت وامسيت مولاى ومولى كل مومن ومومنة۔

ترجمہ : جملہ محامد اللہ واجب الوجود کے لئے سزاوار ہیں ہم اس سے مدد مانگتے ہیں اور اسی کے ساتھ ہمارا ایمان ہے ہم اپنے نفسوں کی شرارتوں سے اللہ کے ساتھ پناہ مانگتے ہیں۔ اور اپنے اعمال کی برائیوں سے ! جس کو اللہ ہدایت کرے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کی گمراہی پر مہر تصدیق ثبت کردے اس کو کوئی ہدایت کرنے والا نہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تحقیق محمد اس کا بندہ بھی ہے اور اس کا رسول بھی اس کے بعد فرمایا خبردار! اے لوگو مجھے اللہ تعالےٰ نے خبر دی ہے کہ یہ نبی اپنے سے پہلے نبی کی عمر کے مقابلہ میں نصف عمر دیا جاتا ہے۔ عنقریب میں بلایا جاؤں گا اور سوال کیا جائیگا اور تم بھی پس تم کیا کہو گے انہوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں آپ نے

خوب تبلیغ کی اور خیر خواہی کی اور بہت کوشش فرمائی پس خدا آپ کو جزا خیر دے آپ نے فرمایا کیا تم گواہی نہیں دیتے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور تحقیق جنت اور دوزخ حق ہے اور تحقیق موت حق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں اور تحقیق اللہ تعالےٰ قبروں سے مردے اٹھائے گا۔

انہوں نے کہا کہ ہاں ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہا اے اللہ تو گواہ رہ پھر فرمایا اے لوگو! کیا تم سنتے نہیں ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں ہم سنتے ہیں کہا پس میں حوض کوثر پر تم سے پہلے پہنچنے والا ہوں تم میرے پاس پیاسے آؤ گے تحقیق حوض کوثر کی چوڑائی صنعاء اور بصریٰ کے درمیان ہے اس میں چاندی کے پیالے ستاروں کی تعداد میں پڑے ہیں پس غور کرو میرے بعد ثقلین سے کیا برتاؤ گے پس ایک منادی نے ندا دی حضور ثقلین سے کیا مراد ہے فرمایا ثقل اکبر کتاب اللہ ہے اس کی ایک طرف تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف خدا کے ہاتھ میں ہے پس اس کو پکڑو گمراہ نہیں ہو گے۔

ثقل اصغر میری عترت ہے مجھے لطیف و خبیر نے خبر دی ہے کہ تحقیق وہ دونوں ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں ہوں گے۔ حتیٰ کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ میں نے ان دونوں کی نسبت اپنے رب سے یہ سوال کیا تھا۔ پس تم ان دونوں سے آگے مت بڑھو۔ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور نہ پیچھے رہو ہلاک ہو جاؤ گے پھر حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور اس کو بلند کیا حتیٰ کہ دونوں کی بغلوں کی سفیدی نظر آئی۔ اور سب قوم نے اس کو پہچان لیا پھر فرمایا اے لوگو! مومنوں کے ساتھ ان کی جانوں سے بڑھ کر لوگوں میں سے کون والی ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا تحقیق اللہ

تعالےٰ میرا مولا ہے اور میں مومنوں کا مولا ہوں یعنی ان کی جانوں سے بڑھ کر بھی ان کا والی اس کے بعد آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ اور امام احمد کے لفظوں میں ہے کہ چار مرتبہ فرمایا پھر کہا اے اللہ محبت کر اس سے جو اس سے محبت کرے اور عداوت رکھ اس سے جو اس سے عداوت رکھے اور بغض رکھ اس سے جو اس سے بغض رکھے اور مدد کر اس کی جو اس کی مدد کرے اور ذلیل کر اس کو جو اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرے اور حق کو ادھر پھیر دے جس طرف یہ پھرے خبردار! حاضر کو چاہئے کہ غائب کو میرا یہ پیغام پہنچا دے پھر ابھی متفرق نہ ہوئے تھے۔ کہ جبرائیل امین نازل ہوئے۔ اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی نازل ہوئی۔ حضرت نے فرمایا۔ اللہ اکبر دین کے پورا کرنے اور نعمت کے تمام کرنے اور میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر خدا کے راضی ہونے پر خدا تعالےٰ کا شکر ہے۔

اس کے بعد قوم حضرت علی علیہ السلام کو مبارک دینے لگی۔ انہوں نے مبارکباد دی ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے سب کہتے تھے مبارک ہو مبارک ہو تجھ کو اے ابوطالب کے بیٹے۔ کہ آج سے آپ میرے مولا اور ہر مومن کے مولا ہو گئے"۔

(تفسیر خلافت ص: ۹۵ از مولانا اسمٰعیل صاحب)

تکمیلِ دین: جناب رسالتمآبؐ دینیات و اخلاقیات کی تعلیم توجۃ [illegible] کے خطبات کے ذریعہ فرما چکے تھے۔ اب خم کے میدان میں [illegible] نظم مملکت کے لوازم کے ضمن میں ایک لاکھ سے زائد افراد کے [illegible] حکم خدا آپؐ نے حضرت علیؑ کو بلند کر کے یہ اعلان فرمایا [illegible] مولاہُ فعلیٌ مولاہُ اللّٰھم وال من والاہُ وعادِ من عادہ [1]

[1] [illegible] ص: ۳۸۱ ج: ۱

(یعنی جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔ اے اللہ تو اس سے محبت کر جو علی سے محبت کرے اور اس کے ساتھ عداوت کر جو علی سے عداوت کرے)۔ رسالتمآبؐ نے اپنے اس قول و عمل کے ذریعہ امت سے اپنے وصی کا تعارف کرایا جس کے بعد وہ تمام فرائض منصبی جو قدرت کی طرف سے اس مہتم رسالت کے سپرد فرمائے گئے تھے۔ حسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچے اور ابھی لوگ میدان خم سے منتشر نہ ہوئے تھے کہ حکم الٰہی نازل ہوا:

"الیوم اکملتُ لکم دینکم و اتممتُ علیکم نعمتی ورضیتُ لکم الاسلام دینا [1] آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے دینِ اسلام کو پسند کیا"۔ ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ

"بالتحقیق غدیر خم کے روز جناب رسالتمآب ﷺ نے لوگوں کو بلا کر درخت کے نیچے جھاڑو دینے کا حکم کیا وہاں سے کانٹوں کو جھاڑو سے دور کیا گیا پھر آپؐ نے علی کو بلوا کر ان کے دونوں بازو پکڑ کر اٹھایا یہاں تک کہ لوگوں نے حضرت کی بغل کی سفیدی کو ملاحظہ کیا پھر آپؐ نے فرمایا جس کا میں مولا ہوں پس اس کا علی مولا ہے پھر ابھی لوگ متفرق نہیں ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ آج کے روز میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کیا ہے اور میں نے اپنی نعمت کو تم پر پورا کیا۔ پس جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ اللہ اکبر، دین کے کامل ہو جانے اور نعمت پورا ہونے اور میرے رسالت اور علی کی ولایت پر خدا کے راضی ہونے پر"۔

(ترجمہ: ارجح المطالب ص: ۸۰)

جناب مولانا مودودی صاحب نے بھی تفہیم میں آیت اکملت کو روزِ غدیر نازل ہونا تسلیم کیا ہے۔ [2] پس خلافت علیؑ کے اعلان کے بعد دین

[1] سورۂ المائدہ آیت: ۳، [2] تفہیم القرآن ص: ۴۳۵ ج: ۱

اسلام اپنے اصول کے لحاظ سے مکمل ہو گیا اور خدا کی نعمت یعنی ہدایت کے لئے جو چیزیں ضروری تھیں وہ سب پوری ہو گئیں۔ الیوم کا لفظ بتاتا ہے کہ آج دین مکمل ہو گیا۔ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، آج نعمتیں پوری ہو گئیں اس سے پہلے نہیں ہوئی تھیں۔ اور یہ کہ آج خدا نے مسلمانوں کے لئے دین اسلام کو پسند فرما لیا اس سے پہلے نہیں فرمایا تھا۔ جو دین قیامت تک باقی رہنے والا تھا اگر اس کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست نہ ہوتا تو وہ اپنے تمام شرائط و احکام کے ساتھ باقی کیسے رہ سکتا تھا۔

رسالتمآبؐ غدیر خم سے روانہ ہوئے قافلے اپنے اپنے مقامات کی جانب کوچ کر گئے جب آپؐ مدینہ کے قریب پہنچے تو ذوالحلیفہ میں شب بسر کی دوسرے روز صبح کے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔

- - - - - - - - -

وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علالت : حاکم قضاو قدر نے اپنے حکم یعنی "سوائے ذات الٰہی کے سب ہلاک ہونے والے ہیں" نازل فرما کر بتلادیا تھا کہ رسالتمآبؐ کی مقدس و معظم ہستی کو بھی لازماً ایک دن موت کی آغوش میں جانا ہے۔ جس کی خبر آنحضرتؐ کو مل چکی تھی۔ تب ہی تو آپؐ نے حجۃ الوداع کو اپنا آخری حج قرار دیتے ہوئے ارشاد فرما کر کہ "شاید میں اس سال کے بعد حج نہ کر سکوں" مسلمانوں کو اپنی مفارقت کی بات واضح اشارہ دے دیا تھا۔

جناب رسالتمآبؐ حجۃ الوداع سے واپس آکر مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر رہے حتیٰ کہ ۱۱ھ کا محرم تمام ہو کر صفر کا نصف مہینہ گزر گیا۔ ایک روز اچانک آپؐ کے سر میں درد شروع ہوا اور آپؐ علیل ہو گئے۔ ابن ہشام کی ایک روایت کے مطابق ایک روز آپؐ نے اپنے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) ابو مویہبہ کو ساتھ لیا اور بقیع چلے گئے وہاں کے مدفونوں کے لئے دیر تک طلب استغفار اور دعائے خیر فرماتے رہے۔ واپس آئے تو آپؐ سر درد میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ کے مرض کی ابتداء حضرت میمونہ کے گھر سے ہوئی وہ انھیں کی باری کا دن تھا۔

ابو الفداء، ابن ہشام اور طبری وغیرہ نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ

"(بعد ازاں) رسول خدا میرے یہاں تشریف لائے میں اس وقت درد سر کی شدت سے "وارساہ" (ہائے میرا سر) کہہ کر کراہتی تھی۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے عائشہ اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ تو تم کو کیا ضرور ہے میں تمہاری تجہیز، تکفین کا کفیل ہوں گا کفن دیکر اور نماز پڑھ کر تم کو دفن کروں گا یہ سن کر میں نے کہا، واللہ میرا گمان تو یہ ہے کہ میری تجہیز، تکفین سے فارغ ہوتے ہی آپ میرے گھر میں کسی دوسری بی بی سے ہم صحبت ہوں گے"۔

(تاریخ احمدی ص: ۹۳، سیرۃ ابن ہشام ص: ۸۸۷ ج: ۲، تاریخ طبری ص: ۵۱۷ ج: ۱)

جیش اسامہ : رسالتمآبؐ نے دوران علالت اسامہ بن زید کی سربراہی میں ایک لشکر تیار کیا اور اس کی روانگی کیلئے سخت تاکید فرمائی۔ اس کی بابت محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تحریر فرمایا ہے کہ :

"پھر دوسرے دن باوجود شدت مرض آنحضرتؐ نے اپنے دست مبارک سے ایک علم جنگ بنا کر اسامہ کو دیا اور فرمایا کہ "بسم اللہ جاؤ اور خدا کی راہ میں کفار سے جہاد کرو"۔ اسامہ نے باہر نکل کر وہ نشان بریدہ بن الحصیب کو دیا اور ان کو لشکر کا علمدار بنایا۔ پھر مدینہ سے روانہ ہو کر موضع جرف میں قیام کیا جو مدینہ منورہ سے قریب ہے تا ایں کہ فوج وہاں جمع ہوئی۔ پیغمبر صاحب نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ سوا علی کے کل اعیان مہاجرین و انصار یعنی حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ بن جراح وغیرہ ہم اس لشکر میں اسامہ کے ساتھ جائیں۔ بعض اصحاب پر یہ بات گراں گزری کہ آنحضرتؐ نے ایک غلام کو اکابر مہاجرین و انصار پر امیر مقرر فرمایا۔ چنانچہ انھوں نے سر مجلس چہ میگوئیاں کیں۔ جب یہ خبر رسول اللہ کے گوش مبارک تک پہنچی تو آنحضرتؐ رنجیدہ خاطر ہوئے اور باوجود تپ و سر درد حالت غضب محل

سرا سے باہر آکر منبر پر تشریف لے گئے اور آپ نے بطور خطبہ ارشاد فرمایا کہ ایہا الناس یہ کیا باتیں ہیں جو تم لوگ اسامہ کے امیر لشکر مقرر ہونے پر کر رہے ہو۔ جیسا کہ غزوۂ موتہ میں بھی تم نے پدر اسامہ کے سردار فوج ہونے پر کی تھیں۔ خدا کی قسم اسامہ سزاوار امارت ہے اور اس کا باپ بھی امیر فوج ہونے کے قابل تھا"۔ (حوالہ تاریخ احمدی ص: ۹۳)

مصنف مذکور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اسامہ بن زید نے حسب حکم نبوی لشکر گاہ میں جا کر کوچ کا حکم دیا اور جب وہ خود سوار ہونے لگے تو ان کی ماں (ام ایمن) نے خبر دی کہ رسول اللہ حالت نزع میں ہیں یہ سن کر اسامہ اور دیگر اشراف صحابہ واپس آئے اور حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ تو ہنوز مدینہ ہی موجود تھے۔

شدتِ مرض : ابتدا میں رسالتمآبؐ کو درد سر کی شکایت تھی جو مورخین کے بیان کے مطابق پانچ روز رہی۔ بقول مولانا شبلی نعمانی، رسالتمآبؐ نے اس حالت مرض میں بھی ازواج کی باری کا خیال رکھا اور از راہ عدل و کرم باری باری ہر ایک بیوی کے حجرے میں تشریف لے جاتے رہے"۔[1] یہانتک کہ جب پانچ روز بعد جو حضرت عائشہؓ کی باری کا دن تھا مرض میں شدت ہوئی تو آپؐ فضل بن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سہارے سے حضرت عائشہ کے حجرہ میں تشریف لائے اور وہیں قیام فرمایا۔ دیگر ازواج اور آپؐ کی دختر حضرت فاطمہ زہرہؑ بھی تیمارداری کی غرض سے وہیں آگئیں۔ حضرت علیؑ و دیگر بنی ہاشم بھی خدمت کیلئے ہمہ وقت وہاں حاضر رہے۔ نیز آپؐ کی علالت کی خبر سن کر صحابہ اکرامؓ کی ایک جماعت حجرۂ عائشہ کے باہر مجتمع رہی۔ الغرض رسالتمآبؐ کی علالت کے آخری آٹھ دن

[1] سیرۃ النبی ص: ۱۳۴ ج: ۲

تک حضرت عائشہ کا حجرۂ جلوت و خلوت کے بجائے حجرۂ علالت و عیادت بنا رہا۔ تاریخ ابن جریر میں بروایت عبید اللہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ :

"جناب رسول خدا اسی حالت میں فضل بن عباس اور ایک دوسرے مرد کے سہارے سے بایں صورت میرے گھر میں تشریف لائے کہ سر مبارک رومال سے بندھا ہوا تھا اور چلنے میں دونوں پاؤں کی رگڑ کا نشان زمین پر ہوتا جاتا تھا۔

عبید اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذکر عبد اللہ بن عباس سے کیا تو انھوں نے کہا کہ تم جانتے ہو وہ دوسرا مرد کون تھا جس کا نام عائشہ نے نہیں لیا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابن عباس بولے کہ وہ علی ابن ابیطالب تھے۔ لیکن عائشہ اس بات پر قادر نہ تھیں کہ علی کا ذکر نیکی کے ساتھ کر سکیں"۔ (تاریخ احمدی ص: ۹۲، تاریخ طبری ص: ۵۱۷ ج: ۱)

جناب رسالتمآبؐ کے شدت مرض میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور بخار کی حرارت کے باعث آپؐ کا جسم مبارک بہت زیادہ گرم رہنے لگا۔ عبد اللہ بن مسعود سے بسند صحیح مروی ہے کہ "میں ایام علالت میں جناب رسالتمآبؐ کی عیادت کو گیا۔ دیکھا کہ آپؐ کو شدید بخار لاحق ہے میں نے جسم مبارک پر ہاتھ رکھا تو اتنا گرم پایا کہ میں اس حرارت کی برداشت کا متحمل نہ رہا۔[1] مرض کی شدت کے باعث قوت جسمانی گھٹتی گئی یہانتک کہ نشست و برخاست بھی دشوار ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہادیٔ برحق اور رہبر کامل ہدایت مومنین اور وصیتِ مسلمین کے فرائض ادا فرماتے رہے۔ وفات سے تین یا چار روز قبل جب بخار شدید تھا تو آپؐ نے سات مشکوں سے غسل فرمایا جس سے بخار کی حرارت میں کمی اور طبعیت میں قدرے سکون ہوا تو آپؐ حضرت علیؑ اور حضرت عباسؓ کے سہارے مسجد میں تشریف لائے نماز

[1] روضۃ الاحباب ص: ۵۷۴۔

باجماعت پڑھائی اور طویل خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں حمد باری کے بعد شہدائے احد کیلئے دعائے مغفرت فرمائی۔ انصار کی تعریف و توصیف کی اور قریش کو ان کے نیک لوگوں سے نیکی کرنے اور بد لوگوں کو معاف کرنے کی ہدایت فرمائی۔

واقعہ پیش نمازی : رسالتمآبؐ کی شدید علالت کے آخری ایام میں پیش نمازی کے واقعہ کو خاص اہمیت دیجاتی ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا تذکرہ بڑی شدومد سے کیا جاتا ہے۔ درآنحالیکہ واقعات کے تسلسل سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے آخر وقت تک تمام نمازوں میں شرکت فرمائی۔ اس واقعہ سے متعلق ابن سعد نے متعدد روایتیں تحریر کی ہیں[1] جن میں سے چند روایتیں مختصراً پیش ہیں :

۱۔ عبید بن عمیر لیثی سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ کے حکم پر حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھانا شروع کیا لیکن آنحضرتؐ تشریف لے آئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کی آہٹ محسوس کر کے پیچھے ہٹنے لگے مگر آنحضرتؐ نے منع فرمایا اور آپؐ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ سے اجازت لیکر اپنی ایک بیوی کے گھر مقام سُنح چلے گئے۔

۲۔ انس بن مالک سے مروی ہے کہ دوشنبہ کو لوگ نماز کی صفوں میں تھے کہ آنحضرتؐ نے حجرہ کا پردہ کھول کر دیکھا۔ گو کہ لوگ نماز میں تھے مگر انہوں نے آنحضرت کا چہرہ دیکھا جو قرآن کے ایک ورق کے مانند تھا۔ حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے کہ صف میں شامل ہو جائیں اور آنحضرتؐ کیلئے جگہ خالی کر دیں کہ وہ نماز پڑھائیں لیکن آپؐ نے ہاتھ کے اشارہ سے منع فرمایا اور آپؐ واپس اندر چلے گئے۔ اسی روز آپؐ کی وفات ہوئی۔

[1] طبقات ابن سعد ص: ۳۱۸ تا ۳۲۷ ج: ۲

۳۔ عبید اللہ بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ جب رسول اللہؐ سخت بیمار ہوئے تو فرمایا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی۔ میں نے کہا نہیں یا رسول اللہ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپؐ نے وضو کیا اور کھڑے ہوئے لیکن نقاہت کے باعث کھڑے نہ ہو سکے۔ آپؐ نے تین بار یہ عمل کیا پھر آپؐ نے کہلا بھیجا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھاویں۔ ابوبکرؓ جو رقیق القلب تھے انہوں نے عمرؓ سے کہا کہ نماز پڑھادو۔ عمرؓ نے جواب دیا آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ آخر ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔ اس سے آگے حضرت عائشہؓ نے وہی بات بیان کی جو مندرجہ بالا نمبر ۲ روایت میں منقول ہے۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ دوشنبہ کی صبح آپؐ فضل بن عباس اور اپنے غلام ثوبان کے سہارے مسجد میں آئے۔ (عبید اللہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ، عباسؓ اور علیؑ کے سہارے مسجد میں تشریف لائے)۔ اس وقت لوگ پہلی رکعت کا سجدہ کر کے دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے صف میں شامل ہونے کیلئے پیچھے ہٹنا چاہا تو آپؐ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو جاء نماز پر بٹھا دیا۔ آنحضرتؐ بیٹھے تھے اور ابوبکرؓ آپؐ کے بائیں جانب کھڑے تھے۔

۵۔ حمزہ بن عبد اللہ بن عمر، ابو موسیٰ اور حضرت عائشہؓ سے علیحدہ علیحدہ روایتوں میں منقول ہے کہ شدید درد کی حالت میں آپؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو نماز پڑھا دیں اس پر حضرت عائشہؓ بولیں کہ یا رسول اللہؐ ابوبکرؓ رقیق القلب ہیں اس لئے آپؐ عمرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیں۔ آنحضرتؐ نے ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کی بات مزید دوبار کہا اور حضرت عائشہؓ نے ہر بار اپنی بات کو دہرایا۔ تب آنحضرتؐ نے فرمایا "تم یوسف کی ساتھ والیاں ہو"۔ اپنی اس بات کے جواز میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "میں یہ خیال کرتی تھی کہ جو شخص آپ کی جگہ کھڑا ہو گا لوگ اسے منحوس سمجھیں گے"۔

۶۔ عبد اللہ بن زمعہ سے مروی ہے کہ وہ رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر تھے کہ بلالؓ نے اذان دی۔ آپؐ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ لوگوں سے کہدو کہ نماز پڑھ لیں۔ عبد اللہ نے باہر نکل کر حضرت عمرؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے اور تکبیر کہی۔ آنحضرتؐ ان کی تکبیر بلند کی آواز سنی تو آپؐ نے حجرہ سے سر باہر نکال کر کہا "ابن ابی قحافہ (ابوبکر) کہاں ہیں۔ یہ خدا اور مسلمانوں کو پسند نہیں ہے"۔ لوگ حضرت ابوبکرؓ کو بلالائے لیکن وہ اس وقت آئے جب وہ نماز پڑھا چکے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔

۷۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے تکبیر کہی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی تکبیر سنی آپ نے غضب کی حالت میں سر نکالا اور فرمایا ابن ابی قحافہ (ابوبکر) کہاں ہیں۔

۸۔ محمد بن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ابوبکر بن عبد اللہ ابی سبزہ سے پوچھا کہ "ابوبکرؓ نے لوگوں کو کتنی نمازیں پڑھائیں جواب ملا کہ انہوں نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔ محمد نے پوچھا تم سے کس نے بیان کیا تو انہوں نے کہا مجھ سے ایوب بن عبد الرحمن بن صعصعہ نے بیان کیا اور ان سے عباد بن حتیم نے اور ان سے رسول اللہ کے ایک صحابی نے بیان کیا"۔ (واضح رہے کہ آخری راوی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک صحابی ہے)

۹۔ عکرمہ سے مروی ہے کہ "ابوبکرؓ نے لوگوں کو تین نمازیں پڑھائیں جن میں رسول اللہ بھی شریک تھے"

یہ وہ روایتیں ہیں جنہیں ابن سعد نے یکجا کر کے تحریر کیا ہے۔ دیگر کتب میں بھی ایسی روایتیں بالتفصیل مرقوم ہیں لیکن ان کی روشنی میں یہ تصفیہ کرنا کہ حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کے آخری ایام میں نماز پڑھائی انتہائی دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے صرف ایک روایت

بیان کر کے حاشیہ میں تحریر فرمایا کہ :

"کسی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کی زندگی میں کے دن تک نماز پڑھائی۔ ابن سعد نے واقدی سے دو روایتیں نقل کی ہیں ایک یہ کہ سترہ وقتوں کی نماز پڑھائی۔ دوسری یہ کہ تین دن تک امامت کی شب جمعہ کی عشاء سے دوشنبہ کی صبح تک۔ جس دن آپؐ نے وفات پائی۔ حساب لگایا جائے تو سترہ نمازیں ہوتی ہیں اور جمعہ سنیچر اتوار تین دن ہوتے ہیں۔ لیکن اصولاً یہ دونوں روایتیں بہت کمزور ہیں" (سیرۃ النبیؐ ص: ۱۳۵ ج: ۲)

گو کہ شبلی صاحب نے صرف تعداد نماز پر ہی اپنی رائے ظاہر فرمائی لیکن حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ پیش نمازی کے ہر ہر جزیات میں اختلاف پایا جاتا ہے خواہ وہ اوقاتِ نماز ہوں یا تعداد نماز، اذان نماز ہو یا امامت نماز کی حیثیت۔ کوئی کہتا ہے کہ امام رسولؐ تھے اور کوئی کہتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ان اختلافات پر علماء میں طویل بحثیں ہوئی۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتح الباری شرح صحیح بخاری۔ اس بحث و مباحثہ میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت تسلیم کرنے سے رسول تبع اور امام ماموم اور فاضل مفضول ہوا جاتا ہے جو عقلاً و نقلاً قطعی محال ہے۔ انہی اختلافی روایتوں کی روشنی میں حضرت ابوبکرؓ کی پیش نمازی سے خلافت ابوبکرؓ کا مفہوم تراشا گیا۔

واقعہ قرطاس : یہ مشہور اور اہم واقعہ رسالتمآبؐ کی وفات سے چار روز قبل یوم پنجشنبہ (جمعرات) کو دوپہر کے وقت کا بتایا جاتا ہے۔ جبکہ حدیث کا آغاز "حضر النبی صلعم" سے ہوتا ہے۔ حضر کے معنی احتضار کے ہیں اور احتضار وہ وقت ہوتا ہے جب انسان قریب وفات ہو اور اس پر سکرات کا عالم طاری ہو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ واقعہ قرطاس آپؐ کی وفات سے کچھ پہلے کا ہے یا زیادہ سے زیادہ یکشنبہ (اتوار) کا دن ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

دنوں میں اضافہ مخصوص مقاصد کے حصول کیلئے کیا گیا ہے۔ بہر حال اس روز آپؐ شدید علیل تھے بخار کی حرارت کو کم کرنے کیلئے کپڑے کو پانی میں تر کرکے آپؐ کے سر اور منہ پر پھیرا جا رہا تھا لیکن کسی طرح تسکین نہ ہو رہی تھی۔ اہلبیت اطہار اور ازواج محترمات پردے میں تھیں جبکہ ممتازین صحابہ سے حجرۂ علالت بھرا ہوا تھا۔ جب دوپہر کے وقت آپؐ کی طبیعت قدرے سنبھلی تو آپ نے کاغذ و قلم دوات طلب فرمایا۔ جس کی بابت صحیح مسلم میں مرقوم ہے کہ:

"حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب جناب رسول خدا کا وقت احتضار ہوا تو دولت کدۂ نبوت میں حضرت عمر بن خطاب اور دیگر اصحاب مجتمع تھے۔ رسول مقبول نے ارشاد فرمایا کہ آؤ میں تمہارے لئے کچھ (بطور وصیت) لکھ دوں تاکہ بعد ازاں تم گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمر بولے کہ پیغمبر صاحب غلبہ مرض کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں تمہارے پاس قرآن موجود ہے اور یہی ہمارے لئے کافی ہے۔ اس بات پر حضار جلسہ میں اختلاف واقع ہوا۔ بعض تو یہ کہتے تھے کہ رسول اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری ہے تاکہ آنحضرت جو کچھ چاہیں تمہارے لئے تحریر فرمائیں اور بعض حضرت عمر کے ہم زبان تھے۔ جب اس بات پر بہت شور و اختلاف ہونے لگا تو جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ پس حضرت ابن عباس فرماتے تھے کہ مصیبت اور بالکل مصیبت تھا وہ ماجرہ جو لوگوں کے شور و اختلاف کی وجہ سے آنحضرت کچھ لکھ نہ سکے۔" (ترجمہ تاریخ احمدی ص: ۹۸)

اس حدیث قرطاس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں سات مقامات پر تحریر فرمایا ہے جن کے عنوانات یہ ہیں: ۱۔ کتاب العلم، ۲۔ کتاب الجہ[...] ۳۔ کتاب الخمس، ۴۔ باب مرض النبی و وفات، ۵۔ ایضاً، ۶۔ کتا[...]

المرضی، ۷۔ کتاب الاعتصام۔ ہم یہاں پر صرف ایک حدیث کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"عبید اللہ بن عبد اللہ، ابن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلعم پر حالت احتضار طاری ہوئی تو لوگ آپ کے پاس گھر میں موجود تھے جن میں حضرت عمر بن خطاب بھی تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا مجھے قلم دوات دو کہ میں تم لوگوں کو ایک تحریر لکھ دوں پھر تم لوگ میرے بعد گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمر نے کہا کہ آپؐ کے اوپر مرض کی شدت ہے اس وجہ سے ایسا کہتے ہیں ہم لوگوں کے پاس قرآن موجود ہے اور ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے پس موجودہ لوگوں میں اختلاف ہوا بعض کہتے تھے کہ جناب رسول خدا صلعم کو سامان کتابت دیدیا جائے کہ وہ ہم لوگوں کیلئے ایک تحریر لکھ دیں کہ ہم لوگ گمراہ نہ ہوں اور بعض وہی کہتے تھے جو حضرت عمر کہہ چکے تھے۔ پس جب لوگوں میں شور و اختلاف کثیر ہوا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم سب کے سب میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ عبید اللہ کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن عباس کہا کرتے تھے کہ سب سے بڑی مصیبت وہ مصیبت تھی جو رسول اللہ صلعم کے کتابت لکھنے میں لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے اور شور مچانے کے باعث سے حائل ہوئی"۔ (کتاب باب المرضی، ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۴۴۰ ج: ۳)

اس کے علاوہ طبرانی نے حضرت عمرؓ کی زبانی بیان کیا ہے کہ

"جناب رسول خدا نے حالت مرض ارشاد فرمایا کہ کاغذ اور دوات وغیرہ (سامان کتابت) میرے پاس لے آؤ تاکہ میں ایک ایسا کتبہ لکھ دوں جس کی وجہ سے تم لوگ میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو (مگر کسی نے اس کی تعمیل نہ کی) مخدرات عصمت نے پردے کے اندر سے اصحاب کو مخاطب کرکے کہا کہ کیا تم لوگ رسول اللہ کا ارشاد نہیں سنتے ہو۔ حضرت عمر

نے ان بیبیوں کو جواب دیا کہ تمہاری مثال صواحبات یوسف کی ہے کہ پیغمبر صاحب کی بیماری میں روتی ہو اور وقت صحت ان کی گردن پر سوار ہو جاتی ہو۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ان عورتوں سے معترض نہ ہو یہ تم سے پھر بھی غنیمت اور بہتر ہیں"۔ (ترجمہ: تاریخ احمدی ص: ۹۷)

واقعہ قرطاس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسالتمآب کو یہ علم ہو چکا تھا کہ آپؐ نے خطبات کے ذریعہ جو نصیحتیں و ہدایتیں فرمائی تھیں ان کا لوگوں نے خاطر خواہ اثر قبول نہیں کیا تھا اور ان کی گمراہی کا اندیشہ آپؐ کے پیش نظر تھا لہٰذا اپنے آخری وقت میں آپ نے قوم کو گمراہی سے بچانے کیلئے تحریری ہدایت کا قصد فرمایا لیکن بدقسمتی سے اصحاب جانثاران کی موجودگی میں اللہ کے رسولؐ کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکی اور آنحضرتؐ کی موجودگی میں ہی اصحاب باوفا دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ رسالتمآبؐ کے ارشاد کی تکمیل کا خواہشمند تھا جبکہ دوسرا گروہ حضرت عمرؓ کے فرمان "حسـ[بنا] کتاب اللہ" کی تائید پر کمر بستہ تھا۔ مسلمانوں کے اس اختلاف کی بابت علامہ شہرستانی نے ملل والنحل میں تحریر کیا ہے کہ "پہلا تنازع و اختلاف رسول مقبول کے زمانہ مرض میں واقع ہوا وہ تھا جس کو بخاری نے کتاب صحیح میں اپنے اسناد کے ساتھ عبد اللہ بن عباس سے روایت کیا"۔ یعنی واقعہ قرطاس اس واقعہ سے آنحضرت کو شدید صدمہ پہنچا جس کا اظہار آپ نے یہ ارشاد فرما کر کیا کہ "قوموا عنی" میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ لہٰذا تمام مجمع اصحاب وہاں سے برخاست ہو گیا۔

جناب رسالتمآبؐ کے حکم "قوموا عنی" (میرے پاس سے اٹھ جاؤ) سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس وقت تک صحیح ہوش و حواس اور ہمہ عقل و ادراک سے کار فرما تھے اور صحابہ کے جا و بیجا طریقہ کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھ رہے تھے۔ ایسے میں آپؐ پر غلبہ مرض، ہذیان اور بدحواسی کا اتہام کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

حضرت علی کی طلبی:

جناب رسالتمآبؐ کے پاس سے جب سب لوگ چلے گئے تو آپؐ نے سر اٹھا کر حضرت علیؑ کو طلب فرمایا۔ اس واقعہ کی بابت حافظ ابن جریر طبری نے ابن عباسؓ کی یہ روایت تحریر کی ہے کہ "جناب رسالتمآبؐ نے اسی بیماری کی حالت میں ارشاد فرمایا کہ علیؑ کو میرے پاس بلاؤ حضرت عائشہؓ نے کہا کاش آپؐ ابوبکرؓ کو بلاتے اور حضرت حفصہؓ نے کہا کہ کاش آپؐ عمرؓ کو بلاتے۔ اتنے میں یہ حضرات وہاں مجتمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تم لوگ واپس جاؤ اگر تمہاری ضرورت ہو گی تو میں خود بلاؤں گا۔ یہ سن کر وہ حضرات چلے گئے۔"[1]

اس واقعہ کو حافظ جمال الدین محدث شیرازی نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ (جناب رسالتمآبؐ نے) فرمایا "میرے بھائی علیؑ کو بلاؤ۔ حضرت علیؑ آئے اور جناب رسالتمآبؐ کے سرہانے بیٹھ گئے۔ آنحضرتؐ نے اپنا سر اٹھا کر ان کے بازو پر رکھ دیا۔ اور حضرت امیر کو اپنی بغل میں لے لیا اور ارشاد فرمایا کہ اے علیؑ فلاں یہودی سے میں نے لشکر اسامہ کے سامان کیلئے اس قدر قرض لیا ہے۔ خبردار اس کو میری طرف سے ادا کر دینا اور اے علیؑ تم وہ شخص ہو جو سب سے پہلے میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہو گا۔ اور میرے بعد تم کو بہت سے مکروہات امور پیش آئیں گے ان پر طریق صبر و برداشت کرنا اور جب دیکھنا کہ لوگوں نے دنیا اختیار کی تو تم آخرت کو اختیار کرنا"۔[2]

وفات پیغمبر ﷺ کے بعد پیش آنے والے واقعات پر حضرت علیؑ کے صبر و تحمل کی سب سے بڑی وجہ رسالتمآب کی یہی آخری وصیتیں تھیں جو آپؐ نے [...] واقعات کا جائزہ لیکر اور لوگوں کی طرف سے پورے طور پر مایوس ہو کر حضرت علیؑ سے اپنے آخری دنوں میں فرمائی تھیں۔

[1] تاریخ احمدی ص: ۹۵، تاریخ طبری ص: ۵۲۵ ج: ۱ [2] اسوۃ الرسول [...] ج: ۳

قربِ وفات: دوسرا دن دوشنبہ (پیر) کا دن تھا۔ یہ دن غضب کا دن اور اس کی صبح قیامت کی صبح تھی۔ خاتم النبین مرض الموت کے تیرہ دن شدید علالت میں گزار کر ختم ہونے والے تھے۔ شمع ارشاد وہدایت ہمیشہ کیلئے گل ہونے والی تھی۔ وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو رہا تھا۔ اور برکات لامتناہی مسدود ہونے والی تھیں۔ یہی وہ دن تھا جب شدتِ مرض کے باعث ختم المرسلینؐ پر پے درپے غشی طاری ہو رہی تھی۔ جب ہوش آتا آنکھیں کھول دیتے پھر بند کر لیتے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک بار آنکھ کھلی تو اپنی پیاری بیٹی کو سرہانے روتے دیکھا۔ ارشاد فرمایا: اے فاطمہؑ! اپنے فرزندوں کو بلاؤ۔ حضرت فاطمہ زہراؑ حسنین علیہم السلام کو آنحضرتؐ کے پاس لائیں۔ دونوں صاحبزادے اپنے نانا کے پہلو میں بیٹھ گئے اور آپؐ کی حالت کو دیکھ کر گریہ کرنے لگے حضرت حسنؑ نے اپنا منہ نانا کے منہ پر اور حضرت حسینؑ نے اپنا سر آنحضرتؐ کے سینہ پر رکھ دیا۔ حضرت رسول خداؐ نے آنکھیں کھولدیں اور صاحبزادوں کو بنظر شفقت والفت پیار کرنے لگے۔ بچوں کا گریہ دیکھ کر حاضرین بھی رونے لگے۔ ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ حسنین علیہم السلام کے رونے سے جو اصحاب در دولت پر حاضر تھے ایسا روئے کہ ان کی آواز گریہ سن کر خود آنحضرتؐ رونے لگے۔[1]

حضرت علیؑ سے آخری رخصت: اس کے بعد رسلمتابؐ نے حضرت علیؑ کو بلایا جب وہ آئے تو آپؐ نے ان کو اپنی چادر میں لے لیا اور ان کی آغوش میں سر رکھ کر نہایت آہستگی سے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے اور اسی حالت میں رحلت فرمائی۔ اس ضمن میں چند اقتباسات پیش ہیں:

"عبداللہ بن محمد بن عمر بن علیؑ بن ابیطالب نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض موت میں فرمایا کہ میرے بھائی کو بلاؤ علیؑ

[1] روضۃ الاحباب ترجمہ: تاریخ احمدی ص: ۹۹

بلائے گئے آنحضرتؐ نے فرمایا میرے قریب ہو جاؤ، علیؑ نے کہا کہ میں آپؐ کے قریب ہو گیا، آپؐ نے مجھ پر تکیہ لگایا، آپؐ برابر مجھ سے تکیہ لگائے رہے اور گفتگو فرماتے رہے، نبی ﷺ کا کچھ لعاب دہن بھی میرے لگتا رہا، رسول اللہ ﷺ پر موت نازل ہوئی میری آغوش میں آپ کو مرض کی شدت ہو گئی تو میں نے پکارا، اے عباسؓ مجھے سنبھالو، میں ہلاک ہوتا ہوں، عباسؓ آئے، دونوں نے مل کر آپ کو لٹا دیا"۔

(طبقات ابن سعد ص: ۳۶۲ ج: ۲)

امام فخر الدین رازی اور امام دار قطنی لکھتے ہیں کہ:

"جناب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آیا فرمایا میرے حبیب کو بلاؤ، میں نے حضرت ابو بکرؓ کو بلا بھیجا جب وہ آئے تو حضرتؐ نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا اور تکیہ پر رکھدیا اور فرمایا میرے حبیب کو بلاؤ میں نے جناب عمرؓ کو بلا بھیجا آپؐ نے سر اٹھا کر ان کو بھی دیکھا اور تکیہ پر رکھ دیا، اور فرمایا میرے حبیب کو بلاؤ تب میں نے لوگوں کو کہدیا افسوس ہے تم پر جناب علیؑ کو بلاؤ حضرتؐ ان کے سوا اور کسی کو طلب نہیں فرماتے جب حضرتؐ نے ان کو دیکھا تو وہ کپڑا جو آپؐ اوڑھے ہوئے تھے آپؐ نے اٹھا دیا اور علیؑ کو اس میں لے لیا اور علیؑ حضرتؐ سے بغل گیر رہے جب تک کہ حضرتؐ کا انتقال ہو گیا"۔ (ارجح المطالب ص: ۷۳۹)

ابن سعد نے تحریر کیا ہے کہ:

"ابی غطفانؓ سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا: کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپؐ کی وفات ہوئی اور آپؐ کا سر کس کی آغوش میں تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپؐ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپؐ علیؑ کے سینہ سے تکیہ لگائے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ

عروہ نے عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات میرے آغوش میں ہوئی، ابن عباسؓ نے کہا کہ کیا تمہیں عقل ہے؟ واللہ رسول اللہ ﷺ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپؐ علیؑ کے سینہ سے تکیہ لگائے ہوئے تھے، علیؑ وہ شخص ہیں کہ انہوں نے اور میرے بھائی فضل بن عباسؓ نے آپ کو غسل دیا"۔ (طبقات ابن سعد ص: ۳۶۷ ج: ۲)

خصائص نسائی میں حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ:

"قسم ہے خدا کی قریب ترین مردم بوقت وفات سرور کائناتؐ علیؑ ابن ابیطالب ہیں یعنی جس دن آنحضرتؐ کا انتقال ہوا اسی کی صبح کو آپؐ نے فرمایا کہ علیؑ کو بلاؤ جنہیں کسی کام کیلئے بھیجا تھا اور جب تک وہ نہ آئے تین بار دریافت کیا کہ علی آئے۔ اتنے میں علیؑ آفتاب نکلنے سے پہلے آگئے۔ پس ہم لوگ یہ گمان کر کے کہ غالباً رسول اللہ کو علیؑ سے کوئی حاجت ہے خانہ عائشہؓ سے باہر نکل آئے اور میں سب کے بعد نکل کر دوسری عورتوں کی نسبت دروازے سے قریب بیٹھی چنانچہ میں نے دیکھا کہ علیؑ نے رسول اللہ کی جانب اپنا سر جھکایا اور آنحضرتؐ ان سے بطور سرگوشی راز کی باتیں کرتے رہے پس علیؑ ہی وہ شخص ہیں جو رسول مقبولؐ کے آخری وقت آنحضرتؐ کے پاس تھے۔ نیز مستدرک حاکم میں ہے کہ رسول اللہ صلعم وقتِ وفات تک حضرت علیؑ سے راز کے امور ارشاد کرتے رہے اس کے بعد ہی آپؐ نے انتقال فرمایا"۔ (ارجح المطالب ص: ۳۹۷، تاریخ احمدی ص: ۱۰۲)

وفاتِ پیغمبرؐ: مرقومہ بالا روایات سے ثابت ہو گیا کہ ایام مرض میں شدتِ مرض کے باوجود زندگی کے آخری لمحات تک اللہ کے رسولؐ صحیح العقل اور سالم المزاج تھے لیکن سخت مجبوریوں اور مشکلوں سے دوچار تھے۔ بقول فوق بلگرامی تجویز رسالت اور صحابہ کی قوتِ اجتہاد دو متضاد صورتیں باہم متصادم تھیں۔ رسول اللہ صلعم کی موجودہ حالت، مرض کی شدت،

ضعف واضمحلال، بیکسی و مجبوری، بیماری و بے یاری، سوائے سکوت اور خاموشی کے اور کیا کر سکتی تھی۔ رسول الثقلینؐ بستر مرگ پر وصیت نہیں کر سکتا۔ شہنشاہ کونین اپنے خاص عزیز سے مرتے دم رخصت نہیں ہو سکتا وہ آخری وصیت کیلئے اپنے حبیب خاص اپنے قریب مخصوص کو بلاتا ہے پیش کئے جاتے ہیں دوسرے لوگ، وہ صورت دیکھتا ہے اور مدعا کے خلاف پا کر خاموشی سے پھر بالش علالت پر سر کو رکھدیتا ہے اور آنکھیں بند کر دیتا ہے، کہیں جا کر تیسری مرتبہ اس کی خواہش پوری کی جاتی ہے۔ وہ اپنے حبیب اور قریب خاص کو دیکھکر اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈالدیتا ہے۔ جو عموماً ہر ملک اور قوم میں رخصت ہونے کا دستور ہے۔ ردائے مبارک اٹھا کر اس کو اپنی ردا میں لے لیتا ہے اور مرتے وقت جو کچھ وصیت آخر کی صورت میں کہنا ہوتا ہے کہدیتا ہے۔۔۔۔ وقت پورا ہو جاتا ہے خدا کی بارگاہ سے طلبی آجاتی ہے اور وہ بکمال سکون و اطمینان الرفیق الاعلی کہتا ہوا اور الصّلوۃ و ماملکت ایمانکم کی آخری وصیت فرماتا ہوا خارستان دنیا سے چمنستان عقبیٰ کی طرف تشریف لے جاتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون انك میت و انھم میتون اللّٰھمّ صلّ و بارك وسلّم علی محمد سید المرسلین و اٰلہ الطّیبین صلوۃً و سلاماً کثیراً کثیراً۔[1]

وفاتِ پیغمبر پر گریہ و بکاء: جناب رسلمتابؐ کی وفات کے وقت اہلبیت اطہار، ازواج محترمات اور صحابہ اکرام کی گریہ وزاری کا ذکر کرنے سے بعید مورخین گریز کرتے ہیں۔ جیسا کہ مولانا شبلی صاحب و دیگر حضرات نے اس لازمۂ فطرت اور خاصۂ طبعیت انسانی کو تحریر کرنے سے اجتناب برتا ہے۔ جس کی ممکنہ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کے بیان کرنے سے جواز گریہ و بکاء کی صورت قائم ہو جائے گی جو آگے چل کر سید الشہداء حضرت امام

[1] اسوۂ الرسول ص: ۱۷۳ ج: ۳

حسینؑ کے ممانعتِ بکاء کی مخالفت ثابت ہو گی۔ نیز اسی خدشہ کے پیشِ نظر کتب قدیم کے بعض مترجمین نے بھی ترجمہ کرتے وقت تامل اندیشی، نتیجہ شناسی اور باریک بینی سے کام لیتے ہوئے حزم و احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی قدما کے چند ایسے بیانات موجود ہیں جن سے بوقتِ وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گریہ وزاری کے شواہد ملتے ہیں ہم انہی بیانات کی روشنی میں اس وقت کے واقعات تحریر کر رہے ہیں۔

جناب رسول خدا صلعم کی آنکھیں بند ہوتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ گریہ و بکاء کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ویسے تو جملہ حاضرین اس صدمہ جانکاہ سے بے حال تھے لیکن جناب فاطمہ زہراؑ کی بیتابی و بیقراری شدید رقت آمیز تھی۔ روضۃ الاحباب میں محدث شیرازی تحریر کرتے ہیں کہ :

"روایت صحیحہ میں منقول ہے کہ جب آنحضرت صلعم نے انتقال فرمایا تو جناب فاطمہ زہراؑ فرط گریہ وزاری میں فرمانے لگیں۔ اے پدر بزرگوار آپ نے خداوند عالم کی دعوت قبول فرمائی اور جنت الفردوس میں منزل گزیں ہوئے۔ اے پدر عالیقدر کون ہے جو آپ کی وفات کی خبر جبرئیل کو پہنچادے۔ منقول ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کسی نے پھر جناب فاطمہ زہراؑ کو ہنستے نہیں دیکھا"۔

(ترجمہ : اسوۃ الرسول ص: ۳۷۳ ج: ۳)

مدارج نبوۃ میں محدث دہلوی نے مزید تحریر کیا ہے کہ :

"ہائے اے والد نامدار آپ کے بعد جبرئیل وحی خدا لیکر کس پر نازل ہوں گے۔ خدایا تو میری روح کو آنحضرتؐ کی روح کے پاس پہنچادے۔ الٰہی مجھے اپنے رسول کے جوار رحمت میں جگہ دے۔ پروردگار میرے مجھ کو اپنے حبیب کے ثواب سے بے نصیب نہ رکھ اور قیامت کے دن ان کی شفاعت سے محروم نہ فرما"۔ (ترجمہ : تاریخ احمدی ص: ۱۰۱)

ابن سعد نے حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث میں یہ جملہ بیان کیا ہے کہ "میں عورتوں کے ساتھ کھڑی ہو کر چیخنے لگی اور سر اور منہ پیٹنے لگی"۔[1] ابن ہشام نے یحیٰی بن عباد بن عبداللہ بن زبیر سے حضرت عائشہؓ کی یہی حدیث بیان کرتے ہوئے یہ جملہ اس طرح لکھا ہے کہ "اور کھڑے ہو کر عورتوں کے ساتھ سینہ کوٹنا اور ہاتھ چہرہ پر مارنا شروع کردیا"۔[2] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں موجود تمام خواتین گریہ و بکاء اور سر و سینہ کوبی کر رہی تھیں جن کے ساتھ حضرت عائشہؓ بھی شریک تھیں۔

مرثیہ : جناب رسالتمآبؐ کی وفات پر بہت سے لوگوں نے مرثیے کہے۔ ابن سعد نے ان میں سے حضرت ابوبکرؓ، عبداللہؓ بن انس، حسان بن ثابت، کعب بن مالک، اروٰی بنت عبدالمطلب، عاتکہ بنت عبدالمطلب، صفیہ بنت عبدالمطلب، ہند بنت حارث بن عبدالمطلب، ہند بنت اثاثہ بن عباد بن مطلب، عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل اور ام ایمن کے مرثیے طبقات میں نقل کئے ہیں۔ ہم یہاں پر ہند بنت اثاثہ کا مرثیہ نقل کرتے ہیں :

اشاب ذؤابتی و أذل رّ کنی — بُکاؤك فاطمه المیت الفقیدا

اے فاطمہ اس مرنے والے پر تیری گریہ نے میرے بال سفید کر دیئے اور قد جھکا دیا۔

فاعطیت العطاء فلم تکدّر — واخدمت الوﻻئد و الحیدا

حضرتؐ، آپ اس طرح عطا دیتے تھے کہ کسی کو کدورت نہ ہوتی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں اور غلاموں کی بھی آپ خدمت کرتے تھے۔

و کنت ملاذ ناقی کل لذب — اذاهبّت شآمیه برُو دا

ہر ایک مشکل میں آپ ہمارے لئے جائے پناہ تھے، جب ٹھنڈی ہوا چلتی اور ٹھنڈ ہوتی تو آپ ہی آرام پہنچاتے

[1] طبقات ابن سعد ص: ۳۶۶ ج: ۲ [2] سیرت ابن ہشام ص: ۸۰۳ ج: ۲

وانّك خیر من رکب المطایا — اکرمهم اذانُسبو اجدودا

جتنے لوگ سواریوں پر سوار ہوئے آپ ان سب میں بہترین تھے اور نسب میں شریف ترین تھے۔

رسول الله فارقناو کنّا — نرجّی ان یکون لناخلودا

رسول اللہ (صلعم) ہم سے جدا ہو گئے، ہم تو اپنے لئے حیات کے منتظر تھے۔

افاطم ناصبری فلقدا صابت — رذیتك النهائم و النجد دا

اے فاطمہ، اب صبر کر تیری مصیبت نے تہامہ و نجد تک کو غمزدہ کر رکھا ہے۔

واهل البرد الابحار طرّاً — فلم تخطئ مصیبته وحیدا

خشکی و تری والے سب اس میں شریک ہیں، اس مصیبت نے کسی کو تنہا نہیں چھوڑا۔

وکان الخیر یصبح فی ذراه — سعید الجدّ قد ولد السعودا

آپ کے دامن سے خیر و فلاح کی صبح طلوع ہوا کرتی، آپ نیک طینت تھے، نیک بختی آپ سے پیدا ہوا کرتی۔ (طبقات ابن سعد ص: ۳۳۶ ج: ۲)

ایک طرف تو لوگ گریہ وزاری کر رہے تھے اور دوسری طرف حضرت عمرؓ نہ تو خود یہ تسلیم کرنے پر آمادہ تھے کہ آنحضرتؐ نے رحلت فرمائی اور نہ ہی لوگوں کو یہ کہنے کی اجازت دے رہے تھے۔ اس ضمن میں ابن سعد کا بیان ہے کہ :

"انس بن مالک سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو لوگ رونے لگے، عمر بن خطاب مسجد میں خطیب بن کر کھڑے ہوئے اور کہا میں ہرگز کسی کو یہ کہتے نہ سنوں کہ محمدؐ مر گئے"۔

(طبقات ابن سعد ص: ۳۶۹ ج: ۲)

مولانا شبلی نعمانی نے تحریر کیا ہے کہ :

"حضرت عمر اس قدر خود رفتہ ہوئے کہ مسجد نبوی میں جا کر اعلان کیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی اس کو قتل کر ڈالوں گا"۔

(الفاروق ص: ۱۱۶)

جناب محدث شیرازی لکھتے ہیں کہ :

"حضرت عمر کے اس قول کو سنکر لوگ شک میں پڑ گئے کہ آنحضرت کا انتقال ہوا یا نہیں۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ اپنے مکان واقع سخ میں تھے۔ ان کو رسول اللہؐ کے انتقال کی خبر دی گئی تو فوراً سوار ہو کر روتے ہوئے اور وا محمد کہتے ہوئے روانہ اور مسجد نبوی میں آکر دیکھا کہ لوگ مختلف الحال ہو رہے ہیں"۔

(روضۃ الاحباب ص: ۵۹۳)

حضرت ابوبکرؓ سیدھے رسول اللہؐ کو دیکھنے گئے پھر مسجد میں آکر لوگوں کو آپ کی وفات کا یقین دلانے کے لئے انہوں نے چند آیات کی تلاوت فرمائی جن میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۴ بھی تھی۔ تب لوگوں کو اور خصوصاً حضرت عمرؓ کو آپ کی وفات کا یقین ہوا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ "بعض کہنے والوں نے کہا کہ واللہ ابوبکرؓ کے تلاوت کرنے تک گویا یہ لوگ جانتے ہی نہ تھے کہ یہ آیت بھی نازل کی گئی ہے"۔[1] اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے صحابہ اکرام کو پورا قرآن یاد نہ تھا۔

تاریخِ وفات : جناب رسالتمآبؐ کی تاریخ وفات مرویات اہلبیت کے مطابق ۲۸ صفر ۱۱ھ بروز دوشنبہ (پیر) مقرر و متعین ہے۔ لیکن اہل سنت کے ہاں تاریخ وفات کے تعین میں راویوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محدثین اور سیرت نگاروں کا اس امر پر اجماع عام ہے کہ آپ کا سال وفات ۱۱ھ، مہینہ ربیع الاوّل، یکم سے بارہ ربیع الاوّل تک کوئی ایک تاریخ اور دوشنبہ (پیر) کا دن تھا۔ ارباب سیرت نے یکم، دوئم اور دوازدہم یعنی بارہ تاریخ والی روایتوں کو اہمیت دی ہے۔ جناب مولانا شبلی نعمانی صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے تاریخی ماخذوں اور مہینوں کے جدول کی مدد سے تحقیق کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی صحیح تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ

[1] طبقات ابن سعد ص: ۲۷۲ ج: ۲

بروز دوشنبہ ہے۔[1] جبکہ جناب فوق بلگرامی صاحب نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یکم ربیع الاوّل یوم وفات نہیں بلکہ یوم تدفین ہے اور یوم وفات بروز دوشنبہ ۲۸ صفر ہی ہے جیسا کہ اہلبیت سے روایت ہے۔ ویسے بھی مرنے والے کی وفات کا دن تاریخ وہی جو گھر والے بیان کریں مصدقہ ہوتا ہے۔

انتقال کے وقت آپ کی عمر شریف تریسٹھ سال کی تھی۔ یہی جمہور کا قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور بعض پینسٹھ اور بعض ساٹھ سال بتلاتے ہیں۔

(فتح الباری ص: ۱۱۴ ج: ۸)

تجہیز و تکفین و تدوین: دوشنبہ کی دوپہر رسالتمآب کا انتقال ہوا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی خفگی کے باعث مسلمان تذبذب کا شکار تھے۔ جب حضرت ابوبکرؓ مقام سنح سے تشریف لائے اور حالات کا جائزہ لیکر انہوں نے قرآنی آیات تلاوت فرمائی اور آنحضرتؐ کی وفات کا اعلان فرمایا تب لوگوں کو وفاتِ رسول کا یقین ہوا۔ اس ساری کارگزاری میں دوشنبہ کا دن گزر گیا۔ دوسرے روز یعنی سہ شنبہ کو رسالتمآبؐ کی تجہیز و تکفین پر توجہ دی گئی۔ لیکن اس سے قبل ہی کسی مخبر نے آکر حضرت ابوبکرؓ کو خبر دی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور خلافت کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے تجہیز و تکفین رسولؐ کے امور کو بنی ہاشم سے مخصوص جانا اور خود حضرت عمرؓ کے ہمراہ سقیفہ روانہ ہو گئے۔ صواعق محرقہ، شرح مواقف، عقائد نسفی وغیرہ کتب میں یکساں مضمون کی یہ عبارت مندرج ہے کہ "مقتدایان دین نے بعد وفات رسول اللہ صلعم نصب امام کو اہم ترین مسائل تجویز کیا۔ یہانتک کہ اس کو دفن رسولؐ پر مقدم فرمایا"۔[2]

[1] سیرۃ النبی ص: ۱۳۹ ج: ۲ [2] ترجمہ: اسوۃ الرسول ص: ۴۹۰ ج: ۳،

غسلِ میتِ رسولؐ کی بابت محدث شیرازی کا بیان ہے کہ حضرت عباسؓ، حضرت علیؑ فضل و قثم پسران عباس، اُسامہ بن زید، صالح حبشی جو آنحضرت صلعم کے آزاد کردہ غلام تھے اور جن کا لقب شقران تھا آپ کو اٹھا کر حجرہ میں لے آئے اور غسل میں مصروف ہوئے۔ حضرت عباس نے کما کو اڑ بند کر دو اور غسل میں سوائے ان چھ آدمیوں کے اور کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔[1]

ابن الوردی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے غسل کے متولی حضرت عباس، علیؑ، فضل و قثم ابنائے عباس، اسامہ بن زید و شقران مولی رسولؐ تھے۔ عباس اور ان کے صاحبزادے میت مبارک کو اس طرف اُس طرف پھیرتے تھے۔ اسامہ و شقران پانی ڈالتے تھے اور حضرت علیؑ غسل دیتے تھے۔ ابن ہشام اور طبری وغیرہ نے بھی مذکورہ بیان تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت علیؑ غسل دیتے وقت کہتے جاتے تھے کہ "آپ پر میرے ماں باپ قربان زندگی میں بھی آپ کتنے اچھے معلوم ہوتے تھے اور مرنے کے بعد بھی آپ کتنے اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔[2]

غسل کے بعد تکفین کا مرحلہ آیا جس کی بابت ابن اسحاق کا بیان ہے کہ "پھر جب آپؐ کے غسل سے فراغت ہوئی تو آپ کو تین کپڑوں یعنی دو کپڑے صحاری اور ایک حبری چادر کا کفن بنایا گیا اور ان میں دفنا دیا گیا۔ جیسا کہ مجھ سے جعفر بن محمد بن علی بن حسین (علیہما السلام) نے اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا علی بن حسینؑ اور زہری نے بھی علی بن حسین کی روایت بیان کی ہے"[3] اور محدث شیرازی نے تحریر کیا ہے کہ "ایک روایت میں منقول ہے کہ دو جامہ سفید اور ایک برد یمانی کا آپ کو کفن دیا گیا اور مشک و حنوط کفن مبارک اور سجدہ کی جگہوں پر مل دیا گیا۔ جب ان امور سے فراغت ہو گئی تو آپ کے جنازہ کو چارپائی پر آپ کی وصیت کے مطابق رکھدیا"۔[4]

[1] روضۃ الاحباب ص: ۵۶۳، [2] سیرۃ ابن ہشام ص: ۸۱۴ ج: ۲، تاریخ طبری ص: ۵۴۰ ج: ۱ [3] سیرۃ ابن ہشام ص: ۸۱۵ ج: ۲ [4] روضۃ الاحباب ص: ۵۶۳

مدینہ میں دو آدمی قبر کھودتے تھے ان میں ایک ابو عبیدہ بن جراح تھے جو اہل مکہ کی طرز پر شق یا ضریح (سیدھی قبر) کھودتے تھے دوسرے ابو طلحہ زید بن سہل تھے جو اہل مدینہ کی طرز پر لحد (بغلی قبر) کھودتے تھے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ جب عباس نے رسول اللہ صلعم کیلئے قبر کھودنے کا ارادہ کیا تو مدینہ میں دو شخص تھے۔ ابو عبیدہ بن جراح جو اہل مکہ کیلئے ضریح کھودتے تھے اور ابو طلحہ انصاری کہ اہل مدینہ کیلئے لحد کھودتے تھے۔ عباسؓ نے دونوں کو بلانے کیلئے آدمی بھیجے۔ اور دعا کی "اے اللہ اپنے رسول کیلئے گورکن کا انتخاب فرما"۔ ابو طلحہ آگئے اور انہوں نے آپ کیلئے لحد کھودی۔[1]

جب جنازہ اور قبر تیار ہو گئی تو نماز جنازہ پڑھی گئی سب سے پہلے حضرت علیؑ نے جنازہ کے سرہانے کھڑے ہو کر نماز پڑھی اس کے بعد لوگ آتے گئے نماز پڑھتے گئے اور واپس جاتے گئے۔ غرض جو آئے وہ آئے اور جو نہ آئے وہ نہ آئے جناب رسول مقبول دفن ہو گئے۔ دفن کے بعد آنے والوں نے قبر مبارک پر نماز پڑھی۔ نماز کے موقع پر حضرت علی نے فرمایا کوئی شخص امامت نہ کرے اس لئے کہ پیغمبر حالت حیات و ممات دونوں میں تمہارا امام ہے۔ نماز کے بعد میت رسول کو حضرت علیؑ، فضل بن عباس، قثم بن عباس اور شقران نے قبر میں اتارا۔ اور آپؐ کی چادر (قطیفہ) بھی قبر میں رکھدی گئی جو آپ استعمال کرتے تھے۔ اس وقت شقران نے کہا "خدا کی قسم! آپؐ کے بعد اسے کوئی بھی نہ پہنے گا"۔

کنز العمال میں عروہ سے مروی ہے کہ پیغمبر صاحب کے دفن کے وقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ موجود نہ تھے بلکہ (مقام سقیفہ بنی ساعدہ) مجمع انصار میں تشریف رکھتے تھے اور قبل اس کے کہ یہ دونوں صاحب وہاں سے واپس آئیں رسول اللہ دفن ہو چکے تھے۔[2]

[1] طبقات ابن سعد ص: ۲۹۹ ج: ۲، [2] حوالہ تاریخ احمدی ص: ۱۱۰۔

ازواج النبیؐ

مخالفین و منافقین نے ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو کو نشانہ ہدف بنایا اور آپؐ کے ہر عمل صالح پر اعتراضات کئے۔ حتیٰ کہ آپؐ کی ازدواجی زندگی کو بھی داغدار بنانے کیلئے رکیک حملے کئے گئے۔ رسالتمآبؐ کے متعدد نکاح فرمانے پر بعض مستشرقین کے اعتراض کی بابت مولانا شبلی نعمانی نے تحریر کیا ہے کہ:

"وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی مکی زندگی میں جس قناعت و زہد اور ولولۂ توحید کے ساتھ عورتوں کی طرف اپنی بے رغبتی کا ثبوت پیش کیا، مدینہ پہنچ کر اس میں زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور آپؐ نے وہاں متعدد شادیاں محض شہوت سے مغلوب ہو کر کیں۔ اور نہ صرف ایسی عورتوں کو اپنے عقد میں لائے جن کے سر پر ان کے شوہر نہ تھے بلکہ شوہردار بیویوں کو ان کے شوہروں سے طلاق دلوا کر اپنے حبالۂ عقد میں لانا شروع کیا"۔ (سیرۃ النبیؐ ص: ۴۰۲ ج: ۲)

اس قسم کے گھٹیا اور بدنیتی پر مبنی اعتراضات بلاشبہ اس مواد کے باعث پیدا ہوئے ہیں جو مسلمانوں کی تاریخ میں جابجا موجود ہیں۔ انہی کو بنیاد بنا کر اور شان رسالت کی عظمت کو سمجھے بغیر نیز اللہ کے نبیؐ کو اپنا جیسا شہوانی خواہشات سے مغلوب انسان تصور کر کے معترضین اس قسم کے نازیبا الفاظ تحریر کرتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ اقتباس کی آخری سطور میں حضرت زینب بنت جحش کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کیلئے مسلمان مورخین نے وافر مواد فراہم کیا۔ جس کو پڑھ کر مسلمانوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں جبکہ

مستشرقین، مخالفین اور معترضین کے لئے یہ سرمایہ ناز ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے مواد کی بابت دو اقتباسات پیش ہیں۔ جناب فوق بلگرامی نے تحریر کیا ہے کہ :

"اسلام کے ساتھ عیسائیوں کی عیب جوئی اور غلط گوئی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مبلغین شریعت ہمیشہ ہدف ملامت بنتے چلے آئے ہیں۔ مخالفین اپنی فطرتی کج فہمی سے ان کے محاسن کو بھی بدنما صورت میں دکھاتے آئے ہیں۔ جناب زینب کا واقعہ بھی اسی کی مثال ہے۔ اس واقعہ میں منشائے قدرت، مدارج رسالت، مقتضائے عدالت تو وہی تھا جو بالتفصیل اوپر بیان ہو چکا ہے۔ معترضین کو اس کے اصل مدعا سے تو کوئی غرض ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے محاسن سے کوئی واسطہ۔ ہاں جاہل مشرکین اور مفسد منافقین کے ہم زبان بن کر اس پر وہی اعتراض کرتے ہیں جو مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ ان سے ہزار برس پہلے سے کرتے آئے ہیں۔ ان کی تعریضات میں سوائے نفسانیات کے نہ کوئی اصلیت ہے نہ حقیقت"۔ (اسوۃ الرسول ص :۵۶۱ ج :۲)

مولانا شبلی نعمانی ایسی روایتوں کی بابت تحریر فرماتے ہیں کہ :

"مورخ طبری نے واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے صرف یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔ طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں"۔

(سیرۃ النبیؐ ص :۴۴۴ ج :۱)

مسلمانوں کی تاریخ میں ازواج النبیؐ سے متعلق ایسی بہت سی روایتیں موجود ہیں جو نہ صرف ازواج مطہرات کی شان کے خلاف ہیں بلکہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے بھی منافی ہیں۔ گو کہ ایسی روایتیں سر تا پا کذب و افترا ہیں۔ لیکن معترضین و مستشرقین کی رنگ آرائی

کیلئے روشنائی کا کام دیتی ہیں اور ایسی ہی روایتیں مردود پنڈت راج پال کو "رنگیلا رسول" رشدی ملعون کو "سائنک ورسیز" اور مستشرقین کو توہین رسالت کے لئے مواد فراہم کرتی ہیں۔

رسالتمآبؐ کی پوری زندگی مرضی الٰہی کے تابع اور آپ کا نفس اطاعت خداوندی کا مظہر تھا۔ آپ نے جتنے بھی عقد فرمائے وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق اور دین کی تبلیغ کے لئے انتہائی ضروری تھے۔ چونکہ مکہ میں مشرکین کی ریشہ دانیوں کے باعث اسلام کو فروغ حاصل نہ ہو سکا لہٰذا وہاں آپؐ نے پہلا عقد حضرت خدیجہ صدیقہ کبریٰؓ سے فرمایا اور ان کی چھبیس سالہ رفاقت کے دوران کوئی نکاح نہیں کیا۔ اگر ہم حالات کا تسلسل سے جائزہ لیں تو اس نکاح میں مشیتِ الٰہی کار فرما نظر آئے گی۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح حضرت سودہؓ سے فرمایا۔

جب آپؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو آپ کو دینی مصالح اور حکمتوں کے تحت متعدد نکاح کرنے پڑے۔ مدینہ میں اللہ نے اسلام کو وسعت بخشی اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے جن میں خواتین بھی تھیں۔ لہٰذا خواتین میں تبلیغ دین اور زن و شو کے باہمی تعلقات، ہر دو جنس کے باہمی برتاؤ کی کیفیت و نوعیت، خواتین کے مخصوص مسائل وغیرہ کی تعلیم و اشاعت کا ذریعہ یہی ازواج النبیؐ تھیں۔ دوئم یہ کہ غزوات میں شہید ہونے والوں کی بے سہارا عورتوں سے نکاح کر کے آپؐ نے انہیں تنگ دستی و فاقہ کشی سے محفوظ فرمایا اور مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ بھی ان بے سہارا عورتوں کے سہارا بنیں۔ سوئم یہ کہ عربوں میں پھیلی ہوئی مذموم رسوم کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے حکم خداوندی کے مطابق حضرت زینب بنت جحش سے نکاح کیا۔ چہارم یہ کہ اسلام کی بہتری کے لئے دیگر قبائل سے تعلقات وسیع کرنے کی خاطر رؤسائے قبائل کی لڑکیوں سے آپؐ

نے عقد فرمائے۔ جیسے کہ حضرت جویریہ جو بنو مصطلق کے رئیس کی دختر تھیں یا حضرت صفیہ جو خیبر کے سردار کی بیٹی تھیں۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ رسالتمآبؐ کا متعدد نکاح کرنا شہوت کا غلبہ نہ تھا بلکہ مشیت الٰہی کے عین مطابق اور دین اسلام کی ضرورت کے پیش نظر عمل صالح تھا۔

مختلف مورخین نے ازواج النبیؐ کی مختلف تعداد بیان کی ہے۔ طبری نے تیئیس ازواج کے نام تحریر کئے ہیں۔[1] جبکہ اکثر مورخین نے کل تعداد پندرہ بتائی ہے جن میں دو کنیزیں تھیں۔ اور دو ازواج کو مختلف وجوہ کی بناء پر خلوت سے قبل ہی طلاق دے کر ان کے گھروں کو واپس بھیج دیا۔ اس طرح رسالتمآبؐ کی کل گیارہ ازواج تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد
۲۔ حضرت سودہؓ بنت زمعہ
۳۔ حضرت عائشہؓ بنت ابوبکرؓ
۴۔ حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ
۵۔ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ
۶۔ حضرت ہندؓ بنت ابی امیہ (ام سلمہ)
۷۔ حضرت زینبؓ بنت جحش
۸۔ حضرت جویریہؓ بنت حارث
۹۔ حضرت صفیہؓ بنت حیی
۱۰۔ حضرت رملہؓ (ام حبیبہ) بنت ابوسفیان
۱۱۔ حضرت میمونہؓ بنت حارث

مذکورہ بالا گیارہ ازواج میں سے چھ قریشی خواتین تھیں۔

حضرت خدیجہؓ : یہ خوش بخت و عالی مرتبت خاتون شرفائے قریش کے ایک ممتاز خاندان بنو اسد سے تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب ہے۔ اور ان کی والدہ فاطمہ بنت زائد بن اصم بن رواحہ بن حجر بن عبد بن معیص بن عامر بن لوی بن غالب تھیں۔ حضرت خدیجہؓ وہ پہلی مخدرہ و معظمہ تھیں جن کو رسالتمآبؐ کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا نیز جن کی حیات میں آنحضرتؐ نے کسی دوسری خاتون سے تزویج گوارہ نہ فرمائی۔

[1] تاریخ طبری ص: ۴۹۲ ج :۱

یہ امر باعث افسوس ہے کہ سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی کے جزئیات مکمل طور پر محفوظ نہیں کئے اور اسلام کی اس خاتون اول کے حالات زندگی پر اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی جس کی یہ معظمہ مستحق تھیں۔ بہر حال دستیاب تاریخی واقعات کے تحت ہم نے اس شریف و عظیم خاتون کے حالات زندگی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد بھی دین دار، کعبۃ اللہ کے حامی اور دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔ ان کا ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تبع نامی بادشاہ یمن نے حجر اسود کو اکھاڑ کر یمن لے جانا چاہا تو خویلد اس کے دفاع میں کھڑے ہو گئے اور تبع کو اس کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح خویلد کی کوشش سے حجر اسود محفوظ رہا۔[1] خویلد کی دختر حضرت خدیجہؓ بھی ابتداء ہی سے اعلیٰ کردار و پاکیزہ اخلاق کی مالک تھیں اور عہد جاہلیت ہی میں طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کی انہی اعلیٰ صفات کے پیش نظر ان کے والد نے ان کی شادی کے لئے اپنے بھائی نوفل کے بیٹے ورقہ کا انتخاب کیا تھا۔ جو توریت و انجیل کے بڑے عالم تھے لیکن کسی وجہ سے یہ نسبت نہ ہو سکی اور حضرت خدیجہؓ کی شادی ایک دولتمند تاجر ابوہالہ بن بناش تمیمی سے ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد ابوہالہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کی دوسری شادی عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوئی وہ بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ ان کی بابت ابو الفرج اصفہانی کا بیان ہے کہ :

ترجمہ : "قبل رسول اللہ حضرت خدیجہؓ کا شوہر عتیق بن عائذ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم تھا۔ اس سے ایک بیٹی ہند تھی۔ اس سے پہلے ابوہالہ بن بناش بن زرارۃ بن وقدان بن حبیب بن سلامہ بن عدی بن حرزۃ بن اسید بن عمرو بن تمیم شوہر تھا۔ اس سے ایک بیٹا ہند تھا"۔

(مقاتل الطالبین ص :۳۰)

[1] الروض الانف ص :۲۱۳ ج :۱

ان کی بابت ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ :

"رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت خدیجہؓ ابو ہالہ بن مالک کی زوجیت میں تھیں، ابو ہالہ بنو اُسید بن عمرو بن تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور بنو عبدالدار کے حلیف تھے۔ ابو ہالہ کا لڑکا ہند بن ابو ہالہ اور ان کی لڑکی زینب بنت ابو ہالہ یہ دونوں خدیجہؓ کے بطن ہی سے تھے اور ابو ہالہ سے بھی پہلے حضرت خدیجہؓ کا ایک لڑکا عبداللہ تھا اور ایک لڑکی تھی۔ ابن ہشام نے کہا" اس لڑکی سے صیفی بن ابو رفاعہ نے نکاح کیا تھا""۔

(سیرۃ ابن ہشام ص : ۷۸۹ ج : ۲)

حضرت خدیجہؓ کے والد جنگ فجار میں مارے گئے یا اس سے قبل فوت ہوئے۔ بہر حال والد اور شوہر کی وفات کے بعد انکی وسیع تجارت کا کوئی نگران نہ رہا۔ حضرت خدیجہؓ کو سخت ترین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انہوں نے بلند ہمتی، دانائی و تدبر سے حالات کا مقابلہ کیا اور کاروبار تجارت کو نہایت فراست سے انجام دینا شروع کیا۔ اپنے اعزاء اور دیگر دیانت دار افراد کے ذریعہ اپنا مال تجارت قافلوں کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں بڑی برکت دی اور وہ ثروت و اقتدار کے اعتبار سے تمام تجار میں عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔

"جب اہلِ مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت تمام قریش کے مال کے برابر ہوتا تھا"۔

(شرح زرقانی ص : ۲۳۰ ج : ۱)

حضرت خدیجہؓ حسب و نسب میں اعلیٰ ترین، مال و دولت میں متمول ترین اور اخلاق و کردار میں بہترین تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ممتاز ترین اقوام و قبائل کے رؤسائے عرب آپ سے نکاح کرنے کے آرزو مند تھے۔ مگر آپ کی نظر میں کوئی جچتا ہی نہ تھا اور کیوں کر جچتا بقول طبری "اللہ نے ان

کی قسمت میں اور بھی کرامات اور سعادت مقدر کی تھی"۔ [1] یا بقول ابن ہشام "جناب خدیجہؓ عقلمند، شریف عزم والی خاتون تھیں اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ آپ کی عظمت کے طفیل ان کے لئے اور بھی سرفرازیاں چاہتا تھا"۔ [2] اللہ تعالیٰ نے ان کو رسالتمآبؐ کی زوجیت کا شرف بخشنے کا اہتمام کر لیا تھا۔ آپ کی تزویج سے متعلق تفصیل گذشتہ صفحات میں درج کی جاچکی ہیں۔

جب رسالتمآب ﷺ مبعوث بہ رسالت ہوئے تو حضرت خدیجہؓ نے نہ صرف نبوت کی تصدیق فرمائی بلکہ آغاز اسلام میں آنحضرتؐ کی بہترین معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ رسالتمآبؐ کو جو چند سال کفار مکہ اذیت دینے میں ہچکچاتے رہے اس میں بڑی حد تک حضرت خدیجہؓ کا اثر کارفرما تھا۔ دنیائے اسلام کا پہلا گھر اور پہلا کنبہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں ایک نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دوسرے خاتون اول حضرت خدیجہ صدیقہ کبریٰ سلام اللہ علیہا اور تیسرے امام اول حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام تھے۔ ازواج النبیؐ میں حضرت خدیجہؓ کو وہ خصوصیات حاصل تھیں جو کسی اور زوجہ کو نصیب نہیں ہوئیں۔

۱۔ حضرت خدیجہؓ رسالتمآبؐ کی سب سے پہلی زوجہ تھیں۔
۲۔ حضرت خدیجہؓ کی حیات میں آنحضرتؐ نے کوئی دوسرا عقد نہیں کیا۔
۳۔ حضرت خدیجہؓ نے اعلان نبوت پر سب سے پہلے لبیک کہا۔
۴۔ حضرت خدیجہؓ قبل از بعثت بھی بت پرستی سے نفرت کرتی تھیں۔
۵۔ رسالتمآبؐ کی تمام اولاد انہیں سے ہے سوائے ابراہیم کے۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے مناقب میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں ان میں سے چند ایک ذیل میں درج ہیں :

""حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے۔ اپنے زمانہ میں سب عورتوں سے افضل مریم بنت عمران تھیں

[1] تاریخ طبری ص : ۹۳ ج : ۱، [2] سیرۃ ابن ہشام ص : ۲۱۴ ج : ۱

اور اس امت کی افضل خدیجہؓ بنتِ خویلد ہیں۔"

(مشکوٰۃ مترجم ص : ۲۶۹ ج : ۳)

" ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جبرئیل نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ یہ خدیجہؓ ایک برتن لے کر آرہی ہیں۔ جس میں سالن اور کھانا ہے جب وہ آپؐ کے پاس آئیں اس کے رب اور میری طرف سے اس کو سلام کہیں اور جنت میں ایک ایسے گھر کی خوشخبری دیں جو کھوکھلے موتی سے ہے۔ اس میں نہ شور ہے نہ رنج "

(صحیح بخاری ص : ۳۹ ج ۱، مشکوٰۃ مترجم ص ۲۶۹ ج : ۳)

" حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے کبھی کسی پر ایسا رشک نہیں کیا جیسا کہ خدیجہؓ پر کیا۔ باوجودیکہ جب میری تزویج رسول اللہ صلعم سے ہوئی اس سے پہلے ہی حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایک روز جناب رسالتمآب صلعم حضرت خدیجہؓ کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کیا آپ ایک بوڑھی بڑھیا کا ذکر کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے ان سے بہتر بیبیاں آپ کو دیں ہیں۔ آنحضرتؐ نے غضبناک ہو کر ارشاد فرمایا کہ قسم خدا کی خدیجہؓ سے بہترین بی بی مجھے ہر گز نہیں ملی۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب لوگ میری تکذیب کرتے تھے اور خدائے تعالیٰ نے انہیں سے مجھے اولاد عطا فرمائی"۔

(مشکوٰۃ ج : ۳، سیرۃ النبیؐ ج : ۲)

ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ :

"اللہ پر نیز آپؐ پر اور اللہ کی طرف سے آپؐ پر نازل ہونے والی چیزوں پر ایمان لانے والوں میں پہلی وہی تھیں۔ خدیجہؓ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے کام میں آسانی پیدا کر دی۔ مخالفوں کی تکذیب اور ناپسندیدہ باتوں کی سماعت سے آپ کو صدمہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس حزن و ملال کو خدیجہؓ ہی کے ذریعہ سے دور فرماتا"۔

(سیرۃ ابن ہشام ص : ۲۶۷ ج : ۱)

جسٹس امیر کا بیان ہے کہ :

"Khadija is a notable figure, an exemplar among the womanhood of Islam. The calumny which is levelled at Muhammad's system, that it has degraded the female sex, is sufficiently refuted by the high position which his wife and youngest daughter, our 'Lady of Light', occupy in the estimation of the Muslim." (Sprit of Islam P: 12)

حضرت خدیجہؓ کی بابت ابنِ سعد کا بیان ہے کہ :

""حضرت خدیجہؓ حقیقتاً ایک عافیت اندیش، مستقل مزاج اور شریف بیوی تھیں" (طبقات ابن سعد ص : ۲۰۳ ج : ۱)

حضرت خدیجہؓ کی تعریف و توصیف میں رسول خدا صلعم فرمایا کرتے تھے کہ وہ مجھ پر ایمان لائیں جبکہ دنیا نے میرا انکار کیا۔ انہوں نے میری تصدیق کی جب دوسروں نے مجھے جھٹلایا۔ انہوں نے اپنے مال میں مجھے شریک بنالیا جب دوسرے میرے سد راہ ہوئے اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی، کسی اور بیوی سے نہیں دی۔

حضرت خدیجہ کبریٰؓ نے چھبیس سال رسالتمآبؐ کی رفاقت میں گزارے اپنی ساری دولت دین کی تبلیغ اور اسلام کی سربلندی کے لئے وقف کر دی اور عرب کی اس مالدار ترین خاتون نے خاندان بنو ہاشم کے ہمراہ شعب ابیطالب میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تین سال گزارے اور وہاں سے واپسی کے کچھ ہی دن بعد ۱۱ رمضان ۱۰ نبوی یعنی ہجرت سے تین سال قبل بعمر باون سال رحلت فرمائی۔ رسالتمآبؐ ان کی لاش لے کر خود قبر میں اترے اور دفن کیا ان کے لئے دعائے خیر فرمائی۔ ان کی قبر مکہ کے مقام حجون میں ہے۔ وقت وفات ان کی عمر ۶۵، سال ۵۶ سال اور باون سال بتائی گئی ہے۔ حضرت خدیجہ کی عمر سے متعلق کہا جاتا ہے کہ رسالتمآبؐ

سے نکاح کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ یہ قول اتنا مشہور ہے کہ ہر لکھنے والا بے دریغ نقل کر دیتا ہے۔ درآنحالیکہ حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ "جناب خدیجہ نے اٹھائیس سال کی عمر میں جناب رسول خدا کے ساتھ شادی کی تھی" اس طرح حضرت فاطمہ زہرہ کی ولادت کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر اڑتالیس سال بنتی ہے۔[1] اور حضرت ابن عباس کا قول دوسروں کے اقوال سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ وہ گھر کے فرد تھے۔ نیز جناب فوق بلگرامی نے بھی وفات کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر باون سال تحریر کی ہے۔[2] جو ابن عباس کے قول کے مطابق ہے۔

حضرت سودہؓ بنتِ زمعہ : یہ قریش کے قبیلہ بنو عامر سے تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب سودہ بنتِ زمعہ بن قیس بن عبد شمس بن عبدود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوی ہے۔ ان کی والدہ شموس بنتِ قیس بن عمرو بن زید تھیں۔ شموس کے والد قیس جناب ہاشم بن عبد مناف کی زوجہ سلمیٰ نجاریہ کے بھائی تھے۔ حضرت سودہ کی پہلی شادی سکران بن عمرو بن عبد شمس سے ہوئی جو ان کے چچازاد تھے۔ ابتدائے اسلام میں یہ اپنے شوہر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئیں اور اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ ہجرت کی۔ اس طرح وہ سابقین اولین اور مہاجرین حبشہ میں سے تھیں۔ حبشہ سے مکہ واپس لوٹیں تو کچھ دن بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ سکران سے ان کے ایک لڑکا عبدالرحمٰن تھا جو جنگِ جلولاء میں مارا گیا۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنتِ حکیم نے آپ کو سودہ کے ساتھ تجویز کا پیغام دیا۔ ۱۰ بعثت میں آنحضرتؐ نے ان سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر تقریباً پچاس سال تھی اور آنحضرتؐ کی عمر مبارک بھی پچاس سال تھی۔ حضرت سودہ کے والد زمعہ نے نکاح پڑھایا اور چار سو

[1] کشف الغمہ ص: ۱۳۹ ج: ۲ [2] اسوۃ الرسول ص: ۲۹۸ ج: ۳

درہم مہر قرار پایا۔ حضرت سودہؓ نے ۱۰ھ میں آنحضرتؐ کے ساتھ حج کیا۔ وہ تیرہ سال رسالتمآبؐ کے ساتھ رہیں۔ اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ واقدی نے ان کی وفات ۵۵ھ میں بتائی ہے جبکہ علامہ ذہبی نے ۲۳ھ لکھی جسے علامہ حسین دیار بکری نے بھی درست تسلیم کیا ہے۔

حضرت سودہؓ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بخاری میں صرف ایک حدیث نقل کی گئی ہے۔ یہ اطاعت گزاری و فرمانبرداری میں تمام ازواج مطہرات سے ممتاز تھیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسالتمآبؐ نے ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ "میرے بعد گھر میں بیٹھنا"۔[1] چنانچہ حضرت سودہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ پھر کبھی حج کے لئے بھی نہ نکلیں۔ آپ فرماتی تھیں کہ میں حج اور عمرہ دونوں کر چکی ہوں اور اب خدا کے حکم کے مطابق گھر میں بیٹھوں گی۔[2] سخاوت و فیاضی بھی ان کا نمایاں وصف تھا۔ وہ طائف کی کھالیں بناتی تھیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی اس کو نہایت آزادی کے ساتھ خرچ کرتی تھیں۔[3]

حضرت عائشہ بنتِ ابوبکرؓ : یہ قریش کے قبیلہ بنو تیم سے تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب عائشہ بنتِ ابوبکر بن عثمان (ابو قحافہ) بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم تھا۔ ان کی والدہ زینب (ام رومان) بنتِ عامر کنانیہ تھیں۔ والدین نے پہلے ان کی نسبت جبیر بن مطعم کے ہاں لگائی تھی لیکن یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تب حضرت ابوبکرؓ نے بلاواسطہ آنحضرتؐ کی خدمت میں معروضہ پیش کیا جسے رسالتمآبؐ نے قبول فرمایا۔ یہ رسول اللہ کی واحد بیوی تھیں جو کنواری (باکرہ) تھیں۔ آنحضرتؐ سے ان کا نکاح مکہ میں شوال ۱۰ بعثت میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی۔ ان کی

[1] ... ص: ۲۶۱ ج: ۳، [2] طبقات ابن سعد ص: ۳۸ ج: ۸، [3] اصابہ ص: ۶۵

رخصتی و عروسی مدینہ میں ۲ھ ماہ شوال ہی میں ہوئی اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان کی عروسی اور رسم رخصتی کی بابت تحریر کیا ہے کہ :

"مدینہ میں آ کر حضرت عائشہؓ بخار میں مبتلا ہو گئیں اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے۔ صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی کے ادا کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں ام رومان نے حضرت عائشہ کو آواز دی۔ ان کو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی۔ ان کے پاس آئیں انہوں نے منہ دھویا۔ بال درست کئے گھر میں لے گئیں۔ انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں۔ یہ گھر میں داخل ہوئیں تو سب نے مبارک باد دی۔ چاشت کے وقت آنحضرت صلعم تشریف لائے اور رسم عروسی ادا ہوئی۔ شوال ہی میں نکاح ہوا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی"۔

(سیرۃ النبیؐ ص: ۳۲۵ ج: ۲)

چونکہ یہ زمانہ آنحضرتؐ پر شدید تنگی کا تھا لہٰذا آپؐ اس موقع پر دعوت ولیمہ کا اہتمام نہ کر پائے۔ درآنحالیکہ آپؐ نے بقیہ تمام نکاحوں کے وقت دعوتِ ولیمہ کا بندوبست فرمایا تھا۔ محدث شیرازی لکھتے ہیں کہ ترجمہ :

ترجمہ : حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میری رخصتی کے دن کوئی بھیڑی ذبح نہیں کی گئی ہمارا ولیمہ عروسی صرف ایک دودھ کا پیالہ تھا جو سعد بن عبادہ کے گھر سے آیا تھا۔ میرا سن اس وقت نو برس کا تھا اور اسماء بنتِ عمیس سے مروی ہے کہ میں حضرت عائشہ کی تقریب رخصتی میں شریک تھی۔ خدا کی قسم اس دن ولیمہ کے لئے کسی قسم کا کوئی طعام تیار نہیں تھا۔ (روضۃ الاحباب ص: ۲۰۵)

واقعہ افک : یہ واقعہ ۵ھ میں غزوۂ بنو مصطلق سے واپسی پر مدینہ کے قریب ایک منزل پہ قیام کے دوران پیش آیا۔ جس میں منافقین نے ام

المومنین حضرت عائشہؓ پر بہتان لگایا اور مسلمانوں میں بدگمانی پھیلائی۔ بقول مولانا شبلی نعمانی "یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آ گئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مرقوم ہے"۔[1] اس واقعہ کی بابت مختلف واسطوں سے جو بیانات مذکور ہیں وہ سب خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں اور روایت کرنے والوں میں سے کسی نے ایک حصہ بیان کیا تو کسی نے دوسرا۔ بہرحال مفسرین و مورخین نے ان تمام حصوں کو راوی اول حضرت عائشہؓ کی روایت سے مربوط کر کے بالتفصیل قلمبند کیا ہے۔[2]

آنحضرتؐ کی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اسطرح رفاقت رسولؐ کی مدت کل نو سال تھی۔ اور آنحضرتؐ کی وفات کے بعد یہ تقریباً اڑتالیس سال حیات رہیں۔ انہوں نے رمضان ۵۷ھ میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت عائشہؓ کو محدثین کی صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان سے دو سو اکیس حدیثیں مروی ہیں جن میں منفرد اچون حدیثیں صحیح بخاری میں اور اڑسٹھ حدیثیں صحیح مسلم میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے علمی فضل و کمال کی بابت کتب احادیث و تاریخ میں بہت کچھ تحریر ہے۔ جو حضرت موصوفہ کی علمی تجلیات سے زیادہ خوش عقیدہ مؤلفین کی تعلیمات معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت حفصہؓ بنتِ عمرؓ : یہ قریش کے قبیلے بنو عدی سے تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب حفصہؓ بنت عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن

[1] سیرۃ النبیؐ ص: ۳۵۱ ج: ۱، [2] تفصیل کیلئے ملاحظہ مولانا مودودی صاحب کی تفہیم القرآن ص: ۳۶۷ ج: ۳، مولانا ظفر حسن صاحب امروہوی کی تفسیر القرآن ص: ۳۶۵ ج: ۳، سیرۃ ابن ہشام ص: ۳۵۳ تا ۳۶۷ ج: ۲ اور تاریخ طبری ص: ۳۱۷ تا ۳۲۴ ج: ۱، اسوۃ الرسول ص: ۵۲۷ ج: ۲

عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی ہے۔ ان کی والدہ زینب بنت مظعون تھیں۔ ان کی ولادت بعثت نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی۔ ان کا پہلا عقد خنیس بن حذافہ سہمی سے ہوا تھا۔ خنیس نے اسلام قبول کیا مدینہ ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے زخمی ہو کر گھر لوٹے لیکن زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے۔ بعض نے غزوۂ احد میں ان کی شہادت بتلائی ہے۔ خنیس کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ سے اور پھر حضرت عثمانؓ سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی دختر حفصہ سے نکاح کر لیں مگر ان دونوں حضرات سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تب انھوں نے آنحضرتؐ سے درخواست کی جو قبول ہوئی اور شعبان ۳ھ میں حضرت حفصہؓ کا نکاح آنحضرتؐ سے ہو گیا۔

آنحضرتؐ سے نکاح کے وقت حضرت حفصہؓ کی عمر بائیس سال تھی۔ حضرت حفصہ کی تیز مزاجی و درشت طبعی تو بقول مولانا شبلی، موروثی تھی۔ نیز فطرتاً نسوانی خصوصیات سے بھی مغلوب تھیں جس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات جن میں آنحضرت سے سخت کلامی اور رات بھر روٹھے رہنا جیسے باعثِ اذیت واقعات شامل تھے جو متعدد کتب تاریخ و حدیث میں مرقوم ہیں۔ انھیں تکلیف دہ حرکات کے باعث طلاق کی نوبت آئی جیساکہ "مسند احمد بن حنبل میں عاصم بن عمر سے مروی ہے کہ پیغمبر صاحب نے حضرت حفصہ سے نکاح کرنے کے بعد ان کو طلاق دی تھی، مگر پھر رجوع فرمایا"۔[1]

حضرت حفصہ صرف آٹھ سال آنحضرت کی شریک حیات رہیں انھوں نے تریسٹھ سال کی عمر میں ۴۵ھ میں وفات پائی اور بقیع میں دفن ہوئیں۔ ان سے ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔

[1] بحوالہ تاریخ احمدی ص : ۳۸۔

واقعہ تحریم : اس واقعہ کا انعقاد مولانا شبلی نعمانی نے ۹ھ کے آغاز میں متعین کیا ہے اور واقعات ایلاء، تخییر اور مظاہرہ عائشہؓ و حفصہؓ کو ہم زمانہ اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں بتایا ہے، حالانکہ واقعہ تخییر جس میں ازواج مطہرات نے اپنے نفقہ کیلئے خیبر کے مال غنیمت میں سے کچھ حصہ طلب کیا تھا۔ فتح خیبر کے بعد کا ہے اس واقعہ کا ذکر سورہ احزاب میں ہے جو ۷ھ میں نازل ہوا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الگ الگ واقعات ہیں۔ بہر حال شبلی صاحب نے ان واقعات کو بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اور جناب ذوق بلگرامی نے اس سے کہیں زیادہ تفصیل سے تجزیہ کیا ہے۔ لیکن ہم یہاں اس کا خلاصہ تحریر کر رہے ہیں۔

ایک وقت میں جناب رسالتمآبؐ حضرت زینبؓ بنت جحش کے پاس معمول سے زیادہ ٹھہرنے لگے اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آیا تھا۔ جس کا شربت بنا کر وہ آنحضرت کو پیش کرتی تھیں۔ اس کی وجہ سے کچھ دیر ہو جاتی تھی۔ اس پر حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا۔ انھوں نے حضرت حفصہؓ سے کہا کہ جب آنحضرتؐ تمہارے گھر آئیں تو کہنا کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے۔[1] جب آنحضرتؐ سے یہ بات کہی گئی تو آپؐ نے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

ترجمہ : "اے پیغمبر! اپنی بیبیوں کی خوشی کے لئے تم خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو"۔ (سورۂ تحریم آیت : ۱)

شبلی نعمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اسی زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ آنحضرتؐ نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہؓ سے کہی اور تاکید کی وہ کسی سے نہ کہیں، لیکن انھوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دی۔ جیساکہ اللہ تعالی نے سورہ تحریم کی آیت ۳ میں فرمایا ہے۔

[1] مغافیر ایک بدبو دار پھول ہوتا ہے جسے ہندوستان میں اناس کہتے ہیں۔

"اور جبکہ پیغمبر نے اپنی بعض بیبیوں سے راز کی بات کہی اور انھوں نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا۔ پھر جب ان سے کہا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی۔ پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی"۔ (ترجمہ سیرۃ النبی ص : ۵۵۰ ج : ۱)

اسی آیت کا ترجمہ مولانا مودودی صاحب نے اس طرح کیا ہے ملاحظہ کیجئے اور فرق پر غور فرمایئے۔

"نبی نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا اور اللہ نے نبی کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دیدی تو نبی نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا آپ کو اسکی کس نے خبر دی، نبی نے کہا مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے"۔ (تفہیم القرآن ص : ۲۱ ج : ۶)

دونوں تراجم کا فرق ملاحظہ فرمایا۔ شبلی صاحب نے جمع کا صیغہ استعمال کر کے نہایت ہوشیاری سے تمام ازواج کو اس راز میں شریک کر لیا۔ بہر حال شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے باہم ایکا کر کے مظاہرہ کیا تو اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی۔

"اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہؐ) کے مقابلہ میں ایکا کرو تو خدا اور جبرئیل اور نیک مسلمانوں اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں"۔

اسی آیت کا ترجمہ تفہیم سے ملاحظہ فرمایئے۔

"اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور اگر نبی کے مقابلہ میں تم نے باہم جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولی ہے اور اس کے بعد جبرئیل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں"۔

ان تراجم میں دو مقامات غور طلب ہیں اول : فقد صغت قلوبکما کا ترجمہ شبلی صاحب نے "تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں" کیا ہے اور مولانا مودودی صاحب نے "تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں" کیا ہے حالانکہ تفہیم ہی میں اس کی وضاحت اسطرح کی ہے کہ صغو عربی زبان میں مڑ جانے اور ٹیڑھا ہو جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فقرہ کا ترجمہ کیا ہے "ہر آئینہ کج شدہ است دل شما" اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے "کج ہو گئے ہیں تمہارے دل"۔[1] دوم : لفظ صالح المومنین کا ترجمہ شبلی صاحب نے نیک مسلمان (بصیغہ جمع) کیا اور اسی طرح مولانا مودودی صاحب نے بھی "تمام صالح اہلِ ایمان" کیا ہے جو جمع کا صیغہ ہے حالانکہ صالح المومنین سے مراد ایک نیک مومن یا مومنین میں سے ایک نیک مرد (بصیغہ واحد) ہونا چاہیے تھا۔ صالح المومنین کی بابت علامہ سیوطی، امام ثعلبی، امام ابن ابی حاتم وغیرہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں یہ روایت تحریر فرمائی ہے ترجمہ : "اسماء بنت عمیس سے مروی ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ کو یہ کہتے سنا کہ صالح المومنین سے مراد علی ابن ابی طالب ہیں"[2]۔ ینابیع المودت میں یہ حدیث تفصیل سے مرقوم ہے، صاحب ارجح المطالب لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ابن مردویہ اور امام ابن عساکر نے بھی لکھا ہے اور امام فخر الدین رازی نے بھی کتاب اربعین میں نقل کیا ہے۔

الغرض اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسکے بعد شبلی صاحب نے تحریر فرمایا "روایتوں سے جو مظاہرہ کا سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں"۔

یہاں شبلی صاحب نے واقع ایلاء کے موقع پر ہونے والے مظاہرہ ازواج اور ایلا اول کے واقعہ کو شامل کر لیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ماریہ

[2] ... الرسول ص : ۲۶۳ ج : ۳ [1] تفہیم القرآن ص : ۲۱ ج : ۶

قبلہ والی روایت کو بھی تسلیم کر کے حسبِ منشاء مضمون تیار کیا۔ ہم اختصار کے باعث مزید لکھنے سے قاصر ہیں۔ تفصیلی بحث و دلائل کیلئے اسوۃ الرسول جلد سوئم ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت زینبؓ بنتِ خزیمہ :۔ یہ قبیلہ بنی صعصعہ سے تھیں ان کا سلسلۂ نسب زینب بنت خزیمہ بن حارث بن عبداللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ ہے۔ چونکہ یہ شروع ہی سے فقراء و مساکین کو کھانا کھلاتی تھیں لہٰذا قبل از اسلام ہی ام المساکین کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ ان کا پہلا عقد آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی طفیل بن حارث بن عبدالمطلب سے ہوا تھا۔ لیکن ابن ہشام کا کہنا ہے کہ جہمن عمرو بن حارث کی زوجیت میں تھیں۔ ان سے طلاق ہو گئی تو طفیل کے بھائی عبیدہ بن حارث سے نکاح ہوا۔ عبیدہ جنگ بدر میں شہید ہو گئے۔ تیسرا نکاح رسالتمآبؐ کے پھوپی زاد بھائی عبداللہ بن جحش سے ہوا جو ام المومنین زینب بنت جحش کے بھائی تھے۔ وہ بھی جنگ احد میں شہید ہوئے۔ تب آنحضرتؐ نے ۳ھ میں ان سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر تیس سال اور آنحضرتؐ کی عمر مبارک پچپن سال تھی۔ یہ آنحضرتؐ کی زوجیت میں دو تین ماہ رہنے پائی تھیں کہ وفات پا گئیں۔ آنحضرتؐ کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے علاوہ یہی ایک زوجہ تھیں جنہوں نے وفات پائی۔ آنحضرتؐ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔

حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ : ان کا اصل نام ہند تھا اور یہ قبیلہ بنو مخزوم سے تھیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ہند بنت ابی امیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم تھا۔ آپ کی والدہ عاتکہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ آپ کا پہلا عقد آپ کے عم زاد عبداللہ بن عبدالاشد سے ہوا جن سے آپ کے چار

اولادیں یعنی سلمہ و عمر دو بیٹے اور زینب و رقیہ دو بیٹیاں تھیں۔[۱] آپ کے بیٹے سلمہ کی نسبت سے ہند کو ام سلمہ اور عبداللہ کو ابو سلمہ کی کنیت سے شہرت ملی۔ ام سلمہ اور ان کے شوہر ابو سلمہ آغازِ نبوت میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور حبشہ ہجرت کی۔ کچھ دنوں بعد مکہ واپس آئے اور ہجرت مدینہ کا قصد کیا۔ سسرالی مشرکین رشتہ داروں نے ہجرت سے روکنے کے لئے ان پر بڑے مظالم کئے حتیٰ کہ ان کی گود سے ان کے بیٹے سلمہ کو یہ کہہ کر چھین لیا کہ یہ ہماری اولاد ہے تم اسے نہیں لے جا سکتیں۔ آپ عقیدتِ اسلام سے سرشار ان مشرکین کا مقابلہ صبر و استقلال سے کرتی رہیں آخر کار مشرکین نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور آپ مدینہ ہجرت کر گئیں۔ سیرت نگاروں کے نزدیک آپ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ مدینہ ہجرت کرنے والی آپ پہلی خاتون تھیں۔ انکے شوہر ابو سلمہ بڑے شجاع اور مشہور شہسوار تھے۔ غزوات بدر و احد میں انہوں نے جاںنثاری کے یادگار نمونے چھوڑے جو تاریخ میں درج ہیں۔ ابو سلمہ غزوۂ احد میں اتنے شدید زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور جمادی الاول ۴ھ میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔ آنحضرت نے خلافِ معمول ان کی نماز جنازہ نو تکبیروں سے پڑھائی۔ جب اصحاب نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہؐ! حضور کو شمار تکبیر پڑھائی اس نے کما کہیں سہو تو نہیں ہو گیا"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "نو تکبیریں کیا یہ تو نو ہزار تکبیروں کے مستحق تھے"۔[۲]

جب عدت کی مدت گزر گئی تو رسالتمآبؐ نے ام سلمہؓ کے پاس پیام عقد بھیجا، بعد قبولیت آنحضرتؐ نے ان سے عقد فرمایا۔ یہ نکاح ۴ھ میں ہوا۔ اس وقت حضرت ام سلمہؓ کی عمر چھبیس سال تھی۔ آنحضرتؐ ان سے والہانہ محبت فرماتے تھے اور وہ بھی آپؐ کے آرام کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص: ۹۷، ج ۲۔ [۲] سیرۃ النبیؐ ص: ۳۲۹ ج: ۲

جب آپ ان کے ہاں شب باش ہوتے تو ان کا بچھونا آپؐ کی جاء نماز کے سامنے ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ سامنے ہوتی تھیں۔[۱]

حضرت ام سلمہؓ کو علمیت و ذکاوت اور فقہی معلومات میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس جیسے بلند پایہ بزرگ آپ کی علمیت سے فیضیاب ہوتے تھے اور تابعین کا ایک بڑا گروہ آپ کے آستانۂ فضل پر سر جھکاتا تھا۔ واقعہ ایلا کے موقع پر حضرت عمرؓ سے سوال و جواب میں ام سلمہؓ کا یہ فرمانا کہ "تم بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گئے کہ اب رسولؐ اور ان کی بیویوں کے امور خاص میں بھی دخل دینے لگے"۔ ان کی ذاتی عظمت و جلالت اور حیا و غیرت کی کامل مثال ہے۔ حضرت ام سلمہؓ قرآن کریم کی تلاوت آنحضرتؐ کی طرز پر کیا کرتی تھیں۔ آپ کے پاس آنحضرت کا موئے مبارک محفوظ تھا۔ آپ سے تین سو اٹھتر (۳۷۸) حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں کل تین حدیثیں بخاری نے اور تیرہ حدیثیں مسلم نے لکھی ہیں۔ باقی حدیثیں دیگر محدثین نے اپنی اپنی تالیفات میں نقل کی ہیں، اور آپ کا شمار محدثین صحابہ میں کیا جاتا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ نے اپنی پوری زندگی رفاقت و محبت اہلبیت میں گزار دی جس کی تمنا انہوں نے نزول آیت تطہیر کے وقت کی تھی۔ حضرت امام حسینؑ سے آپ کو جنیت کی حد تک محبت تھی یہی وجہ ہے کہ شہادت حسینؑ کی زیادہ تر احادیث آپ ہی سے مروی ہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کے صاحبزادے سلمہ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی حمایت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ حسن بصری جو حضرت ام سلمہ کے زرخرید غلام تھے اور جن کی تعلیم و تربیت پر انہوں نے خصوصی توجہ فرمائی تھی جب وہ جنگِ جمل میں حضرت علیؑ کی رفاقت سے دستبردار

[۱] مسند احمد حنبل ص: ۳۲۲ ج: ۶۔

ہوئے تو حضرت ام سلمہؓ کو سخت ناگوار گزرا۔ جس کے بعد آپ نے عمر بھر نہ تو حسن بصری کا منہ دیکھا اور نہ ہی اپنے دروازے پر چڑھنے دیا۔

اہلِ سیرت و تاریخ اس امر پر متفق ہیں کہ ازواجِ مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی۔ لیکن سن وفات میں اختلاف ہے مثلاً واقدی نے ۵۹ھ، ابراہیم حربی نے ۶۲ھ، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ۵۸ھ اور بعض روایتوں میں ۶۱ھ بیان کیا۔ صحیح مسلم میں حارث بن عبداللہ اور عبداللہ بن صفوان کی حضرت ام سلمہؓ سے ملاقات کا ذکر ہے جو ۶۴ھ کا ہے اس لئے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام تاریخیں درست نہیں۔ جب کہ جناب فوق بلگرامی نے تحریر کیا ہے کہ جناب موصوفہ کی وفات یقینی طور پر ۶۴ھ کے آخر یا ۶۵ھ کے اوائل میں واقع ہوئی اس لئے کہ قاتلان امام حسینؑ کا خاتمہ کر کے ۶۴ھ میں جب امیر مختار مدینہ آئے تو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی زیارت کو حاضر ہوئے۔ اس بناء پر یہ بالکل صحیح اور فی الواقع ہے کہ حضرت ام سلمہؓ یقیناً ۶۴ھ تک زندہ تھیں۔

حضرت زینبؓ بنتِ جحش : یہ قبیلہ دودان سے تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب زینب بنت جحش بن رباب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کبیر بن غنم بن دودان اسدی ہے۔ زینب کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم تھیں۔ یعنی یہ آنحضرتؐ کی حقیقی پھوپھی کی بیٹی تھیں آپؐ ہی کی زیرِ تربیت پلی بڑھیں اور مشرف بہ اسلام ہوئیں۔[۱] آپؐ نے ان کا عقد اپنے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) زید بن حارثہ سے کیا۔ نقص غلامی کے سبب وہ زید سے عقد کرنے کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ لیکن رسالتمآبؐ کے اسلام میں ملوکیت کے اعزاز و اکرام واضح کرنے کے باعث وہ رضامند ہو گئیں مگر ان کے دل میں خلش قائم رہی جس کے نتیجہ میں زن و شو کے تعلقات ہمیشہ شکر رنجی کا

[۱] اسوۃ الرسول ص: ۵۵۷ ج: ۲

شکار رہے اور یہ بمشکل ایک سال زید کے نکاح میں رہیں۔ حضرت زید آنحضرتؐ سے ان کی شکایت کرتے اور طلاق دینے کی خواہش کرتے رہتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ (جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب آیت پانچ میں ارشاد فرمایا ہے)۔ مگر یہ تعلقات کسی طرح بھی استوار نہ رہ سکے اور آخر کار حضرت زید بن حارثہ نے طلاق دے دی۔

مدینہ میں جناب زینبؓ کی خبر گیری رکھنے والا سوائے رسالتمآبؐ کے کوئی نہ تھا۔ آپؐ ان کی دیکھ بھال فرماتے تھے۔ آپؐ نے ان کو اپنے حبالۂ نکاح میں لینا چاہا مگر حضرت زید کو آزاد کر کے مربیانہ و مساویانہ سلوک روا رکھنے کے باعث قریش اپنے دستور کے مطابق زید کو آنحضرت کا بیٹا تصور کرنے لگے۔ اسی تبنیت کی طعن و تشنیع کے اندیشے کے سبب آپ نے تحمل فرمایا۔ مگر جب اللہ کا حکم نازل ہوا تو ۵ھ میں آپ نے حضرت زینبؓ بنت جحش سے نکاح کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر پینتیس سال تھی۔ سورۂ احزاب آیت ۳۵ تا ۴۰ میں اس واقعہ کی پوری تفصیل جس میں تبنیت کی بے حقیقی، زینب و زید کی سوء مزاجی، زید کی دلجوئی، زید کا طلاق دینے اور آنحضرتؐ کو زینب سے نکاح کرنے کا حکم نازل ہوا، درج ہے۔

رسالتمآبؐ اور حضرت زینبؓ کے نکاح کی بابت طبری نے واقدی کے حوالہ سے ایک روایت بیان کی ہے جس کو پڑھ کر مسلمانوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں، جبکہ مستشرقین، مخالفین و معترضین کے لئے ایسی روایتیں بہترین سرمایہ ہوتی ہیں۔ ہم اس روایت کو نقل کرنا بھی عظمتِ پیغمبرؐ اور شانِ رسالت کے منافی سمجھتے ہیں البتہ مولانا شبلی نعمانی اور جناب فوق بلگرامی کے دو اقتباسات تحریر کرتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا بیان ہے کہ :

"مورخ طبری نے واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے۔ اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے صرف یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کیلئے سند ہاتھ آئے۔ طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں۔ لیکن محدثین نے ان کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے"۔
(سیرۃ النبیؐ ص ۴۴۴ ج ۱)

جناب فوق بلگرامی تحریر کرتے ہیں کہ :

"اسلام کے ساتھ عیسائیوں کی عیب جوئی اور غلط گوئی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مبلغین شریعت ہمیشہ ہدفِ ملامت بنتے چلے آئے ہیں۔ مخالفین اپنی فطرتی کج فہمی سے ان کے محاسن کو بھی بد نما صورتوں میں دکھاتے آئے ہیں۔ جناب زینب کا واقعہ بھی اسی کی مثال ہے۔ اس واقعہ میں شانِ قدرت، مدارج رسالت، قضائے عدالت تو وہی تھا جو بالتفصیل اوپر بیان ہو چکا ہے۔ معترضین کو اس کے اصلی مدعا سے تو کوئی غرض ہی نہیں ہے اور نہ اس کے محاسن سے کوئی واسطہ۔ ہاں جاہل مشرکین اور مفسد منافقین کے ہم زبان بن کر اس پر وہی اعتراض کرتے ہیں جو مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ ان سے ہزار برس پہلے کرتے آئے ہیں۔ ان کی ان تعریضات میں سوائے نفسیات کے نہ کوئی اصلیت ہے نہ حقیقت" (اسوۃ الرسول ص ۵۷۱ ج ۲)

بقول مولانا شبلی نعمانی "واقعہ کی اصل اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جسطرح بیان کیا، گو سر تا پا کذب و افترا ہے، لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے"۔[1]

مسلمانوں کی تاریخ میں ازواج مطہرات سے متعلق ایسی بہت سی روایتیں و حدیثیں تحریر کی گئی ہیں جو نہ صرف ان ازواج مطہرات کی شان کے

[1] سیرۃ النبیؐ ص ۴۴۳ ج ۱

خلاف ہیں بلکہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت کو بھی نشانۂ ہدف بناتی ہیں اور ایسی ہی روایتوں کی موجودگی مردود راج پال کو "رنگیلا رسول"، رشدی ملعون کو "ساتنک ورسیز" اور مستشرقین کو توہین رسولؐ کے لئے مواد فراہم کرتی ہیں۔

مشکوٰۃ میں مندرج ایک حدیث کے مطابق حضرت زینبؓ کا ابتدائی نام برّہ تھا جسے آنحضرتؐ نے تبدیل کر کے زینبؓ رکھا۔ حضرت زینبؓ بنت جحش نسبی اعتبار سے بلند مرتبہ، حسن و جمال میں ممتاز، خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت گزار، نہایت قانع و فیاض طبع تھیں۔ خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اپنی آمدنی کو راہ خدا میں صرف کرتی تھیں۔

آنحضرتؐ نے ازواج مطہرات سے فرمایا "تم میں سے جلد مجھ سے وہ بی بی ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہو گا"۔ یہ فیاضی کی طرف اشارہ تھا۔ لیکن ازواج مطہرات اس کو حقیقت سمجھیں چنانچہ باہم اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں۔ حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بناء پر اس پیشگوئی کی مصداق ثابت ہوئیں اور ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انہوں نے انتقال فرمایا آپ نے اپنے کفن کا خود سامان کیا تھا۔ انہوں نے ترپن سال کی عمر میں ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں وفات پائی۔[1]

جُوَیرِیہؓ بنت حارث : یہ قبیلۂ خزاعہ کی شاخ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں حارث نے شعبان ۵ھ میں مریسیع کے مقام پر آنحضرتؐ سے جنگ کی اور شکست کھائی۔ اس کی قوم کے بہت سے لوگ قتل ہوئے اور بقیہ گرفتار کر کے لونڈی غلام بنا لئے گئے۔ جویریہ کا شوہر مسافع بن صفوان (ذی شفر) جو اُن کا عم زاد تھا اس جنگ میں

[1] اسوۃ الرسولؐ ص ۵۱۳ ج ۳

مارا گیا اور جویریہ بھی کنیز بنالی گئیں۔ ابن اسحاق کی روایت جسے ابن ہشام نے اپنی تاریخ اور ابو داؤد نے اپنی سنن میں تحریر کیا اور اکثر مورخین نے اسے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم ہوا تو جویریہ، ثابت بن قیس بن شماس انصاری کے حصہ میں آئیں۔ جویریہ کو یہ نسبت پسند نہ آئی لہذا انہوں نے رائج دستور کے مطابق ثابت کو مکاتبت کی پیشکش کی۔ مکاتبت سے مراد یہ ہے کہ اگر آقا رضامند ہو تو لونڈی یا غلام اسے طے شدہ رقم ادا کر کے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ ثابت نے جویریہ کی پیشکش کو قبول کر لیا اور نو اوقیہ سونے پر معاملہ طے ہوا۔ چونکہ یہ رقم جویریہ کی استطاعت سے باہر تھی۔ لہذا وہ طلب مدد کے لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچیں۔ اپنا تعارف کرایا، حالات سے آگاہ کیا اور مدد کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "کیا تم اس سے بھی بہتر چیز پسند کرو گی"؟ انہوں نے دریافت کیا "وہ کیا چیز ہے"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا "میں تمہاری طرف سے بدل کتابت ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں"۔ جویریہ رضامند ہو گئیں۔ تب آپؐ نے رقم ادا کر کے انہیں آزاد کرایا اور پھر نکاح کر لیا۔

اس کے برعکس مولانا شبلی نعمانی نے امام مندہ کی اسناد سے یہ روایت حافظ ابن حجر کی فتح الباری سے نقل کی ہے :

"اصل واقعہ یہ ہے کہ جویریہؓ کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا، حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپ اس کو آزاد کر دیں، آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ حارث نے جا کر جویریہؓ سے کہا کہ محمد نے تیری مرضی پر رکھا ہے، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انہوں نے کہا: میں رسول ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے ان سے شادی کر لی"۔ (سیرۃ النبیؐ ص ۴۱۸ ج ۱)

آنحضرتؐ کے اس رشتہ ازدواج کے باعث مسلمانوں نے بنو مصطلق کے تمام لونڈیوں اور غلاموں کو آزاد کر دیا۔ مشکوٰۃ کی روایت کے مطابق حضرت جویریہ نے ربیع الاول ۵۶ھ میں تیرسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔[۱] لیکن فوق بلگرامی نے وفات ۵۰ھ میں اور عمر پینسٹھ سال لکھی ہے۔ حضرت جویریہ زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ بقیع میں دفن کی گئیں۔ ان سے چند حدیثیں مروی ہیں۔

ام حبیبہؓ بنتِ ابو سفیان : ان کا نام رملہ تھا اور ان کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب رملہ بنت صخر (ابو سفیان) بن حرب بن امیہ ہے۔ ان کی والدہ صفیہ بنت ابو العاص بن امیہ تھیں۔ رملہ بنت ابو سفیان کے پہلے شوہر عبداللہ بن جحش اسدی سے ایک بیٹی حبیبہ نامی تھی۔ اسی کی نسبت سے ان کی کنیت ام حبیبہ ہوئی۔ یہ اپنے شوہر کے ہمراہ مسلمان ہوئیں اور حبشہ ہجرت کی۔ وہاں ان کا شوہر عیسائی ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد مر گیا۔ ابن اسحاق نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ :

> "آنحضرتؐ نے عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ نجاشی کو پیغام بھیجا کہ ام حبیبہ کو میری جانب سے پیغام دو اور میرا نکاح کر دو اور میرے پاس بھیج دو۔ نجاشی جو اسی سال اسلام لایا تھا اس نے حکم کی تعمیل کی۔ نجاشی نے رسالتمآبؐ کی جانب سے پیام دیا اور ام حبیبہ کے وکیل خالد بن سعید بن العاص نے ام حبیبہ کی جانب سے قبول کر کے ان کا نکاح آنحضرتؐ سے کر دیا۔ (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۲۸ ج ۱)

نجاشی نے چار سو درہم مہر خالد کے ذریعہ ام حبیبہؓ کو دیئے۔ یہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ام حبیبہؓ کی عمر چھتیس سال تھی۔ نجاشی نے ام حبیبہ کو مدینہ روانہ کر دیا۔ ام حبیبہؓ کا انتقال ۴۴ھ میں بعمر ۷۵ سال ہوا اور یہ مدینہ میں دفن ہوئیں۔

---
[۱] مشکوٰۃ ص : ۳۱۳ ج : ۳

صفیہؓ بنتِ حیی : یہ خیبر کے یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق اخطب ہارون بن عمرانؑ کے نواسے تھے۔[۱] ان کی ماں کا نام سموال تھا جو بنی قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھیں۔ صفیہ کا پہلا شوہر مشکم القرظی تھا۔ جس نے انھیں طلاق دیدی۔ اس کے بعد صفیہ کا نکاح کنانہ بن ربیع بن ابو الحقیق سے ہوا۔ خیبر کی جنگ میں کنانہ قتل ہوا اور صفیہ کے باپ، بھائی بھی مارے گئے اور وہ گرفتار ہوئیں۔ آنحضرتؐ نے صفیہ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ان کی دعوت ولیمہ میں گوشت وغیرہ نہ تھا بلکہ کھجوروں اور ستو سے تواضع کی گئی۔ یہ واقعہ ۵ھ کا ہے۔

حضرت صفیہؓ نے رمضان ۵۰ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ ان سے چند حدیثیں مروی ہیں۔

حضرت میمونہؓ بنتِ حارث : یہ قبیلہ بنو صعصعہ سے تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب میمونہ بنت حارث بن حزن بن جبیر بن ہزم رُویبہ بن عبداللہ بن ہلال بن عامر بن صعصعہ تھا۔ ان کی والدہ ہند بنت عوف بن زہیر، کا تعلق بنی حمیر سے تھا۔ مادری رشتہ سے حضرت حمزہ کی زوجہ سلمیٰ، حضرت جعفر طیار کی زوجہ اسماء اور سلامہ ان کی بہنیں تھیں۔ نیز ام الفضل زوجہ عباس بن عبدالمطلب بھی ان کی بہن ہوتی تھیں۔

حضرت میمونہ کا پہلا نکاح مسعود بن عمرو ثقفی سے ہوا لیکن طلاق ہو گئی۔ پھر ابو رہم بن عبدالعزیٰ بن ابو قیس سے نکاح ہوا۔ جو ۷ھ میں فوت ہو گیا۔ اسی سال آنحضرتؐ عمرہ کی غرض سے مکہ تشریف لے گئے تو حضرت عباسؓ کی کوشش سے اسی احرام کی حالت میں ذیقعد ۷ھ میں آپؐ سے ان کا نکاح ہوا۔ حضرت عباسؓ اس نکاح کے متولی ہوئے۔ آپؐ نے

---
[۱] مشکوٰۃ ص : ۳۵۱ ج : ۳

چار سو درہم مہر ادا کیا۔ نکاح کے وقت حضرت میمونہؓ کی عمر چھتیس سال تھی۔ یہ چار سال آنحضرتؐ کی حیات میں شریک رہیں۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ "حضرت میمونہؓ نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلعم کے لئے ہبہ کر دیا تھا اور یہ اس طرح کہ رسول اللہ صلعم کا پیام نکاح ان کے پاس پہنچا تو اس وقت یہ اپنے اونٹ پر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کہا یہ اونٹ اور اس پر جو کچھ ہے، وہ سب اللہ اور اسکے رسولؐ کا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ترجمہ : اور وہ مومن خاتون، جنہوں نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لئے ہبہ کر دیا"۔[۱]

آنحضرتؐ کا یہ آخری نکاح تھا اور حضرت میمونہؓ آپؐ کی سب سے آخری زوجہ تھیں۔ آنحضرتؐ کے احکامات کو ہمیشہ فوقیت دیتی تھیں۔ یہ معظمہ ۵۱ھ میں اسی سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مقامِ سرف میں ان کی رسم عروسی ہوئی اور اسی مقام پر ان کا انتقال ہوا اور وہیں پر یہ دفن ہوئیں۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت میمونہ سے چھیالیس حدیثیں مروی ہیں۔

اسماء بنتِ نعمان : ان کا تعلق بنو کندہ سے تھا۔ ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق یہ ان دو بیویوں میں سے ایک تھیں جن سے آنحضرتؐ نے خلوت نہیں فرمائی۔ ان سے آپ کا نکاح ہوا۔ جب آپؐ نے ان کے اندر برص کی سفیدی دیکھی تو انہیں کچھ متاع دے کر ان کے گھر واپس کر دیا۔[۲]

عمرہ بنتِ یزید : یہ بنو کلاب سے تھیں اور حدیث الاسلام تھیں (کفر کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا) یہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس آئیں تو آپ سے پناہ مانگی۔ آپؐ نے ان کے گھر والوں میں واپس کر دیا۔[۳]

---
[۱] سیرۃ ابنِ ہشام ص : ۷۹۳ ج : ۲ [۲] سیرۃ ابنِ ہشام ص : ۷۹۳ ج : ۲
[۳] ابنِ سعد ص : ۲۱۰ ج : ۱

ماریہ قبطیہ : ماریہ مصر کے مقام حفن کی رہنے والی تھیں۔ آنحضرتؐ نے عزیز مصر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے ایک خط بھیجا تھا جس کے جواب میں مقوقس نے تحریر کیا تھا کہ :

> "ترجمہ : محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی، اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت کی جاتی ہے، اور میں آپ کے لئے کپڑا اور سواری کا خچر بھیجتا ہوں۔
> (سیرۃ النبیؐ ص : ۴۷۱ ج : ۱)

اس اقتباس کے ذیلی حاشیہ میں تحریر ہے کہ عربی میں جاریہ لڑکی کو کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی۔ ارباب سیر ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں۔ لیکن مقوقس نے جو ان کی بابت لکھا ہے کہ "مصریوں میں ان کی بڑی عزت ہے" یہ الفاظ لونڈی کی شان میں استعمال نہیں کئے جا سکتے لہٰذا شبلی صاحب نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے۔

بہر حال مقوقس نے اس خط کے ساتھ ماریہ اور ان کی بہن سیرین کو معہ دیگر ہدایہ آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیجا۔ آنحضرتؐ نے ان دونوں بہنوں کو ام سُلیم بنتِ ملحان کے ہاں ٹھہرایا اور وہاں جا کر ان دونوں بہنوں کو اسلام پیش کیا۔ جسے انہوں نے قبول کیا۔ تب آنحضرتؐ نے سیرین کو حسان بن ثابت شاعر کو بخش دیا جن کے بطن سے حسان کے بیٹے عبدالرحمٰن پیدا ہوئے۔ اور ماریہ سے خود نکاح کر لیا۔

رسول اللہ کے صلب سے ماریہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا جسکا نام آنحضرتؐ نے ابراہیم رکھا۔ ابراہیم کی دائی رسول اللہؐ کی آزاد کردہ لونڈی

سلمٰی تھی۔ سلمٰی کے شوہر ابو رافع نے ابراہیم کی ولادت کی خبر آنحضرتؐ کو پہنچائی تو آپؐ نے انھیں ایک غلام انعام میں دیا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ جب ماریہ کے لڑکا ہوا تو رسول اللہؐ کی بیویاں رشک کھانے لگیں ان پر یہ بات گراں گزری۔ ابو جعفر سے روایت ہے کہ "رسول اللہؐ کچھ دنوں ماریہ کے پاس نہ گئے کیونکہ آپؐ کی بیویوں پر وہ گراں گزرتی تھیں، بیویاں ان پر رشک کھاتی تھیں مگر نہ اسقدر جتنا عائشہ کو رشک تھا"۔[1]

ریحانہ قریظہ : ابن ہشام کے مطابق ریحانہ، عمرو بن قریظہ کی نسل کے عمرو بن حناف کی بیٹی تھی۔ جبکہ فوق بلگرامی کی تحقیق کے مطابق یہ بنی نضیر کی بیٹی تھیں۔ اور بنی قریظہ کے ایک یہودی حکیم قرظی کی بیوی تھیں۔ غزوۂ بنو قریظہ میں ان کا شوہر قتل کر دیا گیا۔ دیگر قیدیوں کے ہمراہ یہ بھی لشکر اسلام میں لائی گئیں۔ آنحضرتؐ نے ان سے عقد کر لیا۔ اس سلسلہ میں محدثین و مورخین کی دو رائے ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ نے ریحانہ کو اسلام پیش کیا اور پردہ میں رہنے کی صورت ان سے نکاح کرنے کو کہا مگر انھیں یہ گوارہ نہ تھا۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے ان کا خیال ترک کر دیا۔ جیسا کہ ابن ہشام کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ :

"آپؐ نے پیشکش کی تھی کہ وہ آپ کی زوجیت قبول کر کے اپنے آپ پر پردہ عائد کر لیں۔ اس پر ریحانہ نے کہا تھا کہ رسول اللہؐ! آپ مجھے اپنی ملکیت ہی میں رہنے دیجئے، اس میں مجھے بھی سہولت رہے گی اور آپؐ کو بھی۔ چنانچہ آپؐ نے انھیں اسی حالت میں چھوڑ دیا، ریحانہ نے اپنے گرفتار ہونے کے بعد اسلام سے انحراف و احتراز کیا اور یہودیت ہی پر قائم رہنے کا خیال ظاہر کیا، اس پر آپؐ ان سے کنارہ کش ہو گئے"۔

(سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۸۲ ج: ۲)

[1] طبقات ابن سعد ص: ۲۱۰ ج: ۱

ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ نے ریحانہ کو دیگر قیدیوں سے الگ کر کے چند روز بعد ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیا جس کی بنیاد پر بعض مورخین نے لکھا ہے کہ " آنحضرتؐ لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے"۔ اور عیسائی مورخین نے اس بیان کو ناگوار صورت میں پیش کیا ہے۔ اور انتہائی مکروہ کلمات میں آنحضرتؐ کی کردار کشی کی ہے۔

دوسری رائے کے حامی محدثین و مورخین نے مذکورہ بالا رائے کو قطعی طور پر مسترد کیا ہے۔ زرقانی کا بیان ہے کہ :

" آنحضرتؐ نے ریحانہ کے ساتھ اس کے اسلام لانے کے بعد نکاح کر لیا اور بارہ اوقیہ (چاندی) اس مہر میں دیا اور محرم ۶ھ میں شرف قربت سے اس کو مشرف فرمایا اور سلمٰی بنت قیس نجاریہ کے گھر میں اس کو پردہ کے ساتھ رکھا ریحانہ کو پردہ میں رہنے سے بڑی غیرت آئی آنحضرتؐ کو اس کی آزادی اور بے حجابی ناگوار خاطر ہوئی۔ آپؐ نے اس کو طلاق رجعی دیدی، طلاق پا کر ریحانہ نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ نے اس کی گریہ و زاری پر رحم کر کے پھر اس کو زوجیت میں لے لیا۔ پھر اس وقت سے ریحانہ برابر آپؐ کی خدمت میں حاضر رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے جب آپؐ واپس آئے تو ریحانہ نے انتقال کیا۔ اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔ اس واقعہ کو واقدی اور ابن سعد وغیرہ نے نقل کیا ہے"۔

(زرقانی ص: ۱۵۸ ج: ۲ ترجمہ اسوۃ الرسول ص: ۵۵۳ ج: ۲)

واقدی نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کو مختار بنایا انہوں نے اسلام قبول کیا۔ تو آپؐ نے ان سے نکاح کیا اور واقدی نے اس کو اثبت کہا ہے۔[1] ابن سعد نے واقدی کی ایک روایت کے تحت خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ "پھر آنحضرتؐ نے مجھ کو آزاد کر دیا

[1] البدایہ ابن کثیر ص: ۳۰۵ ج: ۵۔

اور مجھ سے نکاح کر لیا"۔ امام زہری نے بھی زوجیت کی تائید کی ہے۔[1] سیرۃ ابن ہشام میں تحریر ہے کہ "اس واقعے کے متعلق دو رائے ہیں بعض اصحاب اصل واقعہ ہی کو غلط قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اسے درست سمجھتے ہیں ان کا فیصلہ بالاتفاق یہ ہے کہ رسول اللہ نے ریحانہ سے نکاح کیا تھا اور وہ آپ کی حیات میں وفات پا گئیں۔[2] علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر تفصیلی بحث کے بعد تحریر کیا ہے کہ "ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے کہ اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آئیں، تب بھی وہ منکوحات میں تھیں کنیز نہ تھیں۔[3]

الغرض مورخین و محدثین کے بیانات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رسالتمآبؐ نے ریحانہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد شرعی قاعدہ سے عقد فرمایا، مہر ادا کیا، ازواج مطہرات کی طرح پردہ میں رہنے کی تاکید فرمائی۔ چونکہ حجاب ان کی معاشرت کے خلاف تھا انھیں پسند نہ آیا۔ آنحضرت کو ان کی ناپسندیدگی ناگوار گزری لہٰذا آپؐ نے طلاق رجعی دیدی جو ریحانہ پر شاق گزری اور وہ معافی کی خواستگار ہوئیں، معاف کی گئیں اور زوجیت میں لے لی گئیں۔ اس دن سے موت کے دن تک ازواج مطہرات کی طرح خدمت میں حاضر رہیں۔ ۱۰ھ میں آنحضرتؐ کی حیات میں فوت ہوئیں اور البقیع میں دفن کر دی گئیں۔

اولادِ اکرام : جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے بارے میں علمائے اہلسنت کے اختلافی بیانات پائے جاتے ہیں۔ جمہور علمائے سیر کا قول ہے کہ آپؐ کے تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ جنکے نام قاسم، عبداللہ، ابراہیم فرزندان اور زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ زہرا دختران تھیں۔ ان میں سے ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ ص: ۳۰۹ ج: ۴، [2] سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۸۳ ج: ۲،
[3] سیرۃ النبیؐ ص: ۴۳۹ ج: ۱

تھے اور بقیہ تمام اولاد حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھی۔ آنحضرت کی کسی اور زوجہ سے آپؐ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سیرت نگاروں کا ایک قول یہ ہے کہ آپؐ کے چار فرزندان تھے مزید دو کے نام طیّب اور طاہر تھے۔ جبکہ بعض دیگر کا قول ہے کہ آپؐ کے چھ بیٹے تھے ان چار کے علاوہ دوسروں کے نام مطیّب و مطہر تھے۔

اس کے برعکس مرویات اہلبیت کے مطابق صلب رسالتمآبؐ سے حضرت خدیجہؓ کے صرف تین اولادیں ہوئیں۔ جن میں قاسم اور عبداللہ دو بیٹے اور فاطمہ زہراؑ ایک بیٹی تھیں، طیّب و طاہر جناب عبداللہ کے القاب تھے۔ یہ کسی دوسرے فرزندوں کے نام نہیں تھے۔ زینب، رقیہ اور ام کلثوم کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ ہالہ بنتِ خویلد کی بیٹیاں تھیں ہالہ اور ان کے شوہر ابو الہند کے مابین نزاع و اختلاف رہتا تھا۔ جس کے باعث ان کی گھریلو زندگی بہتر نہ تھی لہٰذا ہالہ نے اپنی تینوں لڑکیاں حضرت خدیجہؓ کے سپرد کر دیں۔ ابھی یہ لڑکیاں کم سن ہی تھیں کہ ہالہ کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد یہ لڑکیاں مستقلاً خانۂ خدیجہؓ میں ان کی زیرِ سرپرستی پرورش پاتی رہیں۔ اور ان کی بیٹیاں کہلائیں۔ حضرت خدیجہؓ کی نسبت سے یہ تینوں رسالتمآب کی بیٹیاں مشہور ہوئیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح زید بن حارثہ محاورۂ عرب کے مطابق آپؐ کے بیٹے سمجھے اور کہے جاتے تھے۔ بہر حال رسالتمآبؐ کی صلبی اولاد میں :-

۱۔ حضرت قاسم : سب سے پہلی اولاد تھے جو بعثت سے قبل پیدا ہوئے اور طفلی میں فوت ہو گئے۔ انہی کے نام پر آپؐ کی کنیت ابو القاسم ہے۔

۲۔ حضرت عبداللہ : ان کا لقب طیب و طاہر تھا۔ یہ بھی صغر سنی میں وفات پا گئے۔

۳۔ حضرت فاطمہ زہراؑ: اپنے دونوں بھائیوں سے چھوٹی اور آنحضرتؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کے مختصر حالات آگے مذکور ہیں۔

۴۔ حضرت ابراہیم: جناب ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ یہ آنحضرتؐ کی آخری اولاد تھے جو ماہ ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے ساتویں روز ان کا عقیقہ ہوا دو مینڈھے ذبح کئے گئے۔ سر منڈوایا، بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی گئی۔ بال زمین میں دفن کئے گئے اور ابراہیم نام رکھا۔ تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہ کر ۱۰ھ میں وفات پاگئے۔

جناب قاسم اور جناب عبداللہ کے طفلی میں فوت ہو جانے کا جتنا صدمہ جناب رسالتمآبؐ اور حضرت خدیجہؓ کو ہوا اتنا ہی دشمنان دین و مشرکین شاد ہوئے۔ وہ نسل پیغمبر کو ختم ہوتا دیکھ کر آپ کو ابتر یعنی بے اولاد ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عاص بن وائل سہمی کہا کرتا تھا کہ "وہ (آنحضرتؐ) تو ایک بے اولاد ہے اس کے بعد رہنے والا کوئی نہیں۔ یہ جب مر جائیگا تو اس کی نسل نہ رہے گی اور تمہیں اس سے آرام مل جائیگا"۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر نازل فرما کر اپنے حبیب کو تسلی دی اور جناب فاطمہ زہراؑ کے نور ولایت سے جہان کو روشن فرمایا۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی ذریت اور پاک نسل کو اس طرح مقدم فرمایا کہ دینِ اسلام کے امام رہبر و پیشواء تمام کے تمام اسی نسل سے وجود میں آئے اور فاطمہؑ کی اولاد کو رسول اللہ صلعم کی اولاد قرار دیا۔

حضرت فاطمہ زہراؑ: انسانی سیرت و کردار کے نمونے نہ تو مدارس و مکاتب میں تیار ہوتے ہیں اور نہ ہی جدوجہدِ حیات کی کارگاہوں میں بنتے ہیں۔ بلکہ یہ آغوش مادر میں پلتے اور مہر مادری کے قالب میں ڈھلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء و عقلاء نے اس قول "بہتر نسلوں کو وجود میں لانے کیلئے بہترین مائیں تیار کرو"۔ کو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا راز قرار دیا ہے۔ عورت صرف ایک ماں ہی نہیں ہوتی جو اپنی اولاد کی بہترین تربیت کرتی ہے بلکہ کبھی وہ ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنے والدین کی اطاعت و خدمت کے جذبہ سے سرشار دکھائی دیتی ہے تو کبھی ایک فرمانبردار رفیقہ حیات کی حیثیت سے اپنے شوہر کی خدمت و فرمانبرداری کرتی نظر آتی ہے۔ اور نسائیت کا کامل ترین نمونہ وہ عورت ہوتی ہے جو ہر حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو باحسن پورا کرتی ہے۔ تاریخ کے آئینہ میں اگر ہم کائنات کی ان تمام خواتین کے افعال و کردار کا جائزہ لیں جنہوں نے بنی نوعِ انسان کے افکار و اعمال پر گہرے اور لازوال اثرات مرتب کئے ہیں تو بلاشبہ سیدۂ عالم حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ذات مقدسہ کو بلند ترین مقام پر پاتے ہیں۔ جن کی بابت جناب نسیم امروہوی صاحب نے "تسبیح فاطمہ" کے عنوان سے کیا خوب نظم کہی ہے:

خاتون بارگاہ سیادت ہیں فاطمہ سرمایہ فروغ امامت ہیں فاطمہ
ختم الرسل کا اجر رسالت ہیں فاطمہ قرآن ہیں رسول تو آیت ہیں فاطمہ
بی بی پہ ہے طہارت و عصمت کا خاتمہ
بابا وہ ہے کہ جس پہ نبوت کا خاتمہ

ان معظمہ کے حالات و واقعات، فضائل و مناقب کو تفصیلاً لکھنے بیٹھیں تو مزید ایک جلد درکار ہوگی لہٰذا ہم یہاں انتہائی اختصار سے جناب عذرا بتول جگر گوشہ رسول سلام اللہ علیہا کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

ولادت باسعادت: جناب فاطمہ زہراؑ کے سنِ ولادت میں مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے آپ کی ولادت آنحضرتؐ کی ولادت کے اکتالیسویں سال میں بتائی ہے جبکہ بعض نے بعثت سے پانچ سال قبل بیان کی ہے۔[1] ابوالفرج اصفہانی نے تحریر کیا ہے کہ فاطمہ بعثت سے پہلے اس سال

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۳۶۰۔

متولد ہوئی جس سال خانہ کعبہ تعمیر ہوا۔[1] بعض نے دس جمادی الثانی بعثت سے دو سال قبل لکھا ہے۔[2] لیکن آئمہ اہلبیتؑ اور علمائے شیعہ کا متفقہ و مصدقہ فیصلہ ہے کہ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بیس جمادی الثانی ۴۶ عام الفیل ۶۱۵ء بعثت سے پانچ سال بعد بروز جمعہ اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئیں اور آپ کے نور سے کائنات منور ہوئی۔[3]

نام، القاب وکنیت: آپ کا نام مطہر فاطمہ ہے جبکہ القابات کثیر ہیں جن میں سے چند خاص یہ ہیں۔ بتول یعنی نسوانی نجاستوں سے پاک، زہرا یعنی سراپا نور، صدیقہ یعنی معصومہ، مبارکہ یعنی صاحب برکت در علم و فضل، کمالات و معجزات و اولاد کرام، طاہرہ یعنی پاکیزہ از صفات نقص، زکیہ یعنی بے مثال در کمالات و خیرات، راضیہ یعنی راضی بقضائے حق تعالیٰ، مرضیہ یعنی پسندیدۂ خدا، محدثہ یعنی فرشتوں سے کلام کرنے والی۔[4] آپ کی کنیت ام الحسن، ام الحسین، ام ابیہا وغیرہ تھیں۔

تربیت: آپ کی ابتدائی تربیت گاہ حضرت خدیجہؓ کی آغوش اور جناب رسالتمآبؐ کی گود تھی۔ آنکھ کھولتے ہی گھر میں تسبیح و تقدیس کا ماحول دیکھا۔ غریبوں پر رحم، انسانوں سے ہمدردی، لونڈی، غلاموں سے مساوی برتاؤ، حق کی تبلیغ، ظلم و ستم پر صبر و تحمل جیسے بے مثل عملی نمونوں کا ابتداء ہی سے مشاہدہ فرمایا۔ کم عمری میں والدین و دیگر اعزاء بنی ہاشم کے ہمراہ شعب ابیطالب میں مشکل ترین حالات میں تین سال گزارے۔ شعب سے واپس آئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ جناب خدیجہؓ نے رحلت فرمائی۔ پانچ، چھ سال کی عمر میں مادرِ مہربان کی شفقت سے محرومی جناب فاطمہ کیلئے صدمہ و قلق کا باعث ہوئی اور آپ اس حادثہ جانکاہ سے بے حد متاثر ہوئیں۔

[1] مقاتل الطالبین ص: ۳۰، [2] بحار الانوار ص: ۹ ج: ۴۳، منتہی الامال ص: ۱۵۷ ج: ۱، [3] زرقانی ص: ۱۹۳ ج: ۳، مناقب ابن شہر آشوب ص: ۳۵۷ ج: ۳، حیات القلوب ص: ۱۳۹ ج: ۲، کشف الغمہ ص: ۷۵ ج: ۲، تاریخ التواریخ ص: ۱۷ وغیرہ۔ [4] منتہی الامال ص: ۱۶۰ ج: ۱

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد گھر کے بہت سے کام کاج حضرت فاطمہؑ کی ذمہ داری بنے۔ حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالبؑ کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد رسالتمآبؐ پر قریش مکہ کے مظالم شدید ہو گئے۔ جناب فاطمہ زہراؑ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ایذاء رسانیوں کو دیکھ کر بے حد ملول و اشکبار ہو جاتیں تو رسالتمآبؐ فرماتے "بیٹا مت روؤ، مطمئن رہو خدا تیرے باپ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے گا اور کامیاب قرار دیگا"۔

بعثت کے تیرویں سال ہجرت کا واقعہ پیش آیا۔ رسالتمآبؐ شب ہجرت حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلا کر اور چند ہدایتیں دیکر مدینہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس کے چند دن بعد فرمان رسالت کے مطابق حضرت علیؑ نے اپنی مادر گرامی حضرت فاطمہ بنت اسد، بنتِ رسول حضرت فاطمہ زہراؑ اور دیگر خواتینِ بنی ہاشم کو لیکر مکہ سے ہجرت کی۔

شادی: مدینہ آئے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ دختر پیغمبر کیلئے اکابر و اشراف قریش کے رشتے آنے لگے۔ لیکن آنحضرتؐ نے خاموشی اختیار کی۔ ان خواستگاروں میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے جنہیں رسالتمآبؐ نے جواب دیا کہ اس معاملہ کا اختیار اللہ کو ہے۔ میں فاطمہؑ کے عقد کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بالآخر ایک روز حضرت علیؑ خدمتِ رسولؐ میں حضرت فاطمہؑ کی خواستگاری کے قصد سے حاضر ہوئے۔ اس وقت رسالتمآبؐ حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؑ بعد سلام کے آپؐ کے روبرو دو زانوں بیٹھ گئے۔ شرم دامنگیر تھی اپنا ارادہ ظاہر نہ کر سکے۔ آنحضرتؐ نے سکوت توڑا اور فرمایا "اے علی! گویا تم کسی کام کیلئے میرے

پاس آئے ہو۔ جس کا اظہار کرنے میں شرم کر رہے ہو۔ بغیر ہچکچاہٹ کے اپنی حاجت بیان کرو"۔ تب حضرت علیؑ نے نہایت ادب و احترام سے عرض کی۔ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں آپ کے گھر میں جوان ہوا، آپ کے الطاف سے مستفید رہا، آپ نے میری تربیت میں ماں باپ سے بھی زیادہ کوشش فرمائی۔ آپ کے وجود مبارک سے میں نے ہدایت پائی۔ یا رسول اللہ میری دنیا و آخرت کی پونجی آپ ہی ہیں۔ میں اپنی خانگی زندگی کو تشکیل دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مصلحت دیکھیں تو اپنی دختر جناب فاطمہؑ کو میرے عقد میں دیدیں جس سے مجھے ایک بہت بڑی سعادت نصیب ہو گی۔ حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ "یہ سنتے ہی آنحضرتؐ کا چہرہ شگفتہ ہو گیا اور آپؐ نے مسکرا کر فرمایا، "اے علیؑ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا تمہیں مژدہ ہو کہ حق تعالیٰ نے قبل اس کے کہ میں فاطمہ کا تم سے عقد کروں تمہارا عقد فاطمہ کے ساتھ عرش عظیم پر کر دیا ہے۔ میں بیشک اس معاملہ میں پروردگار کے حکم کی تعمیل کروں گا"۔ الغرض یکم ذی الحجہ ۲ھ کو جناب فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ کے عقد کے مراسم انجام پائے۔[1]

خطبہ پڑھا نبیؐ نے جو حمد و ثنا کے ساتھ　آئے ملک بھی نعرۂ صلی علیٰ کے ساتھ
باندھا قلیل مہر جو حق کی رضا کے ساتھ　غل تھا عطا کا جوڑ ملا اہل اتیٰ کے ساتھ

حق کی رضا سے مرضی خیر الانام سے
تسبیح پاک کا ہوا رشتہ امام سے

کفو : قول رسول، بقول "اگر علی نہ ہوتے تو فاطمہ کا کفو نہ ہوتا" آپ کا یہ جملہ تقریباً تمام مستند کتب میں درج ہے۔ اس جملے کے لفظ "کفو" سے عام طور پر لوگ نسب کی برابری کا مطلب لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ صرف خاندانی شرافت ہی علیؑ و فاطمہؑ کے کفو ہونے کا معیار ہے درآنحالیکہ احکام الٰہی

[1] مناقب ابن شہر آشوب ص : ۳۴۹ ج : ۳،

اور اقوال و اعمال پیغمبرؐ کی روشنی میں صرف نسبی یکسانیت ہی کافی نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ عمل صالح نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رسالتمآبؐ نے جناب فاطمہؑ سے حضرت علیؑ کے فضائل اخلاق کی تعریف فرمائی اگر صرف نسبی شرافت ہی پیش نظر ہوتی تو آپؐ اوصاف بیان کرنے کے بجائے فرماتے کہ بیٹی جسے میں نے تیرے عقد کیلئے منتخب کیا ہے وہ نسب میں تیرے برابر ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، لہٰذا مذکورہ قول رسولؐ میں کفو سے مراد یہ ہے کہ جو اوصاف کمالیہ فاطمہؑ میں پائے جاتے تھے وہ امت میں سوائے حضرت علیؑ کے اور کسی میں نہیں تھے۔ فاطمہؑ شرک و بت پرستی سے پاک تھیں یہ فضیلت علیؑ کو بھی حاصل تھی۔ فاطمہؑ کی تعلیم و تربیت رسالتمآبؐ نے فرمائی یہ شرف علیؑ کو بھی میسر تھا۔ اسی طرح زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، عصمت و طہارت وغیرہ ہر فضیلت میں فاطمہؑ و علیؑ یکساں تھے۔ مزید یہ کہ نسبی و خاندانی شرف میں بھی برابر تھے۔

طرزِ زندگی : حضرت فاطمہؑ کی زندگی کا ہر عمل اور ہر قدم امت کی عورتوں کیلئے بہترین مثال اور اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور آپ کا گھر کامل ترین اسلامی درسگاہ ہے۔ جس میں امور خانہ داری، شوہر کی اطاعت، بچوں کی پرورش سے متعلق جملہ امور کی ادائیگی کے ساتھ عبادت و ریاضت، صبر و شکر کے کارآمد و مفید سبق ملتے ہیں۔ جناب فاطمہؑ اپنے گھر کے تمام کام خود انجام دیتی تھیں۔ بچوں کی ولادت کے بعد جن میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اور آپؑ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ فاطمہؑ کی زندگی فقر و فاقہ میں کٹی مگر حرف شکایت زبان پر نہ آیا۔ کہنے کو تو یہ بہت آسان ہے مگر فاقہ کی تکلیف اتنی شدید ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مستقل مزاج بلبلا اٹھتے ہیں۔ بھوک کی اذیت اور روزی کی فکر انسان کو فرائض کی ادائیگی سے غافل کر دیتی ہے۔ مگر جناب فاطمہؑ کا یہ خاص جوہر تھا کہ آپؑ تین تین وقت کے فاقوں میں بھی نفس

مطمئنہ کے ساتھ اپنے فرائض ادا فرماتی تھیں۔ الغرض جناب فاطمہؑ نے نہایت عسرت و تنگدستی میں زندگی بسر کی۔

تسبیح فاطمہؑ : حضرت زینبؑ کی ولادت کے بعد جناب فاطمہؑ کے امور خانہ داری بہت بڑھ گئے تھے لہٰذا ایک روز جناب فاطمہؑ اور حضرت علیؑ باہم مشورہ کر کے رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپؐ سے ایک خادمہ عنایت کرنے کی درخواست کریں مگر رسالتمآبؐ کے گرد مسلمانوں کا مجمع ہونے کے باعث مدعا بیان کئے بغیر واپس لوٹ آئے۔ رسالتمآبؐ فارغ ہو کر خود فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے اور ان سے آنے کا سبب دریافت کیا تب جناب فاطمہؑ نے تفصیل بیان کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "اے فاطمہ! میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں جو خادمہ سے بدرجہ بہتر ہے۔ جب تم سونے لگو تو ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھ لیا کرو"۔[1] حضرت فاطمہؑ یہ سن کر خوش ہوئیں اور اس دن سے مرتے دم تک یہ ورد نہ چھوڑا۔ حضرت علیؑ بھی ہمیشہ اس تسبیح کو پڑھا کرتے تھے۔

صدیقہ و زکیہ ہے چوتھی آیا مرضیہ و رضیہ و زہرا و راضیہ
ہے مصحف حجاب و حیا نفس زاکیہ آیا ہے جسکا سورۂ مریم سا حاشیہ

حیدر میں یہ صفت ہے نہ شاہِ حجاز میں
تسبیح فاطمہؑ کی ہے شامل نماز میں

جناب رسالتمآبؐ نے فتح خیبر کے بعد جناب فضہ کو آپ کی خدمت گزاری کیلئے مامور فرمایا۔ مگر جناب فاطمہؑ نے فضہ کو کنیز کے بجائے برابر کے ایک رفیق کا درجہ دیا۔

بعد وفاتِ رسول : جناب رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد جناب فاطمہؑ کو اتنی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائی گئیں کہ باوجود صابرہ و شاکرہ ہونے کے حرف شکایت آپؑ کی زبان پر آہی گیا کہ:

[1] منتہی الآمال ص : ۱۶۳ ج : ۱

صبت علی مصائب لوانها　صبت علی الایام صرن لیا لیا

"اے بابا! آپؐ کی وفات کے بعد میرے اوپر وہ مصیبتیں ڈھائی گئیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ بھی تاریک رات کے مانند ہو جاتے" جناب فاطمہؑ کے ان مصائب کو متعدد مستند مورخین نے تفصیلاً تحریر کیا ہے۔ جن میں طبری، علامہ سیوطی، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ہم یہاں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب "رویائے صادقہ" کے اقتباس پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

"جو شخص (وفات رسول سے) سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ فاطمہؑ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے اور باپ بھی کیسے۔ دین و دنیا کے بادشاہ، ایسے باپ کا سایہ سر سے اٹھنا۔ اس پر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم رہنا۔ ترکۂ پدری باغ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمے کا ہار جانا۔ کسی دوسرے کو ایسے صدمات پہنچتے تو زہر کھا کر مر رہتا مگر ان کے صبر و ضبط انہیں کے ساتھ تھے۔ پھر انہی رنجوں میں گھل گھل کر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جنہوں نے رنج دیئے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازے پر آنے کی منادی کرا دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں سخت افسوس کی بات ہے کہ اہلبیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم واقعات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب و لحاظ جو ہونا چاہیے تھا اس میں ضعف آ گیا اور وہ شدہ شدہ منجر ہوا۔ اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرح جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے وہ ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے"۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ جناب فاطمہؑ باپ کی وفات کے بعد چند مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہیں اور اس تھوڑی مدت میں بھی اتنی روئیں

کہ آپؑ کو زیادہ رونے والوں میں سے ایک قرار دیا گیا آپ کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا گیا۔[۱]

وفات : جناب فاطمہؑ وفاتِ رسولؐ کے بعد کُل پچھتر دن زندہ رہیں اس تین ماہ کی مختصر مدت میں آپ کو تین بدترین مصائب کا مقابلہ و مبارزہ کرنا پڑا۔ اول یہ کہ رسالتمآبؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی سقیفہ کی کاروائی کے ذریعہ رسول اللہؐ کے تمام احکامات کو پسِ پشت ڈال کر خلافت کو علیؑ سے دور کر دیا گیا۔ دوئم یہ کہ حضرت علیؑ سے بیعتِ خلافت حاصل کرنے کیلئے فاطمہؑ کے بیت الشرف کا محاصرہ اور اسے آگ لگانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ سوئم یہ کہ رسالتمآبؐ کا بیٹی کو ہبہ کردہ باغ فدک پر ناجائز قبضہ کے ذریعہ فاطمہؑ زہرا کو وراثتِ پدری سے محروم کر دیا گیا۔ یہی وہ عوامل تھے جنکی اذیت سے جناب فاطمہؑ حزن و ملال اور روحانی فشار کا شکار ہو کر بیمار رہنے لگیں۔ اور آخر کار چالیس روزہ علالت کے بعد ۱۴ جمادی الاوّل ۱۱ھ کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاویدانی کی طرف کوچ فرما گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

جناب فاطمہ زہراؑ کی تاریخِ وفات میں مورخین نے بڑا اختلاف کیا ہے مثلاً شیخ محمد عباس قمی نے منتھی الامال میں تیسری جمادی الثانی لکھی ہے۔ ابنِ شہر آشوب نے مناقب میں تیرہ ربیع الثانی بیان کی ہے۔ جبکہ سبط ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں، طبری نے تاریخِ طبری میں، علامہ باقر مجلسی نے بحار الانوار میں تیسری رمضان رقم کی ہے۔ محمد تقی سپہر نے ناسخ التواریخ میں ستائیس جمادی الاوّل بیان کی ہے۔ اسکے علاوہ اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ حضرت فاطمہؑ جناب رسالتمآبؐ کی وفات کے کتنے دن بعد تک زندہ رہیں۔ روایتوں میں ۷۵ دن، ۹۵ دن، ۷۰ دن، ۳ مہینے اور ۶ مہینے تک وارد ہوئے ہیں ان میں ۷۵ دن اور ۹۵ دن کی روایتوں کو ترجیح دی گئی ہے۔

[۱] طبقات ابن سعد ص: ۸۵ ج: ۲

ہمارے خیال میں لوگوں نے جناب فاطمہؑ کی تاریخِ وفات کا تعین کرنے میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ آپؑ نے رسالتمآبؐ کی وفات کے کتنے دن بعد رحلت فرمائی۔ اور چونکہ رسالتمآبؐ کی تاریخِ وفات میں کثیر اختلاف موجود ہے۔ لہٰذا جناب فاطمہؑ کی تاریخِ وفات میں بھی اختلاف رونما ہوا۔ ویسے حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جناب فاطمہؑ پیغمبرؐ کے بعد پچھتر دن زندہ رہیں"۔[۱] ہمارے لئے سب سے معقول و مستند قول یہی ہے اور چونکہ جناب رسالتمآبؐ کی تاریخِ وفات ۲۸ صفر ۱۱ھ ہے لہٰذا جناب فاطمہ کی صحیح ترین تاریخِ وفات ۱۴ جمادی الاوّل ۱۱ھ قرار پاتی ہے۔

وفات سے قبل جناب فاطمہؑ نے حضرت علیؑ سے چند وصیتیں فرمائیں تھیں ان میں تدفین سے متعلق یہ تھیں۔

۱۔ اے علیؑ! آپ خود مجھے غسل دیں، کفن پہنائیں اور دفن کریں گے۔

۲۔ جن سے میں ناراض ہوں ان کو میرے جنازہ میں شریک نہ ہونے دیں۔

۳۔ میرا جنازہ شب کی تاریکی میں اٹھائیں۔[۲]

حضرت علیؑ نے ان وصیتوں پر عمل کرتے ہوئے خود ہی میت کو غسل دیا کفن پہنایا اور بنی ہاشم کے چند اعزاء قریب کے ہمراہ نمازِ جنازہ پڑھی اور رات کی تاریکی میں انتہائی خاموشی کے ساتھ میت دفن کر دی۔ چونکہ وصیت کے مطابق فاطمہ زہراؑ کی قبر کو مخفی رکھنا تھا لہٰذا حضرت علیؑ نے قبر کو زمین سے ہموار کر کے نشانِ قبر مٹا دیا۔ اس ضمن میں علماء کی چار مختلف آراء ہیں :

۱۔ اوّل یہ کہ فاطمہؑ کو روضۂ رسولؐ میں دفن کیا گیا جیسا کہ علامہ مجلسی نے محمد بن ہمام اور جناب فضہ سے نقل کیا ہے کہ جناب فاطمہؑ کی نمازِ جنازہ روضہ میں پڑھی اور آپؑ روضۂ رسولؐ ہی میں دفن ہوئیں اور شیخ طوسی کا

[۱] اصول کافی ص: ۲۲۱ ج: ۱ [۲] استیعاب ص: ۷۷۳ ج: ۲، امہات الامۃ ص: ۹۹

بیان ہے کہ بظاہر جناب فاطمہؑ کو رسول اللہؐ کے روضہ میں یا اپنے گھر میں دفن کیا گیا۔

۲۔ دوئم یہ کہ جناب فاطمہؑ کو ان کے اپنے گھر میں دفن کیا گیا تھا اور جب مسجد نبوی میں توسیع کی گئی تو جناب فاطمہؑ کی قبر مسجد میں آ گئی۔ یہ بیان علامہ مجلسی نے ابنِ بابویہ اور محمد بن ابی نصر سے نقل کیا ہے۔

۳۔ سوئم جیسا کہ کشف الغمہ، عیون المعجزات، تذکرۃ الخواص وغیرہ کے مولفین نے بیان کیا کہ "مشہور یہی ہے کہ فاطمہ کو بقیع میں دفن کیا گیا اور یہ اس لئے سمجھا گیا کہ حضرت علیؑ نے چالیس تازہ قبریں بقیع میں بنائیں تھیں اور جب بعض نے ان قبروں میں سے جناب فاطمہؑ کے جنازہ کو نکالنے کا ارادہ کیا تو حضرت علیؑ غضبناک ہو گئے تھے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ ان قبروں میں سے ایک قبر جناب فاطمہؑ کی تھی"۔

۴۔ چوتھے یہ کہ آپؑ کو عقیل کے گھر کے قریب دفن کیا گیا تھا جیسا کہ ابنِ جوزی نے عبداللہ بن جعفر کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

علماء و محققین کا قول ہے کہ ان چاروں احتمالات میں سے پہلا اور دوسرا احتمال ترجیح رکھتا ہے۔

اولاد : جناب فاطمہ زہراؑ کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ امام حسن ۱۵ رمضان ۳ھ کو، امام حسین ۳ شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے۔ جناب زینب یکم شعبان ۶ھ اور ام کلثوم ۹ھ میں پیدا ہوئیں۔ جبکہ ۱۱ھ میں جناب محسن بطنِ مادر مبارک میں شہید ہو گئے۔ جناب زینبؑ کا عقد جناب عبداللہ بن جعفر سے اور جنابِ ام کلثومؑ کا عقد جناب محمد بن جعفر سے ہوا۔

فضائل : جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ ہم ذیل میں چند فضائل تحریر کر رہے ہیں :

"جمیع بن عمیر کا بیان ہے کہ وہ اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں گئے اور ان سے دریافت کیا کہ آنحضرت کو سب لوگوں میں کون زیادہ پیارا تھا۔ انہوں نے فرمایا جناب فاطمہؑ۔ پھر دریافت کیا مردوں میں سے کون زیادہ پیارا تھا۔ انہوں نے فرمایا ان کے شوہر یعنی علی ابن ابطالب"۔
(جامع ترمذی ص: ۶۷۴)

"جناب فاطمہ رسول اللہ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ بارہا آپؐ نے فرمایا ہے کہ اے فاطمہ! کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تو تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہے سوائے مریم کے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ سفر میں جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؑ سے ملتے اور جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ کے پاس جاتے"۔
(زرقانی ص: ۲۰۳ ج: ۳)

"آنحضرت نے فرمایا فاطمہ تو راضی نہیں ہوتی ہو کہ تو سب اہلِ جنت کی عورتوں کی سردار اور سب مومنین کی عورتوں کی سردار ہو"۔
(صحیح مسلم ص: ۲۹۱ ج: ۲)

"انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا جہاں کی عورتوں میں تجھ کو فضل و شرف کے اعتبار سے یہ عورتیں کفایت کرتی ہیں۔ مریم بنت عمران، خدیجہؓ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمدؐ اور آسیہ فرعون کی بیوی"۔
(مشکوٰۃ ص: ۳۶۸ ج: ۳)

"انس بن مالک سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا نے فرمایا کہ میں نے اس لئے فاطمہؑ نام رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوزخ کی آگ سے جدا کیا"۔ (ارجح المطالب ص: ۳۰۷)

"انس بن مالک اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب فاطمہؑ مثل بدرِ کامل کے تھیں یا مانند آفتاب کے تھیں جبکہ وہ بادلوں میں چھپ کر باہر نکلے تو کتنی شان سے نور پھیلاتا ہے"۔ (مستدرک ص: ۱۶۴ ج: ۳)

"پیغمبر نے فرمایا فاطمہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھ کو اذیت دی"۔
(صحیح بخاری ص: ۳۸ ۳ باب ۲۰، ص: ۲ ۰ ۳ باب: ۲۱۰، صحیح مسلم ص: ۲۹۰ ج: ۲، جامع ترمذی: ص: ۲۷۵، مستدرک ص: ۱۸۴ ج: ۳)

واقعہ کربلا اپنی نوعیت کا وہ واحد سانحہ ہے جسکی مثال تاریخ اسلام میں تو کیا
تاریخ انسانیت میں بھی ملنا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد عربی کا کلمہ پڑھنے والے
ماہ محرم الحرام میں ہمیشہ ذکر حسین سے مظلوم کربلا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

کربلا اور کربلا کے بعد

مولفہ: ام تقضی بن رضا نواز پوری

ایک ایسی کتاب ہے جس میں معتبر اور مستند کتب کے حوالہ جات کی روشنی میں
★ اسیہ کا ماتم ★ اہل بیت کے اطراف اور زمین ★ قافلے کے مراحل
★ شہادت حسین کے اثرات ★ شہر اسیران کربلا کا اعلان حق ★ قاتلان حسین کا انجام
باطل فرقوں کی موشگافیاں اور کربلا سے متعلق دیگر واقعات باترتیب بیان کئے گئے ہیں

یہ کتاب عمدہ کتابت و طباعت دیدہ زیب سرورق اور
غیر جانبدارانہ مضامین کی بدولت ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

قیمت : ۵۰ روپے

مکتبہ الشہباز
۵ ڈی اے، معاون مارکیٹ،
کمرشل ایریا ناظم آباد نمبر ۲، کراچی
فون نمبر: ۶۲۳۹۸۸

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

ولادت : حضرت علی کرم اللہ وجہہ ماہ رجب المرجب کی تیرھویں تاریخ ۳۰ عام الفیل بروز جمعۃ المبارک وقت چاشت (صبح) اللہ کے مکرم و محترم گھر میں عالم ارواح سے عالم آب و گل میں جلوہ فرما ہوئے۔ ولادت مولود کعبہ کی بابت ہمارے پیش نظر اتنی کثیر تعداد میں قدیم و جدید علمائے حدیث و تاریخ کے مرقومات ہیں کہ انتخاب دشوار ہے کیونکہ ہر بیان اہم اور ہر بیان کرنے والا محترم و معتبر ہے۔ بہر حال چند اقتباسات نذر قارئین ہیں۔
ابو الموفق بن احمد معروف باخطیب خوارزمی بیان کرتے ہیں کہ ترجمہ:

"علی مکہ شریف میں خاص کعبہ کے اندر پیدا ہوئے جمعہ کے دن تیرھویں کو خدا کے اس مہینہ میں کہ جس میں رحمت الٰہی کی بارش ہوتی ہے ۳۰ عام الفیل ۲۳ برس ہجرت سے پہلے اور بعض نے بارہ اور بقول دس سال قبل بعثت کہا ہے اور ان حضرت کے سوا خانہ کعبہ میں ان سے پہلے کوئی نہیں پیدا ہوا۔ یہ وہ فضیلت ہے جس سے خدا نے ان حضرت کو خاص کیا! جلالت قدر اور بلندی مرتبہ کیلئے"۔
(مجمع البحرین ص: ۲۲۷ طبع پٹنہ ۱۲۹۴ھ)

کمال الدین ابو سالم قاضی محمد بن طلحہ شافعی رقمطراز ہیں کہ ترجمہ:

"آپ کعبہ میں خاص بیت الحرام کے اندر پیدا ہوئے اور آپ کی ولادت پیغمبر خدا کے حضرت خدیجہ کے ساتھ شادی کے تین برس بعد ہوئی اور پیغمبر خدا کی عمر اس دن اٹھائیس برس تھی"۔
(مطالب السئول ص: ۳۷، ۱۳۰۲ھ)

شمس الدین ابو المظفر یوسف بن قزعلی معروف باسط ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں کہ ترجمہ:

"فاطمہ بنت اسد طواف خانہ کعبہ میں مشغول تھیں اور حمل سے تھیں پس درد زہ شروع ہوا تو ان کے لئے کعبہ کا در وا ہوا اور وہ اندر داخل ہو گئیں اور بچہ کعبہ میں پیدا ہوا"۔
(تذکرۃ الخواص ص: ۷ طبع ایران ۱۲۸۵ھ)

ملا علی قاری حنفی کا بیان ہے کہ ترجمہ:

"اور مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت علی کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔ خدا نے ان کے چہرہ کو بزرگ قرار دیا"۔
(شرح شفا ص: ۱۵۱ جز اول طبع مصر ۱۳۱۹ھ)

علامہ نور الدین حلبی شافعی رقمطراز ہیں کہ ترجمہ:

"اور ۳۰ ولادت پیغمبر خدا سے علی بن ابطالب خدا ان کے چہرہ کو بزرگ کرے کعبہ میں پیدا ہوئے"۔
(سیرہ حلبیہ ص: ۱۱۷ جز سویم طبع مصر ۱۲۸۰ھ)

مولوی اشرف علی بن عبد الولی جو بوہریوں کے جلیل ترین عالم گذرے ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ ترجمہ:

"پیدا ہوئے علی جمعہ کے دن ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل میں ہجرت سے ۲۳ یا ۲۵ برس پہلے اور ان حضرت کی پیدائش کعبہ میں ہوئی اور وہ پہلے شخص ہیں جو کعبہ میں پیدا ہوئے اور ان کے سوا کسی کی کعبہ میں پیدائش نہیں ہوئی"۔ (ریاض البیان ص: ۱۱۱ ج: ۱ طبع بمبئی ۱۲۷۷ھ)

شاہ ولی اللہ احمد بن عبد الرحیم محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ ترجمہ:

"اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علی فاطمہ بنت اسد کے شکم سے کعبہ کے اندر ۱۳ رجب روز جمعہ ۳۰ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور کعبہ میں ان کے سوا کوئی دوسرا بچہ پیدا نہیں ہوا۔ نہ ان سے پہلے نہ بعد"۔ (ازالۃ الخفاء ص: ۲۵۱ ج: ۲ طبع بریلی)

مولوی محمد مبین حنفی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ ترجمہ:

"کرامتوں کا وہ خزانہ جمعہ کے دن رجب کی تیرھویں ۲۸ یا ۳۰ برس بعد عام الفیل کے مکہ میں پیدا ہوا روایت ہے کہ ان کی ولادت بیچ کعبہ میں ہوئی اور اندرون کعبہ ان کے سوا کوئی پیدا نہیں ہوا خدا نے اس فضیلت سے ان کو خاص قرار دیا اور کعبہ کو اس شرف سے مشرف کیا"۔
(وسیلۃ النجات ص: ۶۰ طبع لکھنو ۱۸۹۵ء)

حضرت علی کی کعبہ میں ولادت سے متعلق متعدد بزرگوں نے عقیدت مندانہ اشعار کہے ہیں ان میں سے چند کے اشعار ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک رباعی:

روزیکہ بکعبہ مرتضیٰ پیدا شد سبحان اللہ ۔۔۔ در کون و مکان جلوہ نما پیدا شد صلوات اللہ
جبریل ز آسماں فرود آمد و گفت اے ختم رسل ۔۔۔ فرزند خانہ خدا پیدا شد واللہ باللہ
(ریاض الفردوس ص: ۱۷ طبع نول کشور ۱۸۶۶ء)

محبوب الٰہی سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے مشہور قصیدے میں سے:

اگر خواہی کہ در محشر شفیعت مصطفیٰ باشد ۔۔۔ قسیم جنت و دوزخ علی مشکل کشا باشد
امامت را کسی شاید کہ شاہ اولیا باشد ۔۔۔ بعہد و عصمت و دانش امثال انبیاء باشد
امام دین کسے باشد کہ در وقت ولادت او ۔۔۔ بود در کعبہ و کعبہ ز کعبش صفا باشد [1]

فقیر ظہیری کے عقیدتمندانہ اشعار:

دھوم ہے عالم میں شاہ لافتیٰ پیدا ہوئے ۔۔۔ سرور دنیا و دین مشکل کشا پیدا ہوئے
حضرت عیسیٰ ہوئے بیت المقدس سے جدا ۔۔۔ اور کعبہ میں علی مرتضیٰ پیدا ہوئے
فرض بوسہ سنگ اسود کا ہوا اس واسطے ۔۔۔ اس کے پہلو میں علی مرتضیٰ پیدا ہوئے
ناف کعبہ میں گڑا اللہ ری شان بوتراب ۔۔۔ سچ یہ ناف زمین پر مرتضیٰ پیدا ہوئے
(ظہیر البشر در فضائل النبی عشر ص: ۱۸ طبع بدایوں ۱۹۰۸ء)

[1] یہ قصیدہ ۳۴ شعروں پر مشتمل ہے اور تاریخ شیعہ حصہ سویم میں مکمل درج ہے۔

نام و نسب : ابن اعرابی کا قول ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے اپنے باپ کے نام پر آپ کا نام اسد رکھا۔ جب کہ عطا کا کہنا ہے کہ جناب فاطمہ بنت اسد نے آپ کا نام حیدر رکھا جس کی دلیل ہے کہ جنگ خیبر کے روز حضرت علیؑ نے رجز میں فرمایا کہ میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا ہے۔ آپ کے والد جناب ابو طالب نے آپ کا نام اپنے جد قصیٰ کے نام پر زید رکھا تھا جبکہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کا نام علی رکھا اور یہی نام مشہور و معروف ہوا۔ آپ کے نام لقب و کنیت کی بابت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ ترجمہ :

" علی بن ابیطالب کا نام انکی ماں فاطمہ بنت اسد نے حیدر اپنے باپ اسد کے نام پر رکھا اور جب ابو طالب آئے اور ان کو یہ نام پسند نہ آیا تو انھوں نے علی رکھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق نام رکھا جیسا کہ ریاض النضرہ میں ہے اور کنیت رکھی ابوالریحانتین اور یعسوب البلد' امین' شریف' ہادی' مہدی' ذوالاذن الواعیہ اور یعسوب الامہ لقب رکھے اور راویوں کا بیان ہے کہ ولادت ان حضرت کی اندرون کعبہ ہوئی "۔

(مدارج النبوہ ص :۵۳۱ ج :۲)

آپ کے حسب و نسب کا کیا کہنا جو نبی کا نسب وہ علی کا نسب' علی و نبی کا حسب ایک نسب ایک' اصل ایک فرع ایک' علی و نبی دونوں قریشی' دونوں ہاشمی اور دونوں مطلبی۔ علی کے بھائی نبی' نبی کے بھائی علی' علی کے باپ نبی کے سگے چچا اور نبی کے باپ علی کے حقیقی چچا۔ علی کی ماں فاطمہ بنت اسد جناب ہاشم کی پوتی' عبدالمطلب کی بھتیجی اور عبداللہ و ابو طالب کی چچیری بہن۔ قرشیت پھر ہاشمیت اور اس کے ساتھ مطلبیت شرافت عرب کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔

کنیت و القاب : آپ کے فرزندان حسن، حسین اور محمد حنیفہ کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوالحسن، ابوالحسین اور ابو محمد تھیں۔ انکے

علاوہ رسالتمآبؐ نے جن کنیتوں سے آپ کو نوازا تھا ان میں ابوالریحانتین جسکی بابت جابر کی روایت ہے کہ وفات سے تین روز قبل رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا اے ابا الریحانتین تجھ پر سلام ہو میں تجھے اپنے دونوں پھول کے پودوں کیلئے وصیت کرتا ہوں عنقریب تیرے دونوں رکن جاتے رہیں گے۔ جب آنحضرتؐ نے وفات پائی تو حضرت علیؑ نے فرمایا ان دونوں میں سے یہ پہلا رکن تھا۔ اسکے بعد جب جناب فاطمہ زہراؑ نے رحلت فرمائی تب آپ نے کہا یہ دوسرا رکن تھا۔ آپ کی مشہور ترین کنیت ابوتراب ہے حضرت علیؑ کو یہ کنیت سب سے زیادہ پسند تھی جب کوئی اس کنیت سے آپ کو مخاطب کرتا تو آپ بہت خوش ہوتے تھے۔ آپ کی ایک کنیت ابوالسبطین تھی۔ جسکی بابت ابن عباس کی روایت ہے کہ " ایک روز جناب رسول خدا صلعم خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ آپ رونے لگے اور فرمایا علی کہاں ہیں جناب امیرؑ فوراً اپنے دونوں پیروں پر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے یارسول اللہ میں یہاں ہوں۔ آپؐ نے نزدیک بلایا اور سینہ سے لگالیا پھر باآواز بلند ارشاد فرمایا اے گروہ اسلام یہ علی بن ابیطالب شیخ المہاجرین والانصار ہے یہ میرا بھائی اور ابن عم ہے اور میرا داماد اور میرا گوشت اور میرا خون ہے یہ ابوالسبطین (یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا باپ) ہے جو اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہیں یہ مجھ سے تکلیف کو دور کرنے والا ہے یہ خدا کی زمین پر خدا کا شیر ہے اور اس کے دشمنوں کیلئے اس کی برہنہ شمشیر ہے۔ اس کے دشمنوں پر خدا اور خدا کے فرشتے لعنت کرتے ہیں اللہ اُن سے بیزار ہے میں ان سے بیزار ہوں پس اگر کوئی خدا اور میری بیزاری کو چاہتا ہو وہ اس سے بیزاری اختیار کرے۔ تم حاضرین میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ غائبوں کو اس سے آگاہ کرے "۔[1]

حضرت علیؑ کے القاب کثیر ہیں جناب وزیر علی خاں صاحب نے وظائف المومنین میں ایک سو پچیس القابات تحریر کئے ہیں۔ جبکہ دیگر کتب

[1] ارجح المطالب ص : ۱۴

میں ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ ہم یہاں چند القابات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ مرتضیٰ، مشکل کشاء، اسداللہ، یداللہ، اسد رسول اللہ، بدرالدجیٰ، سراج الانبیاء، تاج الاولیا، صاحب لواء، زوج بتول، داماد رسول، مخزن سرسلونی، معدن علم لدنی، شاہ مردان، شیر یزدان، سرور دین، صالح المومنین، قاتل الناکثین والقاسطین، یعسوب دین، حلال مشکلات، شافع یوم لحساب، کاشف الکرب، بیضۃ البلد، شاہ نجف، شہسوار لوکشف، پیر پیران، میر میراں، حاکم نص جلی، صادق و صدیق، مصدق و معین، حیدر و صفدر، ذوالقرنین و ساقی کوثر، تقیؔ و ولی، وصی و رضی، ہادی و حامی، کرار و جرار، دلاور و بہادر، ناصر و انزع، وغیرہ۔

طفولیت و تربیت : حضرت علیؑ کی ولادت کے بعد جب فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ سے گھر تشریف لائیں تو جناب رسالتمآبؐ مولود مسعود کو دیکھنے کیلئے اپنی چچی کے پاس پہنچے اور اس نو مولود کو لینے کیلئے ہاتھ بڑھائے تو وہ بھی آپ کی طرف جھکے۔ آپ نے ہاتھوں میں لے لیا اس طرح مولود کعبہ امین الٰہی کی آغوش میں آگئے۔ آپ دیر تک کھلاتے رہے۔ جناب رسالتمآبؐ ابتداء ہی سے اس نو مولود سے خصوصی محبت و الفت کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ کیونکہ علی بھی اسی نور کا ٹکڑا تھے جسکا رسالتمآبؐ تھے۔ جیسا کہ ارشاد پیغمبر ہے کہ " انا وعلی من نور واحد "[1] یعنی میں اور علی ایک ہی نور سے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا محبتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ نو مولود کی عمر بڑھتی گئی۔ طاقت و توانائی میں غیر معمولی اور حیرت انگیز اضافہ ہوتا گیا۔

عام طور پر مورخین نے بیان کیا ہے اور ہم بھی اس کتاب کی جلد اول میں تحریر کرآئے ہیں کہ جب حضرت علیؑ کی عمر پانچ سال تھی مکہ شہر

[1] فردوس الاخبار ص :۵۱، ریاض النضرہ ص : ۱۶۳، خواص الامۃ ص :۱۷، ۲۰، خصائص علویہ ص :۱۶۱، ارجح المطالب ص : ۵۷۴

میں قحط پڑا جناب ابو طالب کی معاشی حالت خراب ہوگئی۔ تب آنحضرتؐ کی تحریک پر عباس بن عبدالمطلب نے حضرت جعفرؓ کو اور خود رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ کو لے لیا اور انکے کفیل بنے۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ابو طالب کی غربت ہی اس تحریک کا باعث نہ تھی بلکہ دیگر عوامل بھی اسکا موجب تھے، کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دو بچوں کی کفالت سے بری الذمہ ہونے سے ابو طالب کے افلاس میں کوئی کمی واقع ہوئی ہوگی ؟ کیا ان دونوں بچوں کے علاوہ دیگر اولاد، ازواج اور متعلقین کی گزراسر کا ابو طالب کے پاس معقول انتظام تھا؟ کیا ان دونوں بچوں کی خوراک اس باپ کیلئے دشوار تھی جو اپنے مال سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں محتاج کے کھانے کا اہتمام کرتا تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جنکی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی تحریک کے محرک کوئی اعلیٰ مقاصد تھے۔

جہانتک جعفر کی کفالت کا تعلق ہے اس میں غور طلب پہلو یہ ہے کہ مورخین کے بیان کے مطابق اس واقعہ کے وقت حضرت علیؑ کی عمر پانچ سال تھی اور مورخین کا یہ بھی متفقہ فیصلہ ہے کہ جعفر حضرت علیؑ سے دس سال بڑے تھے لہٰذا اُس وقت جعفر کی عمر پندرہ سال تھی۔ اگر والدین تنگ دست اور مفلوک الحال ہوں تو پندرہ برس کا بیٹا محنت مزدوری کر کے اپنے گھر کی معاشی حالت بہتر بنانے کے قابل ہوتا ہے نہ کہ والدین کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور کی کفالت میں دیدیا جائے۔ مزید یہ کہ اس واقعہ کے بعد جعفر اور عباس سے متعلق تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بیان کا بھی کوئی خاص مقصد ہوگا۔

جہانتک حضرت علیؑ کا رسالتمآبؐ کی کفالت میں لے لینے کا ذکر ہے۔ یہ بھی ایک تعجب خیز بات ہے کیونکہ حضرت علیؑ تو وقت ولادت ہی سے رسالتمآبؐ کی خصوصی توجہ کا مرکز تھے۔ البتہ جب آپ پانچ سال کی

عمر کو پہنچے تو خصوصی تربیت و نگرانی کیلئے جناب رسالتمآبؐ نے اپنے ظلِ رحمت میں لے لیا۔ تاکہ آگے چل کر تبلیغ دین میں اپنی مدد و معاونت کیلئے انکی مناسب تعلیم و تربیت کر سکیں۔ آپؐ کا یہ عمل جناب ابو طالب کی مفلوک الحالی و معاشی بدحالی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ عینیت، مثیت، اخوت، جیسے ان بےشمار و لازوال رشتوں کے باعث تھا جن میں خالقِ کائنات نے اپنے ان دونوں برگزیدہ بندوں کو منسلک کر دیا تھا۔ الغرض دن گزرتے گئے اور جناب ختمی مرتبتؐ کے زیرِ تربیت علی المرتضیٰ کی تعلیم ظاہری و باطنی ہوتی رہی اور ایک وہ وقت بھی آیا جب اللہ کے حبیب نے ارشاد فرمایا:

"ان تکون منی و انا منك..... حربك حربی و مسلمك مسلمی و سرك سری و ملا نیتك ملانیتی و سریرة صدرك سریرة صدری و انت باب علمی و ان ولدك ولدی ولحمك لحمی و دمك دمی"۔ ترجمہ: تو میرا ہے اور میں تیرا ہوں...... تیری لڑائی میری لڑائی اور تیری صلح میری صلح ہے۔ تیرا بھید میرا بھید اور تیرا اعلان میرا اعلان ہے اور تیرے دل کا راز میرے دل کا راز ہے اور تو میرے علم کا دروازہ ہے اور تیرا خون میرا خون ہے اور تیرا گوشت میرا گوشت ہے اور تیرے بیٹے میرے بیٹے ہیں"۔ (ارجح المطالب ص: ۵۹۴)

سابقیت اسلام: مثیت کا یہی وہ مقام ہے جس کے باعث رسالتمآبؐ کے حالات علیؑ کا تذکرہ کئے بغیر پانا یا علی مرتضیٰؑ کی زندگی کی ابتدائی انتیس سالہ دور کے واقعات کو بلاشراکت رسول مقبولؐ تلاش کرنا سعی لاحاصل ہے چونکہ اللہ مسبب الاسباب کو اپنے ان دونوں برگزیدہ بندوں کی باہمی قربت قریباً سے خلق خدا کا کچھ کام لینا مقصود تھا لہٰذا اس نے ایک کو حکم دینے والا اور دوسرے کو حکم بجا لانے والا بنایا۔ ایک کو استاد تو دوسرے کو شاگرد مقرر فرمایا۔ اور شاگرد بھی ایسا کہ جسے استاد نے گود میں کھلایا۔ اپنی اعلیٰ ترین تربیت کے ذریعہ اس کے عادات و اطوار، انداز واخلاق کو سنوارا۔ تربیت

نفس اور تزکیہ خیال کو اپنے معیار کے مطابق ڈھالا۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے استاد معظم کو نبوت عطا فرمائی تو یہی شاگرد رشید سب سے پہلے رسالت کی تصدیق کر کے صدیقِ اکبر اور فاروقِ امت کہلایا۔

ابن اسحاق نے نبوت کی تصدیق کرنے والوں کی ترتیب اس طرح بیان کی ہے:

"خدیجہؓ بنت خویلد آپؐ پر ایمان لائیں اور جو کچھ خدا کی طرف سے آپؐ پر نازل ہوا تھا اس کی تصدیق کی۔ اللہ پر نیز آپؐ پر اور اللہ کی طرف سے آپؐ پر نازل ہونے والی چیزوں پر ایمان لانے والوں میں پہلی وہی تھیں"۔ (سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۶۷ ج: ۱)

"پہلا مرد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا، آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور اس چیز کی تصدیق کی جو آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی تھی وہ علی ابن ابطالب علیہ السلام بن عبدالمطلب بن ہاشم تھے۔ آپؑ پر اللہ کی رضامندی اور سلام ہو۔ آپ کی عمر اس وقت دس سال کی تھی۔ علی ابن ابطالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جو انعامات اللہ تعالیٰ نے کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اسلام سے پہلے ہی رسول اللہؐ کی آغوش تربیت میں تھے"۔ (سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۷۰ ج: ۱)

"اس کے بعد زید بن حارثہ (بن شرجیل بن کعب ابن عبدالعزیٰ بن امراء القیس الکلبی) رسول اللہ ﷺ کے غلام نے اسلام اختیار کیا اور نماز پڑھی"۔ (سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۷۲ ج: ۱)

"اس کے بعد ابوبکرؓ ابن ابی قحافہ نے اسلام اختیار کیا۔ آپ کا نام عتیق تھا اور ابی قحافہ کا نام عثمان بن عامر (بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ...... تھا"۔ (سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۷۳ ج: ۱)

جناب علی مرتضیٰؑ کی سابقیت و السابقون اولئك هم المقربون کی تفسیر جملہ مفسرین سے مسلم ہے "اولکم اسلاماً علی"[1] یا علی انت اول من اء من لی"[2] "انك اول المسلمین اسلاماً و اول المؤمنین ایماناً"۔[3] جیسی متعدد حدیثوں سے ثابت ہے۔ حضرت علیؑ کی سبقت فی الاسلام کے ضمن میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت علیؑ تصدیق رسالت فرما کر مشرف بایمان ہوئے۔ مگر اس فضیلت کی وقعت کو معدوم کرنے کی خاطر عورت، بچہ، غلام اور مرد کی درجہ بندی کی گئی۔ نیز فضیلتِ علیؑ پر صغر سنی کا پردہ ڈالدیا گیا۔ دس سے سولہ سال کی عمر میں تصدیقِ رسالت کرنے والے علیؑ پر بچہ ہونے کا قیاس کرنے والے یہ کیوں بھول گئے کہ ماں کی گود اور گہواروں کے اندر والے بچوں تک کی کامل الایمانی قرآن کریم میں موجود ہے۔

سابقیتِ نماز: ابتدائی ایامِ بعثت میں رسول اللہؐ کے گھر کے صرف یہی تین افراد تھے جو رسالت سے واقف اور اسلام کے پیرو تھے۔ جب نماز کا وقت ہوتا تو رسالتمآبؐ اور علیؑ آبادی سے دور گھاٹیوں میں چلے جاتے اور اپنی قوم سے چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ جیسا کہ ابنِ ہشام نے ابو طالب کا ان دونوں کو ایک گھاٹی میں نماز پڑھتے دیکھنے کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جسے ہم اس کتاب کی جلد اول ص: ۲۶۷ پر تحریر کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ طبری نے عفیفؓ کے روایت سے انکا اپنا ایک واقعہ تحریر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ عباسؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ حرم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول خداؐ، بی بی خدیجہؓ اور حضرت علیؑ وہاں آئے اور نماز پڑھنے لگے عفیفؓ کے لئے یہ مشاہدہ عجیب تھا لہٰذا انہوں نے اس کی بابت

[1] مستدرک حاکم ص: ۱۳۶ ج: ۳، [2] کنزالعمال ص: ۱۵۶ ج: ۶، [3] فردوس الاخبار ص: ۳۱۴، ریاض النضرہ ص: ۱۵۸۔

عباسؓ سے دریافت کیا۔ عباسؓ نے تفصیل بتائی۔ جب عفیفؓ مسلمان ہو گئے تو یہ واقعہ بیان کر کے کہا کرتے تھے کہ کاش وہ بھی اس دن مشرف بہ اسلام ہو جاتے تو چوتھے ایمان لانے والے ہوتے۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلانیہ تبلیغ کے بعد بھی نماز پڑھنے والے یہ تین افراد ہی تھے۔ اسی لئے حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے دوسرے لوگوں سے سات سال قبل رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھی"۔ جسکی تصدیق ابن عباس کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

"ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب سرورِ عالم ﷺ فرماتے تھے کہ مجھ پر اور علی پر سات برس تک فرشتے درود بھیجتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے کہ بجز میرے اور علیؑ کے آسمان کی طرف کسی کی لا الہ الا للہ پر شہادت دینے کی آواز بلند نہیں ہوتی تھی"۔ (ارجح المطالب ص: ۴۸۹)

نیز دیگر احادیث سے بھی حضرت علی کا سابق فی الصلوۃ ہونا ثابت ہے۔[2]

[1] تاریخ طبری ص: ۸۳ ج: ۱، [2] نسائی ص: ۲، حاکم ص: ۱۱۲ ج: ۳، ریاض النضرہ ص: ۱۵۸، ازالۃ الخفا ص: ۲۶۲ وغیرہ۔

حضرت علی ابن ابطالب اپنی ابتدائی عمر سے آنحضرتؐ کی وفات تک دامنِ مصطفویؐ سے وابستہ رہے۔ اس دور کے جتنے بھی حالات وواقعات آپ سے متعلق تھے وہ بلاواسطہ ختمی مرتبت سے منسلک اور آپؐ کے حکم کے تابع تھے لہٰذا ہم نے بھی ان واقعات کو رسالتمآبؐ کے باب میں ضمناً تحریر کیا ہے۔ اب اپنے تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے وفاتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد سے علی ابن ابطالب علیہ السلام کے مزید حالات کا سلسلہ قائم کررہے ہیں۔

سقیفہ بنو ساعدہ : سقیفہ کا واقعہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے اور تاریخ وحدیث کی جملہ کتب میں مرقوم ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی میت ابھی گھر میں ہی رکھی تھی۔ خاندانِ بنی ہاشم کے لوگ تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مشغول تھے، مسلمانوں کی ایک جماعت مسجد نبوی میں غمزدہ بیٹھی تھی۔ حضرت عمرؓ مسجد سے باہر کسی مقام پر تھے جہاں کسی مخبر نے انہیں خبر دی کہ سقیفہ بنو ساعدہ میں انصار جمع ہیں اور خلافت کی بابت فیصلہ کررہے ہیں۔ حضرت عمرؓ فوراً مسجد نبوی میں پہنچے حضرت ابوبکرؓ کو بلاکر علیحدگی میں واقعہ کی اہمیت سے آگاہ کیا جسے سن کر حضرت صدیق مضطرب ہوگئے اور یہ دونوں حضرات سقیفہ بنو ساعدہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ ملے وہ بھی انکے ساتھ ہولئے یہ اور تینوں حضرات سقیفہ میں پہنچ گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا اس کو مورخین نے بہت بڑھاچڑھاکر لکھا ہے۔ حالانکہ وہاں وہی کچھ ہوا جو مخبر نے حضرت عمرؓ کو اور حضرت عمر نے حضرت ابوبکرؓ کو وقوعہ سے قبل ہی بتادیا تھا۔ یعنی سعد بن عبادہؓ کے خلیفہ بنانے پر بحث وتکرار، حضرت ابوبکرؓ کی تقریر، حباب بن منذر کی مخالفت، ایک امیر تم میں سے ایک امیر ہم میں سے کی تجویز، حضرت عمرؓ اور حباب بن منذر کا جھگڑا، بشر بن سعد

انصاری کی تقریر، حضرت ابوبکرؓ کا اپنے ہمراہیوں (حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ) کے نام خلافت کیلئے پیش کرنا اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حضرت عمرؓ کا آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ سے ہاتھ طلب کرنا اور بیعت کرلینا۔

یہی وہ واقعات ہیں جو جملہ مورخین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کئے ہیں مگر بعض نے واقعہ کی اس انداز سے منظر کشی کی ہے کہ جیسے یہ سب کچھ مہاجرین وانصار کے کسی بہت بڑے اجتماع میں ہوا ہو اور سقیفہ کوئی بہت کشادہ جگہ ہو۔ درآنحالیکہ سقیفہ میں موجودین کی تعداد چند نفوس سے زیادہ ہرگز نہ تھی انمیں صرف تین مہاجرین اور چند مقامی باشندے انصار کے تھے۔ کیونکہ عام مسلمانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جو صحابہ کرام مسجد نبوی میں رسالتمآبؐ کی تکفین وتدفین کے انتظار میں غمزدہ بیٹھے تھے ان تک کو بھی اس کارروائی کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد مقام جرف میں لشکرِ اسامہ کے ساتھ مقیم تھی وہ بھی اس کارروائی سے قطعی لاعلم تھی۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کی ایک تعداد ایسی بھی تھی جو حضرت عمرؓ کے خوف سے حواس باختہ ہوکر رسول اللہؐ کی وفات ہی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی جبکہ قبیلہ بنی ہاشم کے لوگ اس ساری اکھاڑ پچھاڑ سے بے خبر تجہیز و تکفین رسولِ مقبولؐ میں منہمک تھے۔ ان سب کے علاوہ ابوسفیان جو بنو امیہ کا سردار اور بقول شبلی نعمانی قریش کا سپہ سالارِ اعظم تھا وہ بھی سقیفہ کی کارروائی میں شریک نظر نہیں آتا۔ لہٰذا کسی طرح بھی سقیفہ کے اجتماع کو مسلمانوں کا نمائندہ مجمع نہیں کہاجاسکتا۔

سقیفہ کیا تھا؟ : جب ہم سقیفہ بنو ساعدہ کی بابت تاریخ میں پڑھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کا یہ خاکہ ابھرتا ہے کہ وہ شہر مدینہ ہی میں کوئی کشادہ ہال یا وسیع آڈیٹوریم ہوگا۔ جس میں ہزاروں افراد کے جمع ہونے کی گنجائش ہوگی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سقیفہ کسی مکان کے بیرونی دروازے سے

ملحق ایک کمرہ نما جگہ کو کہتے ہیں جو عام طور پر بستی کے معزز فرد کی رہائشگاہ کے ساتھ ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں اسے بیٹھک، اوطاق یا چوپال کہا جاتا ہے جو آج بھی چھوٹے قصبات میں جابجا نظر آتی ہیں اور یہاں بستی کے لوگ بیٹھ کر اپنے گھریلو معاملات اور بستی کی مشکلات پر بات چیت کرتے ہیں۔ مدینہ سے تقریباً دو میل یا بقول دیگر تین کوس کے فاصلہ پر انصار کی ایک بستی تھی جسکے سردار سعدؓ بن عبادہ تھے۔ انہی کے گھر سے ملحق یہ بیٹھک تھی جسے سقیفہ بنو ساعدہ کہتے تھے۔ چونکہ دنیا اسلام کی پہلی خلافت کانفرنس یہاں منعقد ہوئی تھی لہٰذا اس اوطاق کو تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس بیٹھک یا اوطاق میں کتنے لوگ ایک وقت میں بیٹھ سکتے تھے اس کا اندازہ آپ بآسانی لگا سکتے ہیں۔

بیعت : جملہ کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ نامعلوم مخبر نے خبر دی کہ سقیفہ میں انصار جمع ہیں اور سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں مہاجرین میں سے تین افراد انتہائی خاموشی سے سقیفہ پہنچے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ تین کوس مخبر کے آنے اور تین کوس ان حضرات کے جانے میں لازماً تین گھنٹے تو صرف ہوئے ہونگے۔ چونکہ یہ حضرات کسی سواری پر نہیں گئے تھے۔ اب اگر مخبر کے وہاں سے چلنے کے وقت انصار جمع ہوچکے تھے، کارروائی شروع ہوچکی تھی جسکی خبر مخبر لیکر گیا تھا تو اس دوران سعد بن عبادہ کو امیر مقرر کرلینے میں کوئی دشواری تو نہ تھی کیونکہ وہ تو پہلے ہی سردار قبیلہ تھے، اور رسول اللہؐ کے نزدیک ممتاز تھے آنحضرتؐ انکی عزت فرماتے تھے۔ ایسے مقام اور ایسے وقت میں جہاں کوئی مقابلہ پر بھی نہ تھا اتنی دیر میں خلافت و ریاست کا اعلان کرنا انصار کیلئے بہت آسان تھا پھر کیا وجہ تھی جو یہ کارروائی نہیں ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پس پردہ کوئی اور بات تھی۔

بہر حال یہ حضرات وہاں پہنچے وہی کارروائی جس سے مخبر نے ان کو آگاہ کیا تھا جاری ہوئی۔ فریقین نے اپنے اپنے دلائل پیش کئے اور اپنے

اپنے فضائل بیان کئے۔ جب حباب بن منذر نے مِنَّا اَمِیْرٌ وَمِنْکُمْ اَمِیْرٌ ایک امیر ہم سے اور ایک امیر تم سے کی تجویز پیش کی تو حضرت عمرؓ برہم ہوگئے آپ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "یہ دلیل ہمارے پاس اتنی زبردست ہے کہ کسی کو مجالِ انکار نہیں ہوسکتی۔ ہم آپؐ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم سے زیادہ آپؐ کی جانشینی کا حقدار کون ہوسکتا ہے۔ اس سے انکار ایک ہٹ درم ہی کرسکتا ہے۔"[1]

اس طرح جب مہاجرین نے انصار پر اپنی فضیلت بیان کی تو اس کے جواب میں انصار نے کہا کہ اگر تمہاری یہی دلیل ہے تو پھر علی ابن ابطالب کی بیعت کرلی جائے کیونکہ وہ ابن عم رسولؐ ہیں۔ حضرت عمرؓ ڈرے کہ اختلاف بڑھے گا لہٰذا انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ہاتھ بڑھاؤ کہ میں بیعت کرلوں۔ ہاتھ بڑھا اور بیعت ہوگئی۔ ابن ہشام نے اس بات کو اسطرح بیان کیا ہے کہ "حضرت عمرؓ کی چشم بیدار نے یہ موقع غنیمت دیکھا اور کھڑے ہوکر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی"[2]

اس بیعت کی بابت چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

اسی واقعہ کی بابت حضرت عمر نے اپنے دورِ حکومت میں اسطرح ارشاد فرمایا:

> "اس پر بڑی گڑبڑ ہوئی اور خوب شور مچا۔ میں ڈرا کہ کہیں آپس میں تفرقہ نہ پڑجائے۔ میں نے ابوبکر سے کہا: ہاتھ بڑھاؤ۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بیعت کرلی، مہاجرین[3] اور انصار نے بھی بیعت کرلی۔ ہم سعد بن عبادہ پر دوڑ پڑے۔ انصار میں سے کسی نے کہا: تم نے سعد بن عبادہ کو مار ڈالا! میں نے کہا: سعد بن عبادہ پر اللہ کی مار"

حضرت عمرؓ نے مزید فرمایا کہ :

---

[1] تاریخ طبری ص: ۲۰۷ ج: ۳ [2] سیرۃ ابن ہشام ص: ۴۶۳ ج: ۳

[3] سقیفہ میں تین اور صرف تین مہاجر تھے جن میں سے ایک کی بیعت بجا ہونے کی۔ (مولف)

"جو مسئلہ ہمارے سامنے تھا۔ اس کا اس سے مضبوط کوئی حل نہیں کہ ابوبکرؓ کی بیعت کرلی جائے۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر وہاں موجود لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور بیعت نہ ہوئی تو کہیں وہ ہمارے جانے کے بعد اپنے ہی لوگوں سے بیعت نہ کرلیں۔ پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف بیعت کرنی پڑے گی اور اگر ہم نے مخالفت کی تو فساد برپا ہوگا۔ اگر کوئی کسی سے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر بیعت کرے تو ان دو میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا جائیگا"۔ (صحیح بخاری ص: ۲۰۸ ج: ۸، طبری ص: ۲۰۱ ج: ۳)

ابنِ اثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ:

"حضرت عمرؓ اور دوسرے اشخاص نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر کل انصار نے کہا کہ ہم سوائے علی کے اور کسی کی بیعت نہ کریں گے"۔ (حوالہ تاریخ احمدی ص: ۱۱۰)

طبری کا بیان ہے کہ:

"مگر اس وقت تمام انصار نے یا ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم تو صرف علیؑ کی بیعت کریں گے"۔ (تاریخ طبری ص: ۵۳۰ ج: ۱)

حسن ابراہیم حسن مصری نے تحریر کیا ہے کہ:

"حضرت علی اور ان کے حامیوں نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے گریز کیا تھا ان میں قابلِ ذکر حضرت عباسؓ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر تھے"۔ (مسلمانوں کا نظم مملکت ص: ۳٦)

امام ابوالحسن علی الماوردی نے تحریر کیا ہے کہ:

"حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا واقعہ کہ پہلے صرف پانچ آدمیوں نے جن میں حضرت عمر، ابوعبیدہ ابن الجراح، اسید بن حضیر، بشیر بن سعد اور سالم ابو حذیفہ کے آزاد غلام شامل تھے آپ کی امامت پر اجماع کیا"۔ (احکام السلطانیہ ص: ٦)

حسن ابراہیم حسن مصری کا بیان ہے کہ:

"یہ بیعت 'بیعت خاصہ' کے نام سے موسوم ہے۔ اس دن صرف چند مسلمانوں نے بیعت کی تھی جو سقیفہ میں موجود تھے۔ دوسرے روز

حضرت ابوبکرؓ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسے 'بیعت عامہ' کہا جاتا ہے"۔

(مسلمانوں کا نظم مملکت ص: ۳٦)

ان بیانات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سقیفہ میں صرف پانچ افراد کی بیعت کے بعد سقیفہ کانفرنس میں حضرت ابوبکرؓ کے حق میں فیصلہ ہوگیا۔ جسکے بعد یہ تینوں حضرات واپس مدینہ آئے اس دوران رسالتمآب کی تدفین ہو چکی تھی جیسا کہ شیخ علی بن حسام الدین الہندی نے کنز العمال میں عروہ سے روایت بیان کی ہے کہ:

"پیغمبر صاحب کے دفن کے وقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ موجود نہ تھے بلکہ (مقام سقیفہ بنی ساعدہ) مجمع انصار میں تشریف رکھتے تھے اور قبل اس کے کہ یہ دونوں صاحب وہاں واپس آئیں رسول اللہؐ دفن ہو چکے تھے"۔ (حوالہ تاریخ احمدی ص: ۱۱۰)

مدارج نبوۃ اور روضۃ الصفا میں انس بن مالک سے روایت ل ہے کہ:

"کوئی روز بہتر اور نورانی اس روز سے زیادہ نہ تھا کہ پیغمبر خدا ﷺ مدینہ میں تشریف لائے اور بدتر اور ظلمانی تر اس روز سے زیادہ کوئی نہیں جس روز اس عالم سے در پردہ ہوئے اور ہنوز رسول ﷺ کے دفن سے ہم فارغ نہیں ہوئے تھے کہ دل ہمارے پھر گئے اور پردہ ہمارے اوپر پڑا ایسا کہ انکار کیا ہم نے اپنے دلوں کے تئیں"۔ (ترجمہ: الکرر ص: ۱۳۳)

حضرت علیؑ سے بیعت کی طلبی: دوسرے روز حضرت ابوبکرؓ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے۔ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور بیعت عام ہوئی۔ اب اگر کوئی اس فیصلے سے ہٹتا تو اس کا شمار وحدتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے والے ان فتنہ پردازوں میں ہوگا جنکی سرکوبی کیلئے اگر ضروری ہو تو انہیں قتل کر دینا بھی مسلمانوں پر واجب ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے انہیں

قتل کی دھمکی دی تھی۔[1] اور حضرت علیؑ و دیگر اشخاص جو انکے گھر میں موجود تھے ان کو بیعت کیلئے بلانے کو مسلح افراد بھیجے گئے تھے جیسا کہ ابن قتیبہ دینوری نے اپنی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں تحریر کیا ہے کہ:

"جب حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں کو جو حضرت علیؑ کے پاس تھے اپنی صحبتِ بیعت میں حا نہ پایا تو حضرت عمرؓ کو ان کو بلانے کیلئے بھیجا، پس جو لوگ حضرت علی کے گھر میں تھے انہوں نے باہر نکلنے سے انکار کیا۔ حضرت عمر نے جلانے کی لکڑیاں منگا کر کہا کہ باہر نکلو ورنہ خدا کی قسم جو اشخاص اس گھر میں ہیں ان کو آگ لگا کر جلا دوں گا۔ لوگوں نے کہا اس گھر میں تو فاطمہ بنت رسول بھی ہیں۔ حضرت عمر بولے کہ ہوا کریں۔ یہ سنتے ہی جو لوگ خانہ مرتضوی میں تھے باہر نکلے اور سوائے حضرت علیؑ کے سب نے جا کر ابوبکر کی بیعت کرلی۔ حضرت علیؑ نے (ان لوگوں سے جو آپ کی طلب میں آئے تھے مخاطب ہو کر) ارشاد فرمایا کہ میں امر خلافت کیلئے تم سے بہر طرح احق ہوں۔ میں تمہاری بیعت نہ کروں گا بلکہ تم کو میری بیعت کرنی چاہیے۔ دیکھو تم نے انصار سے امر خلافت کو یہ دلیل پیش کر کے حاصل کیا کہ بہ نسبت ان کے تم لوگ نبی کریمؐ سے قرابت رکھتے ہو۔ اور (تعجب ہے کہ) اب تم اہلبیتؑ رسول سے خلافت غصب کرتے ہو کیا یہ تمہارا زعم نہیں ہے کہ تم کو انصار پر اولیت اسی دلیل سے ہے کہ رسول اللہ تمہاری قوم سے تھے پس میں وہی حجت تمہارے مقابل میں پیش کرتا ہوں۔ جو تم نے انصار کے مقابل میں پیش کی یعنی ہماری قرابت ہر طرح تم لوگوں سے اولیٰ ہے آنحضرتؐ کے ساتھ انکی زندگی میں بھی اور انکی وفات کے بعد بھی۔ اب تم ہی انصاف کرو اگر خدا پر ایمان لے آئے ہو اور اس سے ڈرتے ہو۔۔۔۔۔ اے گروہ مہاجرین خدا کو یاد کرو اور جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی سرداری عرب کو ان کے گھر سے خارج کر کے اپنے گھروں میں نہ لیجاؤ۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؑ نے دروازہ پر

[1] صحیح بخاری ص: ۲٦ ج: ۸

کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے قوم تم نے رسول اللہؐ کے نعشِ مقدس ہمارے آگے چھوڑ کر امر خلافت کو باہم طے کر لیا اور ہمارے حق پر نظر نہ کی"۔

(ترجمہ: تاریخ احمدی ص: ۱۱۴)

اسی موقع پر جب حضرت عمرؓ ان لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے پر دباؤ ڈال رہے تھے حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ ترجمہ:

"دودھ دوہ لو، تمہیں تمہارا حصہ مل جائیگا۔ آج تم ان کی خلافت پکی کر دو، کل وہ خلافت تمہیں لوٹا دیں گے"۔

(صحیح بخاری ص: ۹ ج: ۷، صحیح مسلم ص: ۵۷ ج: ۵)

اس کے بعد حضرت علی مسجد نبوی میں لائے گئے جہاں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے پر آپ سے بیعت کرنے کو کہا گیا۔ جواب میں آپ نے اپنے فضائل، قرابت اور دینی خدمت بیان کر کے اپنے حق میں دلائل پیش کئے۔ جنکی تمام حا ین نے تصدیق کی۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا کہ "اگر آپ اپنا حق پہلے ظاہر کرتے تو ہم اس امر سے باز رہتے۔ اب ہم نے بیعت کرلی ہے آپ بھی کرلیں"۔ اس پر کافی بحث ہوئی آخر کار حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو یہ کہکر رخصت کیا کہ "اب اگر بیعت کرو تو مناسب ہے ورنہ تم پر کوئی تکلیف نہیں ہے"۔

حضرت علیؑ کی بیعت کی بابت مورخین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپؑ نے فوراً بیعت کرلی، بعض کی رائے میں چالیس دن بعد اور بعض کی رائے میں چھ مہینے بعد بیعت کی جبکہ بعض کہتے ہیں آپ نے بیعت کی ہی نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ آخری رائے درست ہے بلکہ حضرت علیؑ نے خلفائے ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ میں سے کسی ایک کی بھی بیعت نہیں کی تھی۔ اسلئے کہ اگر آپ نے کسی کی بیعت کرلی ہوتی تو حضرت عمرؓ کی قائم کردہ انتخابی کمیٹی کی پیشکش کے جواب میں آپ کے سیرت شیخین پر چلنے سے انکار پر کمیٹی کے اراکین یہ سوال ضرور کرتے کہ

باپ سے تو شیخین کی بیعت کرتے رہے ہیں اور اب آپ انکی سیرت پر عمل کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علیؑ نے کبھی کسی کی بیعت نہیں کی سوائے اللہ کے رسول کی بیعت کے۔

الغرض جب آپ مسجد نبوی سے اپنے بیت الشرف پہنچے تو عباس بن عبدالمطلب کو ہمراہ لیکر ابو سفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے "قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی کیسے خلیفہ بن گیا، تم اٹھنے کیلئے تیار ہو تو میں وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں"۔ اس پر حضرت علیؑ نے ان کو جواب دیا کہ "تمہاری یہ بات اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور پیادے لاؤ"[1]۔ اس واقعہ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؑ کے پیش نظر اسلام اور اہل اسلام کے علاوہ کوئی شے اہمیت نہیں رکھتی اگر آپ خلافت کے آرزومند تھے تو بھی اسلام کی بقاء و سربلندی کیلئے اور اگر اس سے کنارہ کشی کی تو وہ بھی ملت اسلامیہ کی بہتری کی خاطر ورنہ موقعہ شناس لوگ تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ابو سفیان کی پیشکش سے قطع نظر حضرت علیؑ میں خود بھی اتنی قوت و صلاحیت موجود تھی کہ آپ بزور شمشیر اپنا حق حاصل کر لیں۔ لیکن اگر آپ کی تلوار اٹھتی تو اسلام تباہ و برباد ہو جاتا جیسا کہ ایک موقعہ پر آپ نے خود ارشاد فرمایا۔

> "میں نے لوگوں سے کہدیا تھا کہ دیکھو رسول اللہ کی وفات ہو چکی ہے خبردار امر خلافت میں مجھ سے کوئی نزاع نہ کرے کیونکہ میں ہی اس کا صحیح وارث اور حقدار ہوں لیکن مسلمانوں نے میرے قول کی پرواہ نہ کی۔

[1] کنز العمال ص: ۲۳۷ ج: ۵، تاریخ طبری ص: ۴۴۹ ج: ۲، استیعاب ص: ۶۸۹ ج: ۲، خلافت و ملوکیت ص: ۹۷

> خدا کی قسم اگر دین میں تفرقہ پڑ جانے اور عہد کفر کے پلٹ آنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان (مسلمانوں) کی ساری تدبیریں باطل کر دیتا"۔
> (استیعاب، عبدالبر ص: ۱۸۳)

مگر حضرت علیؑ تو رسالتمآبؐ کی آخری وصیت جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ "اے علی! جب لوگ دنیا کی طرف متوجہ ہوں تو تم دین کی طرف متوجہ ہونا"۔ پر عمل پیرا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے اس امر بیعت پر زور نہیں دیا اور اس رسمی فعل کی آپ کو خوانخواہ تکلیف دینا مناسب نہ جانا۔ ویسے بھی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔ ابو الفدا کے مطابق ایسے چند معروف لوگوں کے نام یہ تھے۔ زبیر بن عوام، عتبہ بن عبدالعزیٰ، خالد بن سعید بن عاص، مقداد بن عمر، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، براء بن عازب، ابن کعب وغیرہ۔ نیز خاندان بنو ہاشم کے علاوہ بنو امیہ کے لوگوں کی بیعت کا بھی کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ قبائل کے سرداروں کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ خلیفہ ابو بکرؓ ہیں یا علیؑ ہیں یا کوئی اور ہے ان کیلئے تو صرف یہ بات اہم تھی کہ انکی سرداری قائم رہے اسے کوئی چھیننے کی کوشش نہ کرے۔

ابن ہشام کے بیان کے مطابق "حضرت علیؑ اور ان کے حامیوں نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے گریز کیا تھا۔ ان میں قابل ذکر عباسؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ تھے ان لوگوں کا حضرت علیؓ کے ساتھ اتحاد تھا۔ پھر حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت ﷺ کی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ سب امور ایسے جمع ہو گئے تھے جنہوں نے امت مسلمہ کو دو فرقوں سنیوں اور [illegible]ں میں تقسیم کر دیا تھا"[1]۔

مسئلہ خلافت : خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کی تاریخ کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ جو سقیفہ کانفرنس سے آج تک مسلمانوں کے درمیان نزاع کا باعث

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۱۰۱۳ ج: ۳ مطبوعہ یورپ، مسلمانوں کا نظم مملکت ص: ۳۶۔

بنا ہوا ہے۔ اس مسئلہ کے باعث وحدت اسلامی کو صدمہ پہنچا اور مسلمان مختلف فرقوں اور اعتقادی و فکری دبستانوں میں تقسیم ہو گئے حالانکہ اس سے پہلے وہ سب ایک امت تھے۔ مسلمانوں میں جتنے بھی اختلافات رونما ہوئے خواہ وہ فقہ و تفسیر قرآن سے متعلق ہوں یا سنت نبویؐ کو سمجھنے کے بارے میں ہوں وہ سب اسی مسئلہ کے باعث ہوئے۔ سقیفہ کانفرنس کے دن ہی سے ملت اسلامیہ دو فرقوں میں بٹ گئی۔ ایک کو اہلسنت کا نام دیا گیا تو دوسرے کو اہل تشیع کہا گیا۔ اہلسنت سقیفہ کی شوریٰ کے اصول پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ وہ صریح نصوص کی تاویل کرتے ہیں اور حدیث غدیر جیسی مستند حدیثوں کے مخالف ہیں۔ جبکہ اہل تشیع ان نصوص پر قائم ہیں اور انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں نیز جن نصوص کو دونوں فریق تسلیم کرتے ہیں انکی وہ اپنے اپنے انداز فکر کے مطابق تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ بہر حال سقیفہ کانفرنس کے بعد خلافت ایک "امر واقعہ" بن گئی اور اسکی وجہ سے بہت سی صحیح احادیث اور صریح آیات ردکیجانے لگیں۔ اور ایسی احادیث گھڑی جانے لگیں جنکی صحیح سنت نبوی میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔

مسئلہ خلافت کی بابت اہلسنت کی رائے ہے کہ (۱) رسول اللہ صلعم نے اپنی حیات میں کسی کو خلافت کیلئے نامزد نہیں کیا تھا۔ (۲) خلیفہ کا تعین صرف شوریٰ سے ہوتا ہے۔ (۳) حضرت ابو بکرؓ کو کبار صحابہ نے منتخب کیا تھا۔ اگر رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد پیش آنے والے واقعات پر غور کریں تو تینوں اصول بے حقیقت ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی امت کو بغیر کسی ہادی کے نہیں چھوڑا جیسا کہ ارشاد باری ہے کہ ترجمہ: "آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کیلئے ایک ہدایت دینے والا ہے"[1]۔ تو پھر اللہ کا رسولؐ اپنی امت کو کسی

[1] سورۂ رعد آیت: ۷

سرپرست کے بغیر کیونکر چھوڑ سکتا ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ کو خود اپنی امت میں تفرقہ کا اندیشہ ہو۔[1] یہ ڈر ہو کہ کہیں لوگ الٹے پاؤں نہ پھر جائیں۔[2] دنیا کے حصول میں ایک دوسرے پر بازی لیجانے کی کوشش نہ کرنے لگیں۔[3] ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگیں۔[4] یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو حضرت عائشہؓ نے آدمی بھیج کر انہیں کہلوایا کہ "اپنے بعد امت محمدیہ کا کوئی خلیفہ مقرر کر دیجئے اور اسے اپنے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑیئے کیونکہ مجھے فتنہ کا اندیشہ ہے"۔[5] اسی طرح کی ایک گزارش عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد سے کی تھی۔ ان گزارشات کی روشنی میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ رسالتمآبؐ نے کسی کو خلیفہ نامزد کئے بغیر یہ معاملہ ایسے ہی چھوڑ دیا ہوگا اور کیا آپ کو اس مصلحت کا علم نہیں تھا جسکا علم حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو تھا؟

۲ جہانتک خلیفہ کا تقرر شوریٰ سے ہونے کا تعلق ہے تو اس اصول کو خود حضرت ابو بکرؓ نے توڑ دیا اور حضرت عمر کو نامزد کر کے شوریٰ کے اصول سے انحراف کیا۔

۳۔ حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب کبار صحابہ نے کیا۔ اسکی بابت ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھ آئے ہیں نیز جملہ کتب حدیث و تاریخ سے ثابت ہے کہ آپ کا چناؤ اچانک اور بلا کسی مشورہ کے صرف حضرت عمرؓ کی بیعت کے سبب ہوا جو اس تحریک کے محرک تھے اور جیسا کہ آپ اپنے دور خلافت میں اعلانیہ فرمایا کرتے تھے کہ:

> "ابو بکر کی بیعت بلا مشورہ اور اچانک ہو گئی تھی، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو اس کے برے نتائج (شر) سے محفوظ رکھا"۔
> (صحیح بخاری ص: ۲۶ ج: ۸)

[1] مسند حنبل ص: ۳۳۲ ج: ۲، [2] صحیح بخاری ص: ۱۴۴ ج: ۴ [3] صحیح بخاری ص: ۹۰۲ ج: ۷ [4] صحیح بخاری ص: ۹۳ ج: ۴ [5] صحیح بخاری ص: ۱۱۲ ج: ۷
الامامۃ والسیاسۃ ص: ۲۸ ج: ۱

جبکہ خلافت کے بارے میں اہلِ تشیع کا نظریہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا ولی، وصی اور خلیفہ ہونے کا متعدد بار اعلان فرمایا۔ اپنی بعثت کے بعد پہلی خفیہ تبلیغی دعوت جس میں صرف خاندان بنو ہاشم کے افراد ہی شریک تھے سے لیکر غدیرِ خم کے اعلان تک متعدد موقعوں پر آپؐ نے اسکی تصریح فرمائی۔ اسکے علاوہ اہلِ تشیع قرآنی آیات سے بھی جناب علی مرتضیٰؑ کی خلافت کا استدلال پیش کرتے ہیں ان آیات قرآنی میں سورۂ مائدہ کی آیات ۳، ۵۵، ۵۶ اور ۶۷ خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ جنکو خود رسالتمآبؐ نے اہمیت دی اور جنکی بابت حدیث و تاریخ کی کتابوں میں کثرت سے تحریر کیا گیا ہے علمائے اہلِ تشیع کے علاوہ علمائے اہلسنت کی کثیر تعداد نے ان آیات کے حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہونے سے متعلق روایتیں بیان کی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اہل تشیع کی کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی اصل اہلسنت کی کتابوں میں موجود نہ ہو۔

حضرت علیؑ کا سکوت : حضرت علیؑ نے سقیفہ کارروائی ربیع الاوّل ۱۱ھ سے اپنی ظاہری خلافت ذی الحجہ ۳۵ھ تک چوبیس سال نو ماہ انتہائی صبر و سکوت اور خاموشی و گوشہ نشینی میں گزارے۔ اس زمانہ میں آپؑ کی کیفیت کی بابت ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ :

"حضرت علی نے (وفات رسولؐ کے بعد) مسلمانوں سے اسی طرح چشم پوشی کی جسطرح کفر کے پلٹ آنے کے اندیشہ سے رسول کریمؐ نے منافقوں اور مؤلفۃ القلوب (ابو سفیان وغیرہ) سے چشم پوشی کی تھی"۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری ص : ۲۰۴ ج : ۴)

آپ کی اس خاموشی پر بعض مورخین نے گمان کیا کہ چونکہ آپ قرآن جمع کرنے میں مصروف تھے اسلئے گوشہ نشین ہوئے اور بروقت خلیفۂ وقت کی بیعت نہ کر سکے۔ ہمارے خیال میں یہ گمان صرف گمان ہی ہے

کیونکہ اکثر احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسالتمآبؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں قرآن کریم جمع کر لیا تھا۔ جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں تحریر کیا ہے کہ ترجمہ :

"علی وہ شخص ہیں کہ جمع کیا قرآن کو اور آنحضرتؐ کی جناب میں اسے پیش کیا"۔ (ترجمہ : ارجح المطالب ص : ۱۳۷)

الغرض ۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ کو حضرت ابوبکرؓ نے رحلت فرمائی اور تعین خلیفہ کیلئے طریقہ انتخابِ شوریٰ کے بجائے حضرت ابوبکرؓ کی وصیتِ نامزدگی کے مطابق حضرت عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا اور اسطرح حضرت علیؑ کی وہ پیشن گوئی کہ :

" أحلب حلبًا لكَ شطرہ و اشدُ لهُ اليومَ يَردّدہ عليكَ غدًا "

ترجمہ : "آج دودھ دوہ لو، کل تمہیں اسکا آدھا حصہ مل جائیگا۔ آج تم اس کی حیثیت مضبوط کر دو، کل وہ تمہیں واپس لوٹا دیگا۔

(صحیح مسلم ص : ۵ ج : ۲ باب الاختلاف و ترک)

بالکل صحیح و درست ثابت ہوئی۔ حضرت علیؑ نے یہ دور بھی نہایت صبر و سکون سے گزارا۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے حضرات خوبی جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں بھی عملاً حضرت عمرؓ ہی حکمران تھے اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے اسامہ سے اجازت چاہی تھی کہ حضرت عمرؓ کو ان کے پاس چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ امورِ خلافت میں ان سے مدد لیتے رہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ خلفائے ثلاثہ کے پورے دور میں حضرت علی ابن ابیطالب کو ذمہ داری کے عہدوں سے ہمیشہ دور رکھا گیا۔ آپ کو نہ کوئی منصب دیا گیا، نہ کسی صوبہ کا گورنر بنایا گیا، نہ کسی لشکر کا سالار مقرر کیا گیا اور نہ کوئی خزانہ تحویل میں دیا گیا درآنحالیکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے ہر فرد واقف تھا۔ اس کے باوجود حضرت علی مرتضیٰؑ نے مفادِ اسلام اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی خاطر حکومت وقت

کے امور شرعیہ اور امور سیاسیہ میں ہر ممکن مدد فرمائی جنکی تفصیل جملہ کتب میں مرقوم ہے۔ حضرت علیؑ کی انہی خدمات کے پیش نظر حضرت عمرؓ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ : " لولا عليٌّ لهلكَ عُمَرُ "۔[1] ترجمہ : اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔

حضرت عمرؓ نے ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا اپنی وفات سے چند روز قبل آپ نے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی۔ اس وقت انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ کاش آج ابو عبیدہ بن جراح یا حذیفہ بن یمان کے آزاد کردہ غلام یاسر زندہ ہوتے تو وہ انہی میں سے کسی ایک کو اپنا جانشین مقرر کر دیتے۔ بہر حال آپ نے جو چھ رکنی کمیٹی مقرر کی اسکے اراکین کے نام یہ تھے۔

۱۔ علی بن ابیطالب۔ بنو ہاشم کے بزرگ ۲۔ عثمان بن عفان۔ بنو امیہ کے بزرگ
۳۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ بنو زہرہ کے بزرگ ۴۔ طلحہ بن عبیداللہ۔ بنو تیم کے بزرگ
۵۔ سعد بن ابی وقاص۔ ان کا تعلق بنو زہرہ سے تھا اور ننھیال بنو امیہ تھی۔
۶۔ زبیر بن العوام۔ یہ آپؐ کی پھوپھی صفیہ کے بیٹے اور اسماء بنت ابی بکر کے شوہر تھے۔

اس چھ رکنی کمیٹی جسے مسلمانوں نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنی ذاتی رائے سے مقرر فرمایا تھا کے ممبران کی باہمی قرابت و رقابت کا خاکہ کچھ اس طرح سے تھا۔

سعد بن ابی وقاص جو عبدالرحمٰن بن عوف کے چچازاد بھائی تھے اور حضرت علیؑ سے بغض و عناد رکھتے تھے کیونکہ غزوات میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں اسکے ننھیال عبد شمس کے بعض افراد مارے گئے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف حضرت عثمان کے بہنوئی تھے۔ انکی بیوی ام کلثوم حضرت عثمان کی

[1] صحیح بخاری کتاب المحاربین، سنن ابی داؤد ص : ۷، ۱۴، مسند احمد حنبل ص : ۱۳۰ ج : ۱، موطا امام مالک ص : ۱۸۶، مسند شافعی ص : ۱۲۶، کنز العمال ص : ۵ ج : ۳، مستدرک حاکم ص : ۳۷۵ ج : ۳، کتاب القضاء ص : ۱۹۴ ودیگر متعدد کتب۔

بہن تھیں۔ طلحہ کا جھکاؤ حضرت عثمان کی طرف تھا کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بننے کے بعد سے بنو تیم اور بنو ہاشم کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے تھے۔[1] یہ تھے وہ اربابِ حل و عقد جن کا فیصلہ پوری امتِ مسلمہ کیلئے واجب العمل تھا اور کسی مسلمان کو ان کے معاملہ میں دخل دینے کا حق نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں ہدایت کی تھی کہ اختلاف کی صورت میں اس فریق کا ساتھ دیا جائے جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں خواہ یہ ارکان تین تین کے دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں خواہ اس گروہ کو قتل ہی کر دینا پڑے جو عبدالرحمٰن بن عوف کے خلاف ہو۔

حضرت عمر نے صہیب کو ہدایات دیں کہ تم تین روز تک نماز میں امامت کرنا اور اراکین شوریٰ کو جمع کرنا تمہاری ذمہ داری ہے تم ننگی تلوار لیکر کھڑے ہو جانا اگر ایک شخص پانچ کی مخالفت کرے تو اسکی گردن اڑا دینا اور اگر دو شخص چار کی مخالفت کریں تو ان دونوں کی گردن اڑا دینا اور تین موافق اور تین مخالف ہوں تو عبداللہ بن عمر کو ثالث بنا لینا جس کے بارے میں وہ فیصلہ کر لیں اسے حاکم منتخب کر لینا اگر ان کے فیصلہ کو تسلیم کرنے میں لوگوں کو انکار ہو تو اس پارٹی میں شامل ہو جانا جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں اور بقیہ تمام لوگوں کی گردن اڑا دینا۔[2]

حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد تین روز گزر گئے مگر جانشین کا انتخاب نہ ہو سکا تب عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے تمام امیدواروں سے کہا کہ "تم میں سے کون کون ہے جو اس خیال سے خلافت کی امیدواری سے دستبردار ہو جائے کہ یہ منصب اس سے بہتر شخص کے سپرد کیا جائے۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے کسی نے جواب نہیں دیا۔ تب عبدالرحمٰنؓ نے سب سے پہلے اپنا نام واپس لیا اسکے بعد دیگر امیدواروں نے بھی اپنے اپنے نام واپس لے لئے مگر حضرت علیؑ نے خاموشی اختیار کی۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے

[1] شیخ محمد عبدہ، شرح نہج البلاغہ ص : ۸۸ ج : ۱ [2] تاریخ طبری ص : ۳۴ ج : ۵، مسلمانوں کا نظم مملکت ص : ۴۲

دریافت کیا۔ "ابوالحسن! تمہارا کیا خیال ہے؟" آپ نے جواب دیا "مجھے اسکا یقین دلادو کہ حق و انصاف کیلئے ایثار کروگے، نفسانی خواہشات کی پابندی نہ کروگے اور امت مسلمہ کے حق کو نظر انداز کر کے رشتہ داروں کے ساتھ کسی خصوصیت کی پابندی نہ کروگے"۔ تین روز کی مدت گزرنے کے بعد صبح کے وقت عبدالرحمنؓ نے لوگوں سے کہا کہ علی اور عثمان میں کسی ایک کو منتخب کرلو۔ عمار بن یاسر نے کھڑے ہو کر کہا "اگر مسلمانوں کو اختلاف سے بچانا چاہتے ہو تو علی کی بیعت کرلو۔ مقداد بن اسود نے ان کی پرزور تائید کی۔ اس کے بعد عبدالرحمن بن ابی سرح نے کھڑے ہو کر کہا "اگر قریش میں پھوٹ ڈالنا نہیں چاہتے ہو تو عثمان سے بیعت کرلو۔ عبداللہ بن ابی ربیعہ نے اسکی تائید کی۔ اس پر بنو ہاشم اور بنو امیہ میں تکرار شروع ہو گئی۔ جب نزاع بڑھنے لگا تو عبدالرحمن بن عوف نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر تین بار پوچھا کہ اگر آپ کو خلیفہ قرار دیں تو کیا آپ کتاب خدا اور سنت رسولؐ اور سیرت ابوبکر و عمر پر عمل کریں گے؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں قرآن و سنت پر عمل کرونگا لیکن سیرت شیخین کے اتباع کا پابند نہ ہوں گا بلکہ اپنے اجتہاد کو کام میں لاؤں گا۔ یہ سن کر عبدالرحمن بن عوف نے یہی سوال تین مرتبہ حضرت عثمان سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا ہاں میں ضرور عمل کروں گا۔ پس اولاً عبدالرحمن بن عوف نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کی انکے بعد دوسرے لوگوں نے بھی بیعت کرلی اسطرح حضرت عثمان تیسرے خلیفہ مقرر ہو گئے۔

تاریخ کامل اور ابوالفداء میں ہے کہ حضرت علیؑ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آج یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم لوگوں نے مل کر ہم پر غلبہ کیا روضۃ الاحباب میں ہے کہ اس تقریر میں آپ نے اپنے فضائل بیان کئے اور لوگوں کو قسم دیکر انکی بابت دریافت کیا جس پر عبدالرحمن بن عوف

نے کہا کہ اے ابوالحسن! جن فضائل کو آپ نے گنوایا اور بیان کیا ان کے اقرار و اعتراف سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا مگر چونکہ اب اکثر لوگوں نے عثمان کی بیعت کی ہے لہٰذا آپ بھی ان کا ساتھ دیں۔ حضرت علیؑ نے جواباً فرمایا کہ واللہ تم خوب جانتے ہو کہ مستحق خلافت کون ہے لیکن افسوس ہے کہ جان بوجھ کر اعتراض کر رہے ہو۔ حضرت علیؑ یہ فرماتے ہوئے کہ سلیبلغ الکتاب الہ وہاں سے چلے آئے۔ بعد میں عمار ابن یاسر اور مقداد بن اسود نے مجمع سے خطاب کر کے رسول و اہلبیت رسول کے فضائل بیان کئے اور امر خلافت کو اہلبیت نبوی سے پھیرے جانے پر سخت تنقید کی۔

بدقسمتی سے حضرت عثمان اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکے جو انہوں نے خلافت حاصل کرتے وقت عبدالرحمن بن عوف سے کیا تھا۔ خلافت حاصل ہونے کے بعد انہوں نے حضرت عمر کی آخری وصیت "اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط نہ کردینا"۔ کو قطعی نظر انداز کر دیا اور اپنے قبیلے والوں اور قریبی رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے عطا کر دیے تھے۔ جنکی چند مثالیں پیش ہیں:

مملکت اسلامیہ میں سرحد پر واقع ہونے کے باعث شام، مصر، کوفہ، اور بصرہ کے چار صوبے بہت اہم تھے۔ حضرت عمر کی وصیت کے مطابق آپکے مقرر کئے ہوئے عمال ایک سال تک بحال رہے جونہی یہ مدت پوری ہوئی حضرت عثمان نے تقرری و برطرفی کے اختیارات استعمال کرنا شروع کر دیے تھے۔ کوفہ کی گورنری سے سعد بن وقاص کو معزول کر کے اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو انکی جگہ مقرر فرمایا۔

حضرت عثمانؓ نے بنو امیہ کے جن لوگوں کو اعلیٰ مراتب سے نوازہ وہ سب طلقاء میں سے تھے طلقاء سے مراد وہ قریش مکہ ہیں جو فتح مکہ تک اسلام و بانی اسلام کی دشمنی میں کمربستہ رہے اور دعوت اسلامی کی مخالفت

کرتے رہے۔ مکہ فتح ہونے کے بعد رحمت اللعالمین نے عام معافی کا اعلان فرمایا تب یہ مفتوحہ قوم کے افراد چاروناچار اسلام میں داخل ہوگئے۔ معاویہ بن ابوسفیان، ولید بن عقبہ، مروان بن حکم وغیرہ انہی معافی یافتہ خاندان کے افراد تھے اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر رسالتمآبؐ نے جن مشرکین کیلئے حکم دیا تھا "اگر وہ خانہ کعبہ کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے"۔ یہ ان میں سے ایک تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اسے پناہ دی۔ رسالتمآبؐ سے اسکی معافی کی التجا کی جسے آپؐ نے حضرت عثمانؓ کے پاس خاطر سے معاف کر دیا تھا۔ حکم بن ابی العاص جو حضرت عثمانؓ کا چچازاد بھائی تھا وہ بھی طلقاء میں سے تھا۔ یہ مدینہ آکر رہنے لگا۔ رسالتمآبؐ صحابہ سے کوئی رازدارانہ بات کرتے تو یہ کسی طرح سن گن لیکر اسے افشاں کرتا تھا۔ اسی قسم کی دوسری حرکتوں کے باعث آنحضرت نے اسے مدینہ سے نکال دیا تھا۔

اسکے بعد یہ منصب اپنے قریبی عزیز سعید بن عاص کو عطا کر دیا۔ بصرہ کی گورنری سے ابوموسیٰ اشعری کو ہٹا کر اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو مامور کیا۔ مصر کی گورنری سے عمرو بن عاص کو ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ دمشق کے گورنری سے عمرو بن عاص کو ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ دمشق کے گورنر معاویہ بن ابوسفیان کو دمشق کے علاوہ حمص، فلسطین، اردن، اور لبنان کے علاقے بھی سپرد کر دیے جو دمشق کے چھوٹے سے علاقہ کے والی تھے اس طرح وہ پورے ملک شام کے گورنر ہو گئے۔ ان سب سے بڑھکر یہ کہ اپنے چچازاد بھائی مروان بن حکم کو اپنا سیکریٹری مقرر کیا جسکی وجہ سے سلطنت کے پورے دروبست پر انکا اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ اسطرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔[1]

[1] تہذیب التہذیب ص: ۱۴۴ ج: ۱، خلافت و ملوکیت ص: ۱۱۲

مروان کی بابت حضرت عثمان کی اہلیہ بی بی نائلہ کی رائے تھی کہ حضرت عثمان کی مشکلات پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری مروان پر عائد ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شوہر محترم سے صاف صاف کہا کہ "اگر آپ مروان کے کہنے پر چلیں گے تو یہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا۔ اس شخص کے اندر نہ اللہ کی قدر ہے، نہ ہیبت نہ محبت"۔[1] حضرت عثمان نے اپنے اس سیکریٹری مروان بن حکم کو افریقہ کا پورا مال غنیمت بخش دیا۔

مروان کوفہ پہنچے پر یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا " اور پڑھاؤں"۔[2] ولید بن عقبہ نے آپؐ کو دھوکہ دیا، آپ کے بارے میں دروغ سے کام لیا اور اسلام قبول کرنے کے بعد کافر ہو گیا۔ اس کے بارے میں قرآن کریم میں سورۂ الحجرات کی آیت : ۶ نازل ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کی مخالفت تو خلافت کے روز اول ہی سے شروع ہو گئی تھی جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد کے حضرت عمرؓ کے قاتل ابولولو کے گھر جا کر اسکی بیٹی جفینہ جو عیسائی تھی اور ابولولو کے ایک رازدار ہرمزان جو مسلمان ہو گیا تھا، دونوں کو قتل کر دیا تھا۔[3] لیکن آپ کی زندگی کے آخری دو سالوں میں یہ مخالفت اپنے عروج پر پہنچ کر انتہائی خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی جسکی اہم ترین وجہ یہی اقرباپروری تھی۔ مختلف علاقوں سے لوگ مدینۃ الرسول میں جمع ہو گئے اور حضرت عثمان کی خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کرنے لگے چالیس روز تک بلوائیوں نے ہنگامہ برپا کئے رکھا اور ایوان خلافت کو محاصرے میں لے لیا اور آخر کار ہجوم کر کے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا۔ تین روز تک میت کی تدفین نہ ہو سکی اور ملت مسلمہ بغیر خلیفہ رہی۔

[1] خلافت و ملوکیت ص: ۱۱۹ - طبری ص: ۳۹۶، البدایہ والنہایہ ص: ۱۷۲ ج: ۷
[2] الفتنۃ الکبریٰ ص: ۱۳۸،

خلیفہ کا انتخاب : حضرت عثمانؓ کی شہادت ۱۵ ذی الحجہ ۳۵ھ کو ہوئی جس کے بعد تمام اہلِ مدینہ اور اربابِ حل و عقد کی تمام تر توجہ اس امر پر مرکوز تھی کہ جلد سے جلد نئے خلیفہ کا انتخاب کیا جائے۔ وہ خلافت کیلئے موزوں ترین شخصیت کی تلاش میں تھے تاکہ ملک میں پھیلی ہوئی بدامنی و انتشار کا سدباب کر کے امن و امان بحال کیا جا سکے۔ سب کی نظر انتخاب صرف ایک ہی شخصیت پر تھی اور وہ ذاتِ گرامی حضرت علی ابن ابیطالب کی تھی۔ حضرت علی کو خلافت کی پیشکش کی بابت جناب مولانا مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ :

"صرف مدینہ ہی میں نہیں، پوری دنیائے اسلام میں دوسرا کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی طرف اس غرض کیلئے مسلمانوں کی نگاہیں اٹھتیں۔ حتیٰ کہ اگر آج کے رائج طریقوں کے مطابق بھی کوئی انتخاب کرایا جاتا تو لازماً عظیم اکثریت کے ووٹ انہی کو حاصل ہوتے۔ چنانچہ تمام معتبر روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اور دوسرے اہلِ مدینہ ان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یہ نظام کسی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، لوگوں کیلئے ایک امام کا وجود ناگزیر ہے، اور آج آپ کے سوا ہم کوئی ایسا شخص نہیں پاتے جو اس منصب کیلئے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے، اور نہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرب کے اعتبار سے"۔

آخر کار انہوں نے کہا:

"میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی، عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے"۔ پھر مسجد نبوی میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین و انصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی"۔

(خلافت و ملوکیت ص : ۱۲۱)

خلافتِ ظاہری : جس طرح وفات پیغمبرؐ کے بعد حضرت علی کا خلیفہ نہ ہونا تعجب خیز امر تھا اسطرح تین خلافتوں کے بعد عام مسلمانوں کا آپ کو

خلیفہ بنانے پر اصرار کرنا حیرت انگیز امر ہے۔ لوگوں کا آپ سے خلافت قبول کرنے پر اصرار اور جواب میں آپ کا انہیں صبر و توقف کرنے کا ارشاد گزشتہ زمانہ میں لوگ خلافت کی طرف گئے تھے اس مرتبہ لوگ خلافت کو حضرت علیؑ کے پاس لے آئے۔ یہ نیا موقع تھا کہ خلق بلا کسی سفارش اور رہنمائی کے اپنا امام اور پیشوا تلاش کرنے نکلی تھی اور اس تلاش نے انہیں اُس دروازے پر پہنچا دیا جہاں چوبیس سال پہلے بھی کچھ لوگ گئے تھے۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اُس وقت محکوم بنانے کیلئے گئے تھے اور اب حاکمیت قبول کرنے کی درخواست لیکر آئے ہیں۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ خدا کی قسم خلافت نے علیؑ کو زینت نہیں دی بلکہ علیؑ نے خلافت کو زینت دی ہے۔ سب سے پہلے آپؑ کی بیعت طلحہ نے کی پھر زبیر اور تمام صحابہ نے کی۔[1]

مطالبہ قصاص : حضرت علیؑ نے زمانہ خلافت سنبھالی تو ملکی حالات دیگر گوں تھے شہر مدینہ شورش و بدامنی کی لپیٹ میں تھا۔ شورش برپا کرنے والے بلوائی ابھی مدینہ میں گھوم رہے تھے۔ آپؑ نے ابھی کاروبار سلطنت صحیح طور پر سنبھالا بھی نہ تھا کہ ایک گروہ نے خو عثمان کے قصاص کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ طلحہ و زبیر اور دیگر صحابہ نے اس سلسلہ میں آپ سے ملاقات کی۔ آپ نے فرمایا "خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آنے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس بجا ہو جائیں، خیالات کی پراگندگی دور ہو اور حقوق وصول کرنا ممکن ہو جائے"۔[2] ابھی حضرت علی خلافت ظاہری کو چار مہینے بھی نہ ہو پائے تھے کہ :

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۷۹، [2] طبری ص: ۴۵۸ ج: ۳، ابن اثیر ص: ۱۰۰ ج: ۳، خلافت و ملوکیت ص: ۱۲۸

"طلحہ و زبیر آئے اور کہنے لگے اے امیر المومنین ہمارے اہل و عیال زیادہ ہیں اور ہماری زمین سخت ہے۔ آپ نے فرمایا کیا میں نے شرط نہیں کی تھی کہ کسی کو دوسرے سے ایک درہم بھی زیادہ نہیں دونگا۔ کہنے لگے ہمارے ذمہ اخراجات لادھ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اپنے ساتھیوں کو بلاؤ اگر وہ راضی ہو جائیں تو تم دونوں کو ان کے بغیر دیدوں تو میں ایسا کروں گا اور اگر یہ کام تم نہیں کر سکتے تو پھر میں اپنے حصہ میں سے تمہیں دوں گا وہ اس پر راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے ہمیں عمرہ کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم تمہارا مقصد عمرہ نہیں بلکہ دھوکہ و فتنہ و فساد ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں خدا کی قسم : آپ نے فرمایا میری طرف سے اجازت ہے"۔ (تذکرۃ الخواص ص : ۸۰)

اس کے بعد طلحہ و زبیر مکہ چلے وہاں حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی جو پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ اور جو کچھ طے پایا اسکی بابت جناب مولانا مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

"خون عثمان کا بدلہ لینے کیلئے بصرہ و کوفہ سے، جہاں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے بکثرت حامی موجود تھے، فوجی مدد حاصل کیجائے۔ چنانچہ یہ قافلہ مکہ سے بصرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بنوامیہ میں سے سعید بن العاص اور مروان بن حکم بھی انکے ساتھ نکلے 'مرّ الظہران' (موجودہ وادی فاطمہ) پہنچ کر سعید بن العاص نے اپنے گروہ کے لوگوں سے کہا کہ "اگر تم قاتل عثمان صرف وہی نہیں جنہوں نے ان کو قتل کیا، یا جو ان کے خلاف شورش برپا کرنے کیلئے باہر آئے تھے بلکہ وہ سب لوگ بھی ان کے قاتلین میں شامل ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً حضرت عثمان کی پالیسی پر اعتراضات کئے تھے، یا جو شورش کے وقت مدینہ میں موجود تھے مگر قتل عثمان کو روکنے کیلئے نہ لڑے مروان نے کہا کہ "نہیں ہم ان کو (یعنی طلحہ و زبیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو) ایک دوسرے سے لڑائیں گے۔ دونوں

میں سے جس کو بھی شکست ہوگی وہ تو یوں ختم ہو جائیگا اور جو فتحیاب ہو گا وہ اتنا کمزور ہو جائیگا کہ ہم بآسانی اس سے نمٹ لیں گے۔[1] اس طرح ان عناصر کو لئے ہوئے یہ قافلہ بصرے پہنچا اور اس نے عراق سے اپنے ہزار ہا حامیوں کی ایک فوج اکٹھی کر لی۔ (خلافت و ملوکیت ص: ۱۲۸)

مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ :

"جب حضرت عائشہ اور طلحہ اور زبیر کا قافلہ روانہ ہو کر شب کو چشمہ حوأب پر پہنچا تو وہاں کچھ لوگ بنو کلاب کے جمع تھے۔ ان کے کتے سواروں کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ حضرت عائشہ نے پوچھا کہ اس مقام کا کیا نام ہے؟ شتربانوں نے کہا کہ حوأب یہ سنتے ہی حضرت عائشہؓ کی زبان سے کلمہ انا للہ وانا علیہ راجعون نکل گیا۔ اور وہ کہنے لگیں کہ مجھ کو اس سفر سے کچھ کام نہیں ہے۔ عبداللہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ کا اضطراب دیکھ کر کہا کہ خدا کی قسم یہ حوأب نہیں ہے۔ جس نے تم سے کہا غلط کہا۔ اس کے بعد طلحہ بھی آگئے جو پیچھے تھے اور انہوں نے بھی قسم کھا کر کہا کہ یہ حوأب نہیں ہے۔ نیز طلحہ اور زبیر کی موافقت میں ان کے پچاس ہمراہیوں نے گواہی دی کہ اس مقام کا نام حوأب نہیں ہے۔ اور یہ پہلی شہادتِ زور یعنی جعلی گواہی تھی جو اسلام میں قائم کی گئی"۔

(ترجمہ : تاریخ احمدی ص : ۱۷۷)

جنگِ جمل : شام میں ہونے والی اشتعال انگیز کاروائیوں کے پیش نظر حضرت علی والئی شام معاویہ بن ابو سفیان سے جہاد کیلئے تیاری مکمل کر کے جانے ہی والے تھے کہ آپ کو حاکم مدینہ کا خط ملا جس میں تحریر تھا کہ "طلحہ و زبیر یہاں آئے اور حضرت عائشہ کو ساتھ لے گئے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ پس آپ منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ دیا اور فرمایا۔ اے لوگو! تحقیق کہ طلحہ، زبیر اور عائشہ کو میری

[1] طبقات ابن سعد ص: ۳۴ ج: ۵

خلافت بری لگنے لگی ہے اور وہ بصرہ کی طرف چلے گئے ہیں پس ان کی طرف جانے کیلئے تیار ہو جاؤ"۔[1]

علامہ سبط ابن جوزی نے حضرت عائشہؓ کے محرک ہونے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انھیں حضرت علیؑ کی خلافت کی بات بتایا گیا تو انھوں نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور پھر مسجد الحرام میں حجر اسود کے پاس آئیں اور پردہ کا انتظام کرایا۔ لوگ انکے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے خطبہ دیا جس میں خون عثمان کے مطالبہ پر لوگوں کو آمادہ کیا اور کہا "عثمان مظلوم مارا گیا ہے میں اسکے خون کا مطالبہ کروں گی تم لوگ میرا ساتھ دو" اس پر عبید بن ام کلاب نے کہا "تم اب یہ بات کیوں کہتی ہو حالانکہ خدا کی قسم تمہیں تو اس کے قتل پر لوگوں کو بھڑکاتی تھیں اور کہتی تھیں۔ نعثل کو قتل کر دو خدا اسے قتل کرے بیشک وہ کافر ہو گیا ہے۔ کہنے لگیں پہلے ان لوگوں نے اس سے توبہ کرائی پھر قتل کیا"۔[2]

الغرض شہر بصرہ کے باہر دونوں فوجیں آمنے سامنے جمع ہو گئیں۔ درد مند دل تڑپ اٹھے ان کی کوشش تھی کہ یہ دونوں فوجیں متصادم نہ ہوں انکی مصالحتی کوششیں تقریباً کامیاب ہو چکی تھیں لیکن مروان وغیرہ نے اپنی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جنگ چھیڑ دی اور اس طرح جنگ جمل برپا ہو کر رہی۔ بقول ابن جوزی بخاری نے بھی اس واقعے کے کچھ حصے نقل کئے ہیں اور یہ بات ابن بکرہ سے نقل کی ہے وہ کہتا ہے کہ جنگ جمل میں مجھے ایک بات نے فائدہ پہنچایا جو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنی تھی۔ بعد اسکے قریب تھا کہ میں اصحاب جمل کے ساتھ مل جاؤں اور ان کی معیت میں جنگ کروں۔ وہ کہتا ہے جب رسول اللہؐ کو یہ خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۸۵ [2] تذکرۃ الخواص ص: ۸۶

کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی بھی فلاح و بہبود حاصل نہیں کرے گی جس نے اپنا حاکم عورت کو بنا لیا۔[1]

جنگ جمل کے آغاز میں حضرت علیؑ نے طلحہ و زبیر کو بلا کر بات کی اور رسالتمآبؐ کا ارشاد یاد دلا کر جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی جسکے نتیجہ میں زبیر میدان جنگ سے الگ ہو گئے اور طلحہ اگلی صفوں سے ہٹ کر پیچھے چلے گئے" لیکن ایک ظالم عمرو بن جرموز نے حضرت زبیر کو قتل کر دیا اور مشہور روایت کے مطابق حضرت طلحہ کو مروان بن حکم نے قتل کر دیا"۔[2] بہر حال یہ جنگ ہوئی جسکے جملہ واقعات مورخین نے تفصیل سے بیان کئے ہیں مگر ہم نے محدود صفحات کے باعث اختصار سے کام لیا ہے۔ اس جنگ میں فریقین کے دس ہزار آدمی کام آئے اور حضرت عائشہؓ کی فوج کو شکست ہوئی۔ چونکہ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار ہو کر میدان جنگ میں آئی تھیں اس لئے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑا۔

حضرت علیؑ نے اپنی فوج میں پہلے ہی اعلان کر کے بہت سی ہدایتیں کی تھیں انمیں یہ بھی تھیں کہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرنا، کسی زخمی پر حملہ نہ کرنا اور فتح یاب ہو کر مخالفین کے گھروں میں نہ گھسنا۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ جو بھی شکست خوردہ فریق کی اصل قائد تھیں، انتہائی احترام کا برتاؤ کیا اور پوری حفاظت کے ساتھ انھیں مدینہ بھیجدیا۔[3] جمادی الثانی ۳۲ھ کو حضرت علیؑ جنگ جمل سے فارغ ہوئے۔

جنگ صفین: حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد نعمان بن بشیر ان کا خون سے بھرا ہوا کرتا اور بی بی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں لیکر امیر شام کے پاس دمشق پہنچا جہاں انھیں مسجد جامع میں منبر کے قریب لٹکا دیا گیا تا کہ اہلِ شام کے جذبات کو بھڑکایا جا سکے۔ یہ اس امر کی واضح علامت تھی کہ حضرت

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۸۸ [2] طبقات ابن سعد ص: ۲۲۳ ج: ۳، خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۰ [3] البدایہ والنہایہ ص: ۲۴۵ ج: ۷ تاریخ طبری ص: ۵۴۲ ج: ۳

معاویہ اہلِ شام کو خلافت کے خلاف ابھار کر خونِ عثمان کی آڑ میں اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لہذا محرم ۳۶ھ میں حضرت علیؑ نے حضرت معاویہ کو شام کی گورنری سے معزول کر کے حضرت سہل بن حنیف کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ مگر ابھی یہ نئے گورنر تبوک تک ہی پہنچے تھے کہ شامی سواروں کا ایک دستہ ملا جس نے ان سے آکر کہا "اگر آپ حضرت عثمان کی طرف سے آئے ہیں تو اہلاً و سہلاً اور اگر کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو واپس تشریف لیجائیں"۔[1] شامیوں کا یہ اقدام اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ شام کا گورنر خلافت وقت کی اطاعت پر آمادہ نہیں۔

حضرت معاویہ کی معزولی سے متعلق حضرت علیؑ کے اس فیصلہ کی بابت مولانا مودودی صاحب نے بہت خوب تجزیہ فرمایا ہے ملاحظہ ہو:

"مورخین نے حضرت علیؑ کے حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کا واقعہ کچھ ایسے انداز سے بیان کیا ہے۔ جس سے پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ تدبر سے بالکل ہی کورے تھے۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے ان کو عقل کی بات بتائی تھی کہ معاویہؓ کو نہ چھیڑیں مگر انھوں نے اپنی نادانی سے یہ رائے نہ مانی اور حضرت معاویہؓ کو خواہ مخواہ بھڑکا کر مصیبت مول لے لی۔ حالانکہ واقعات کا جو نقشہ خود انہی مورخین کی لکھی ہوئی تاریخوں سے ہمارے سامنے آتا ہے اسے دیکھ کر کوئی سیاسی بصیرت رکھنے والا آدمی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؑ اگر حضرت معاویہؓ کی معزولی کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کرتے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوتی۔ ان کے اس اقدام سے ابتدا ہی میں یہ بات کھل گئی کہ حضرت معاویہؓ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ زیادہ دیر تک انکے موقف پر پردہ پڑا رہتا تو یہ دھوکے کا پردہ ہوتا جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے"۔ (خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۳)

حضرت معاویہ اسی وقت سے جوڑ توڑ میں مشغول ہو گئے لوگوں

[1] ابن اثیر ص: ۱۰۳ ج: ۳، خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۲

نے ان سے کہا کہ "تیری حکومت عمرو بن عاص کے بغیر نہیں جم سکتی، کیونکہ وہ عرب کا سب سے زیادہ چالباز انسان ہے"۔[1]

چونکہ جنگِ صفین میں عمرو بن عاص کا بہت اہم کردار ہے لہذا ہم اس کا مختصر تعرف پیش کرتے ہیں۔ عمرو بن عاص حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مصر کے گورنر تھے۔ لیکن بعد میں معزول کر دیئے گئے۔ اپنی معزولی کے بعد انھوں نے فلسطین میں رہائش اختیار کی۔ یہ انتہائی چالاک و مکار آدمی تھے۔ جس وقت مدینہ میں بلوائیوں نے یلغار کی یہ وہیں پر موجود تھے۔ اور لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے انہیں کہیں کی حکومت نہیں دی تھی۔ جب حضرت عثمان محصور ہو گئے تو وہ مدینہ سے شام چلے گئے۔

حضرت معاویہ نے ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور انھیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ حکومت کا لالچ دیا اور اپنی بادشاہت میں انھیں شریک قرار دیا۔ آخر کار حضرت معاویہ نے لکھا "مصر کا علاقہ میں تجھے بطور جاگیر تیرے اخراجات کیلئے دیتا ہوں اور اس پر گواہوں کی گواہیاں بھی ثبت کرا لیں۔ عمرو نے ساری رات اس فکر میں گزار دی، اس نے اپنے غلام کو بلایا جس کا نام دودان تھا، مصر میں سوق دودان اسی کی طرف منسوب ہے، اس سے پوچھنے لگا اے دودان تمہاری کیا رائے ہے تو اس نے کہا علی کے ساتھ آخرت ہے دنیا نہیں اور معاویہ کے ساتھ دنیا ہے آخرت نہیں لیکن وہ علی کے ساتھ ہے باقی رہنے والی اور جو معاویہ کے ساتھ ہے فنا ہونیوالی ہے۔ جب صبح ہوئی تو عمرو اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کے ساتھ اسکا بیٹا عبداللہ بن عمرو بھی تھا وہ اس سے کہتا تھا کہ معاویہ کے پاس نہ جاؤ اور اپنی آخرت کو فنا ہونے والی دنیا کے مقابلہ میں نہ بیچو۔ عمرو اس معاملہ میں حیران تھا۔ یہانتک کہ وہ ایک ایسے دوراہے پر پہنچا جہاں ایک راستہ مدینہ کی طرف

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۱۰۶

جاتا تھا اور دوسرا دمشق کی طرف، وہ وہاں آکر رکا، لیکن پھر اس نے اپنے گھوڑے کا رخ دمشق کی طرف پھیرتے ہوئے کہا کہ معاویہ حضرت علی کی نسبت ہم سے زیادہ نرمی برتتا ہے اور وہ سیدھا معاویہ کے پاس پہنچ گیا"۔[1]

صورتحال واضح ہو جانے کے بعد حضرت علیؑ نے شام پر حملے کی تیاری شروع کردی۔ اس وقت ان کیلئے شام کو مطیع کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا کیونکہ جزیرۃ العرب، عراق اور مصر آپ کے تابع فرمان تھے۔ لیکن عین وقت پر حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر کے اقدام کے باعث صورتحال یکسر بدل گئی اور حضرت علیؑ کو شام کی طرف بڑھنے کے بجائے ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرہ کا رخ کرنا پڑا اور جمادی الثانی ۳۶ھ میں جنگ جمل سے فارغ ہو کر ۱۲ رجب ۳۶ھ کو آپ کوفہ میں داخل ہوئے اور وہیں قیام فرمایا۔ آپ نے تمام تر توجہ شام کی جانب مبذول کی اور امیر شام سے خط و کتابت کے ذریعہ کوشش کی کہ وہ خلافت کے تابع فرمان ہو جائیں اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد کی راہ نہ نکالیں اس سلسلہ میں آپ نے پہلا خط جریر بن عبداللہ کلبی کے ذریعہ بھیجا لیکن امیر شام نے ٹال مٹول سے کام لیا اور عمرو بن عاص سے مشورہ کیا جس نے کہا "خون عثمان علی کے سر تھوپو اور اہل شام کو لیکر علی سے جنگ کرو"۔ لہٰذا حضرت معاویہ نے اہل شام کو مشتعل کیا جسکے نتیجہ میں انہوں نے قسم کھائی کہ وہ فرش پر نہیں سوئیں گے اور نہ اپنی بیویوں کے پاس جائیں گے جب تک قاتلین عثمان کو قتل نہ کرلیں"۔[2] پس حضرت معاویہ نے ایک خط بھیجا جس میں حضرت علیؑ پر حضرت عثمان کے قتل کا الزام عائد کیا۔ اس خط کی بابت مولانا مودودی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ:

> "اور صفر ۳۶ھ میں اپنی طرف سے ایک لفافہ اپنے ایک پیامبر کے ہاتھ انکے پاس بھیجا حضرت علیؑ نے لفافہ کھولا تو اس میں کوئی خط نہ تھا۔ حضرت علیؑ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا میرے پیچھے دمشق

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۱۰۸ [2] تذکرۃ الخواص ص: ۱۰۲

> میں ساٹھ ہزار آدمی خون عثمانؓ کا بدلہ لینے کیلئے بیتاب ہیں" حضرت علیؑ نے پوچھا کس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا آپ کی رگ گردن سے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ شام کا گورنر صرف اطاعت ہی سے منحرف نہیں ہے بلکہ اپنے پورے صوبے کی فوجی طاقت مرکزی حکومت سے لڑنے کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس کے پیش نظر قاتلین عثمانؓ سے نہیں بلکہ خلیفہ وقت سے خون عثمانؓ کا بدلہ لینا ہے"۔
>
> (خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۳)

اس پوری صورتحال سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ امیر شام اپنے معاملات میں بہت زیادہ دلیر ہو گئے تھے ان کی یہ دلیری نتیجہ تھی اس گورنری کا جو تقریباً سولہ سال سے ایک ہی صوبہ پر قائم تھی۔ اور صوبہ بھی وہ ایلہ سے سرحد روم اور الجزیرہ سے بحرہ ابیض تک وسیع و عریض تھا، نیز سرحدی محل وقوع کے باعث جنگی نقطہ نظر سے مملکت اسلامیہ کا اہم ترین صوبہ تھا۔ امیر معاویہ حضرت عثمانؓ کے پورے بارہ سالہ دور خلافت میں اس صوبہ کے مطلق العنان حکمران رہے۔ ان کی اس مستحکم پوزیشن کا خمیازہ آخرکار حضرت علیؑ کو بھگتنا پڑا۔

بہرحال امیر شام کی جارحانہ حکمت عملی کے باعث حضرت علیؑ ۵ شوال کو شام کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نے مدائن میں مختصر قیام کیا سعد بن مسعود ثقفی، جو مختار بن ابو عبیدہ ثقفی کے چچازاد بھائی تھے، کو مدائن کا حاکم مقرر کیا۔ وہاں سے الرقہ پہنچے جہاں آپ کے مقدمۃ الجیش کے سردار مالک اشتر کی ایک شامی دستے سے جھڑپ ہوئی اشتر نے اسے شکست دی۔ اسی اثنا میں امیر شام صفین کے مقام پر پہنچ چکے تھے اور انکے لشکر نے دریا کے تمام گھاٹوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ جب حضرت علیؑ کا لشکر وہاں پہنچا تو شامیوں نے انہیں پانی سے محروم کردیا۔ حضرت علیؑ نے مالک اشتر کے ذریعہ، امیر شام کو پیغام بھیجا کہ "ہمارے اور پانی کے درمیان رکاوٹ نہ ڈالو"

امیر معاویہ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب ہی نے یہی مشورہ دیا کہ انہیں پانی سے روکے رکھو مگر عمرو بن عاص نے کہا "اے معاویہ! پانی کا راستہ کھول دو کیا تم سمجھتے ہو کہ ابو طالب کا بیٹا پیاس سے مر جائیگا حالانکہ اس کے ساتھ نیزوں کی نوکیں، عراق کے بہادر اور مہاجر و انصار کے بزرگ موجود ہیں خدا کی قسم ان کے پیاسا مرنے سے پہلے سروں کے پیالے کھوپڑیوں سے اڑیں گے۔ ماہ محرم کے گزرنے تک صلح و صفائی سے کام لو اور برائی کی طرف جلدی نہ کرو، انجام برا ہے"۔ مگر امیر شام نے انکی رائے نہ مانی اور کہا "خدا کی قسم یہ پہلی کامیابی ہے۔ خداوند عالم ابو سفیان بن حرب کو رسول اللہ کے حوض سے پانی کا ایک قطرہ نہ پلائے اگر یہ لوگ اس پانی کا ایک قطرہ پی سکیں"۔ فیاض بن حرث ازدی جو عمرو بن عاص کا دوست تھا بولا "اے معاویہ خدا کی قسم تو نے اس قوم کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اگر یہ روم کی فوج ہوتی تو بھی انہیں پانی سے روکنا جائز نہیں تھا چہ جائیکہ وہ بدری اصحاب رسول مہاجرین و انصار ہیں۔ ان میں رسول اللہ کے چچازاد بھائی، راز دان، ان کے محبوب اور داماد ہیں۔ اے معاویہ کیا تو خدا سے نہیں ڈرتا۔ خدا کی قسم یہ تو عین بغاوت ہے خدا کی قسم اگر وہ ہم سے پہلے پانی پر قبضہ کر لیتے تو یقیناً ہمیں منع نہ کرتے"۔ امیر شام نے عمرو سے کہا "اپنے دوست کو مجھ سے روکو"۔ پس فیاض کھڑا ہوا چند شعر کہے۔ اسکے بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو حضرت علیؑ کے لشکر کی طرف موڑ دیا۔[1] جب امیر شام نے پانی کی راہ نہ کھولی تو حضرت علیؑ نے مالک اشتر اور اشعث بن قیس کو بھیجا جنہوں نے شامیوں کو دریا سے بھگا کر گھاٹوں پر قبضہ کرلیا۔ اسطرح یہ پہلی جنگ تھی جو صفین میں پہلی ذی الحجہ کو ہوئی۔ حضرت علیؑ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اپنی ضرورت کے مطابق دریا سے پانی لیتے رہو اور فریق مخالف کو

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۱۱۰

بھی فائدہ اٹھانے دو۔ ذی الحجہ کے آغاز میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت علیؑ نے تمام حجت کیلئے ایک وفد امیر شام کے پاس بھیجا مگر ان کا جواب تھا کہ "میرے پاس سے چلے جاؤ میرے اور تمہارے درمیان تلوار کے سوا کچھ نہیں" اسکے بعد حضرت علیؑ نے ایک وفد کمیل بن زیاد کی سربراہی میں بھیجا اور امیر شام کو پیغام دیا کہ امت کے لوگ قتل ہو رہے ہیں پس تم میرے مقابلہ میں آجاؤ تاکہ لوگوں کی اس مصیبت سے خلاصی ہو۔ حضرت معاویہ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو سوائے عمرو بن عاص کے سب نے یہی کہا کہ علی سے مقابلہ نہ کرنا۔ جبکہ عمرو نے کہا "علی کے مقابلہ میں نکلو کیونکہ علی نے تیرے ساتھ انصاف کیا ہے"۔ معاویہ نے کہا یہ کیسی دشمنی ہے کیا تو گمان کرتا ہے کہ اگر میں قتل ہو جاؤں گا تو تم خلافت حاصل کرلو گے"۔ عمرو نے کہا "تجھے ایسے آدمی نے مقابلہ کیلئے بلایا ہے جو عظیم القدر اور کثیر الشرف ہے تم اس کے مقابلہ میں دو اچھائیوں میں سے ایک پاؤ گے۔ اگر تم نے اسے قتل کرلیا تو ایک سردار کو قتل کرلو گے۔ اگر تم قتل ہو گئے تو خداوند عالم تمہیں جزائے خیر دیگا"۔ معاویہ نے کہا "یہ آخری بات تو میرے لئے بہت ناگوار ہے"۔ عمرو نے کہا "اگر تمہیں اس جہاد میں شک ہے تو پھر توبہ کرو اور واپس لوٹ جاؤ"۔

الغرض ذی الحجہ کے پورے مہینہ میں جنگ ہوتی رہی۔ جب محرم شروع ہوا تو جنگ معطل کردی گئی۔ اس ماہ کے دوران قاصد آتے جاتے رہے۔ حضرت علیؑ نے ایک وفد عدی بن حاتم کی سربراہی میں بھیجا جس نے امیر شام سے کہا کہ "سب لوگ حضرت علیؑ پر جمع ہو چکے ہیں اور صرف آپ اور آپ کے ساتھی ان سے الگ ہیں"۔ حضرت معاویہ نے جواب دیا "وہ قاتلین عثمانؓ کو ہمارے حوالے کریں تاکہ ہم انہیں قتل کردیں پھر ہم تمہاری بات مان لیں گے۔ اور اطاعت قبول کر کے جماعت کے

ساتھ ہو جائیں گے"۔ الغرض اسی طرح محرم کا مہینہ گزر گیا۔ صفر شروع ہوتے ہی پھر جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت علیؑ نے آغاز ہی میں اپنی فوج میں اعلان کر دیا کہ خبردار لڑائی کی ابتداء اپنی طرف سے نہ کرنا، پھر جب تم انہیں شکست دیدو کسی بھاگنے والے کو قتل نہ کرنا، کسی زخمی پر ہاتھ نہ ڈالنا، کسی کو برہنہ نہ کرنا، کسی مقتول کی لاش کا مثلہ نہ کرنا، کسی کے گھر میں نہ گھسنا، ان کے مال نہ لوٹنا اور عورتیں خواہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دیں ان پر دست درازی نہ کرنا۔

صفر کی تیسری تاریخ عمرو بن عاص شامیوں کی فوج کے ساتھ اس پرچم کو لیکر نکلے جسکے سایہ میں وہ زمانہ جاہلیت میں جنگ کیا کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عمار بن یاسر نکلے۔ عمار نے اپنے لشکریوں کو عمرو کے بارے میں بتایا۔ پھر عمار نے پکار اکر کہا۔ "اے عمرو یہ تو وہی جھنڈا ہے تاکہ اکثر اوقات اسکے سایہ میں تو رسول اللہؐ سے جنگ کرتا رہا۔ تو نے اپنی آخرت مصر کی حکومت کے بدلے میں بیچ ڈالی ہے نا، ہلاکت ہو تیرے لئے" عمار کی باتیں سنکر عمرو واپس پلٹ گئے۔

چوتھی صفر کو محمد بن حنیفہ فوج لیکر میدان میں نکلے ان کے مقابل عبید اللہ بن عمر بن خطاب کو امیر شام نے بھیجا لیکن وہ لڑے بغیر ہی واپس لوٹ گئے۔ ساتویں صفر کو سخت معرکہ ہوا جس میں عمار بن یاسر معاشم بن عتبہ بن ابی وقاص حضرت علیؑ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ حضرت علیؑ نے ان دونوں پر گریہ کیا اور دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اور ابن سعد نے طبقات میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ

"جنگ صفین میں حضرت عمار بن یاسر کا سر کاٹ کر حضرت معاویہ کے پاس لایا گیا۔ اور دو آدمی اس پر جھگڑ رہے تھے، ہر ایک کہتا کہ عمار کو میں

نے قتل کیا ہے"۔ (مسند احمد بن حنبل حدیث ۶۵۳۸، طبقات ابن سعد ص: ۲۵۳ ج: ۳، خلافت و ملوکیت ص: ۱۷۷)

دنیائے اسلام میں عمار بن یاسرؓ کا پہلا سر تھا جو کاٹا گیا اور حکمران کو پیش کیا گیا۔ ابن سعد کے مطابق حضرت عمار بن یاسر کی عمر اسوقت ۷۷ سال تھی۔

حضرت یاسر کی شہادت نے نص صریح سے یہ بات کھول دی کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل کون۔ حضرت عمار بن یاسر جو حضرت علی کی فوج میں شامل تھے حضرت معاویہ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے حضرت عمار کے متعلق حضرت نبی ﷺ کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضور کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ :

"اے عمار تم کو ایک باغی گروہ قتل کریگا"۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، طبرانی، بیہقی، مسند ابو داؤد، طیالسی وغیرہ کتب حدیث میں حضرات ابو سعید خدری، ابو قتادہ انصاری، ابو رافع، خزیمہ بن ثابت، عمرو بن العاص، ابو الیسر، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم اور متعدد دیگر صحابہ سے اس مضمون کی روایات منقول ہوئی ہیں۔

متعدد صحابہ و تابعین نے جو حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ میں مذبذب تھے حضرت عمار کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کیلئے ایک علامت قرار دیدیا تھا کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل کون ہے۔[1]

ابو بکر جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ :

"علی بن ابطالب نے باغی گروہ کے خلاف تلوار سے جنگ کی اور ان کے ساتھ اکابر صحابہ اور اہل بدر کے جنکا مرتبہ سب جانتے ہیں اس جنگ میں وہ حق پر تھے اور اس میں اس باغی گروہ کے سوا جو ان سے بر سر جنگ تھا اور کوئی بھی ان سے اختلاف نہ رکھتا تھا مزید براں خود ﷺ نے حضرت عمار

[1] خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۶۔ مزید تفصیل کیلئے کتاب ہٰذا کا مطالعہ کیجئے۔

سے فرمایا تھا کہ تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا یہ ایک ایسی خبر ہے جو تواتر کے ساتھ منقول ہوئی ہے۔ اور عام طور پر صحیح مانی گئی ہے۔ حتیٰ کہ خود حضرت معاویہ سے بھی جب عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے اسے بیان کیا تو وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔ البتہ انہوں نے اس کی یہ تاویل کی کہ عمار کو تو اس نے قتل کیا ہے جو انہیں ہمارے نیزوں کے آگے لے آیا، اس حدیث کو اہل کوفہ، اہل بصرہ، اہل حجاز اور اہل شام سب نے روایت کیا ہے"۔ (احکام القرآن ص: ۴۹۲ ج: ۳، بحوالہ خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۷)

حضرت عمار کی شہادت کے دوسرے روز سخت معرکہ ہوا۔ اس روز حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے علم کو باہر لائے جو اب تک نہیں نکالا گیا تھا اور قیس بن سعد بن عبادہ کے سپرد کیا۔ اس علم کے نیچے اہل بدر، انصار و مہاجرین جمع ہو گئے۔ پھر جنگ ہوئی اور زبردست جنگ ہوئی دن گزرنے کے بعد رات بھر جنگ جاری رہی اور اسے "لیلۃ الہریر" کا نام دیا گیا۔ صبح ہوئی تو جنگ جاری تھی اس روز ابن عباس میمنہ پر تھے، مالک اشتر میسرہ پر اور حضرت علیؑ قلب لشکر میں تھے۔ حضرت علی نے مالک کو آگے بڑھایا، انہوں نے اس شدت سے حملہ کیا کہ شامیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور حضرت معاویہ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی۔ تب معاویہ نے عمرو بن عاص سے کوئی تدبیر کرنے کو کہا۔ سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ :

"کوئی حیلہ و تدبیر ہے اس یہی وقت تمہاری چالبازی اور فریب کاری ہے۔ کہنے لگا نیزوں پر قرآن بلند کر دو اور منادی کر دو کہ تمہارے اور ہمارے درمیان کتاب خدا ہے یہ بات ان کے افتراق اور ہمارے اجتماع کو بڑھا دے گی۔ پس انہوں نے قرآن نیزوں پر بلند کر دیئے اور چیخ کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے۔ جب اہل عراق نے یہ دیکھا تو کہنے لگے ہم کتاب خدا کے حکم قبول کرتے ہیں اور تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ سخت اس بات میں اشعث بن قیس تھا۔ حضرت

علیؑ نے پکار کر کہا اے لوگو! تم اپنی حالت پر چلتے رہو۔ خدا کی قسم تمہیں ان جھوٹے مکار نے دھوکا دیا ہے تو سعد بن مذکی تمیمی اور زید بن حصین طائی اور وہ گروہ جس نے (بعد میں) آپ پر خروج کیا اور نہروان میں آپ سے جنگ کی۔ کہنے لگے کیسے ہم ان سے جنگ کریں، حالانکہ انہوں نے کتاب اللہ سے فیصلہ طلب کیا ہے اور اگر آپ نے انکار کیا تو ہم آپ کو بھی ان کے سپرد کر دیں گے یا آپ سے بھی وہی سلوک کریں گے جو عثمان سے کیا تھا۔ (تذکرۃ الخواص ص: ۱۴۰)

بہر حال قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا جسکا وہی نتیجہ برآمد ہوا جسکی عمرو بن عاص کو امید تھی۔ حضرت علیؑ نے اپنے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ یہ ایک چال ہے۔ جنگ کو فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچنے دو مگر لوگوں نے ایک نہ مانی۔ آخر کار حضرت علیؑ کو جنگ بند کرنا پڑی اور تحکیم کی پیشکش کو قبول کرنا پڑا۔ تب آپ نے مالک اشتر کا نام پیش کیا اسے بھی رد کرتے ہوئے کہا۔ حکم مقرر کرتے وقت بھی لوگوں نے اختلاف کیا۔ حضرت علیؑ عبد اللہ بن عباس کو حکم مقرر کرنا چاہتے تھے مگر اشعث بن قیس اور خوارج نے کہا کہ وہ تو آپ کے چچازاد بھائی ہیں کسی غیر جانبدار آدمی کو حکم ہونا چاہئے لہٰذا انہوں نے ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنانے پر اصرار کیا جسے حضرت علیؑ کو ماننا پڑا حالانکہ آپ ان سے مطمئن نہ تھے۔ ادھر امیر شام نے عمرو بن عاص کو اپنی طرف سے حکم مقرر کیا۔

بقول سبط ابن جوزی حضرت علیؑ نوے ہزار کے لشکر کے ساتھ کوفہ سے نکلے تھے اور امیر شام کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ اہل عراق میں سے پچیس ہزار افراد قتل ہوئے جن میں عمار بن یاسر، معاشم بن عتبہ بن ابی وقاص، خزیمہ بن ثابت، اویس قرنی اور اصحاب بدر میں کے ۲۵ آدمی شہید ہوئے۔ زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ ۸۷ اشخاص بدری تھے جن میں ۱۷ مہاجر اور ۷۰ انصار تھے۔ آپ

کے ساتھ ایک ہزار آٹھ سو صحابی تھے جن میں ستر افراد وہ تھے جو بیعت رضوان میں شامل تھے۔ اہلِ شام میں سے ستر ہزار لوگ مارے گئے۔ جانبین کے درمیان ستر جنگیں ایک سو دس دن میں ہوئی۔[1]

ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر آٹھ سو ایسے اصحاب حضرت علیؑ کے ساتھ تھے جو بیعت رضوان کے موقع پر رسالتمآب کے ساتھ تھے۔[2]

واقعہ تحکیم: صفین میں تحکیم کا معاہدہ آخر ماہ صفر میں لکھا گیا اسکی مدت ماہ رمضان تک آٹھ مہینے تھی یعنی اس مدت کے اندر فیصلہ کرنا تھا۔ اس واقعہ کی بابت مولانا مودودی صاحب نے طبری، ابن سعد، ابن اثیر اور ابن خلدون وغیرہ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ:

"حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت عمرو بن عاصؓ نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھائے اور کہے هذا حکمٌ بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اسکی مصلحت حضرت عمرو نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؑ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے۔ ہم مجتمع رہیں گے اور ان کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائیگا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائیگی" اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی، قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا"۔ (خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۹)

تحکیم کے معاہدے کے بنیادی اصول کی بابت مولانا صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "دونوں حَکم جو کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں اور جو کچھ کتاب اللہ میں نہ پائیں اسکے بارے میں سنتِ عادلہ جامعہ غیر مفرقہ پر عمل کریں"۔[3]

۱۔ تذکرۃ الخواص ص: ۱۰۰، ۲۔ استیعاب ص: ۴۴۳ ج: ۳، ۳۔ خلافت و ملوکیت ص: ۱۴۰

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دومۃ الجندل میں دونوں حکموں کے مابین یہ امر زیرِ بحث ہی نہیں آیا بلکہ ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کو الگ کر کے مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیں تاکہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ پھر یہ دونوں صاحب فیصلہ کا اعلان کرنے اس مجمع میں آئے جہاں دونوں فریق کے چار چار سو افراد جمع تھے۔ عمرو بن عاص نے نہایت چالاکی سے ابو موسیٰ عشری کو اعلان کرنے کیلئے پہلے کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کہا "ہم دونوں کے متفقہ فیصلہ کے مطابق میں علی و معاویہ کو معزول کرتا ہوں اب آپ لوگ جسے اہل سمجھیں اپنا خلیفہ بنا لیں"۔ ان کے بعد عمرو کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ "انہوں نے اپنے آدمی (حضرت علی) کو معزول کر دیا جیسا کہ آپ لوگوں نے سنا میں بھی انہیں معزول کرتا ہوں اور اپنے آدمی (حضرت معاویہ) کو قائم رکھتا ہوں"۔ ابو موسیٰ نے یہ سنتے ہی کہا مَالَکَ لَا وَفَقَکَ اللہ غَدَرتَ و فَجَرتَ (یہ تم نے کیا کیا؟ خدا تمہیں توفیق نہ دے تم نے دھوکہ دیا اور عہد کی خلاف ورزی کی)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص بولے "افسوس تمہارے حال پر اے ابو موسیٰ، تم عمرو کی چالوں کے مقابلہ میں بڑے کمزور نکلے"۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ "اب میں کیا کروں؟ اس شخص نے مجھ سے ایک بات پر اتفاق کیا اور پھر اس سے دامن چھڑا لیا"۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے کہا "ابو موسیٰ اس سے پہلے مر گئے ہوتے تو ان کے حق میں زیادہ اچھا تھا"۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا "دیکھو اس امت کا حال کہاں جا پہنچا ہے۔ اس کا مستقبل دو ایسے آدمیوں کے حوالہ کر دیا گیا جن میں سے ایک کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے اور دوسرا ضعیف ہے"۔ در حقیقت وہاں کسی شخص کو بھی اس امر میں شک نہیں تھا کہ دونوں کے درمیان اسی بات پر اتفاق ہوا تھا جو حضرت موسیٰ نے اپنی تقریر میں کہی تھی۔[1] اس

۱۔ خلافت و ملوکیت ص: ۱۴۴

سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ دومۃ الجندل میں ہونے والی کاروائی معاہدہ تحکیم کے قطعی خلاف تھی۔ لہٰذا حضرت علیؑ نے اس فیصلہ کو رد کرتے ہوئے اپنی جماعت کو مخاطب کر کے کہا۔

"سنو، یہ دونوں صاحب جنہیں تم لوگوں نے حکم مقرر کیا تھا انہوں نے قرآن کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور خدا کی ہدایت کے بغیر ان میں سے ہر ایک نے اپنے خیالات کی پیروی کی اور ایسا فیصلہ دیا جو کسی واضح حجت اور سنت ماضیہ پر مبنی نہیں ہے اور اس فیصلے میں دونوں نے اختلاف کیا ہے اور دونوں ہی کسی صحیح فیصلہ پر نہیں پہنچے ہیں"۔

(طبری ص: ۵۷ ج: ۴، خلافت و ملوکیت ص: ۱۴۳)

الغرض تحکیم کے اعلان کے بعد حضرت ابو موسیٰ عشری حضرت علیؑ سے منہ چھپا کر سیدھے مدینہ چلے گئے۔ اور حضرت نے کوفہ واپس آکر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ علامہ راغب کتاب المحاضرات میں لکھتے ہیں کہ:

"معاویہ کو حضرت علی پر اس سے غلبہ حاصل ہو گیا کہ معاویہ ہر حیلے سے اپنا کام نکالتے تھے چاہے وہ حیلہ حلال ہو یا حرام کیونکہ معاویہ کو نہ دین کی پرواہ تھی نہ خدا کا خوف تھا اور حضرت علیؑ کسی حیلہ ناجائز کو کام میں نہ لاتے تھے"۔ (بحوالہ تاریخ احمدی ص: ۲۱۱)

جنگ نہروان: جب حضرت علی صفین سے کوفہ پہنچے تو تقریباً بارہ ہزار افراد آپ کی فوج سے خارج ہو گئے جو بعد میں خارجی کہلائے۔ یہ لوگ کوفہ سے روانہ ہو کر نہروان نے قریب ایک عراقی بستی حروراء میں خیمہ زن ہوئے اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے منادی کرائی کہ شیث بن ربعی ان کا سپہ سالار جنگ ہو گا۔ جبکہ عبداللہ بن کوا یشکری نماز پڑھائے گا اور اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ جب حضرت علیؑ کو بتایا گیا کہ "وہ لوگ مطلق العنانی میں اپنے کو لاحکم الا اللہ (اللہ کے سوا کسی کا حکم

نہیں) کا مقلد سمجھتے ہیں تو آپ نے فرمایا "بات سچی ہے لیکن مقصود غلط ہے"۔

ان کی اصلاح کیلئے پہلے آپ نے عبداللہ بن عباس کو بھیجا جنہوں نے ان سے بات چیت کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ جسکے نتیجہ میں ان کے دو ہزار آدمی واپس آگئے۔ اور باقیوں نے جنگ کرنے کی ٹھان لی۔ صورتحال معلوم ہونے کے بعد حضرت علیؑ نے جہاد کیلئے انکی جانب پیش قدمی کی۔ وہاں پہنچ کر آپ نے انہیں راہِ راست پر لانے کی ایک اور کوشش کی۔ ان لوگوں نے آپ کے دلائل تسلیم کئے اور کہا کہ "آپ صحیح کہتے ہیں ہم نے اس معاملہ میں کفر کیا ہے اور ہم اللہ کی بارگاہ میں اس سے توبہ کرتے ہیں پس آپ بھی توبہ کریں جیسے ہم نے کی ہے۔ تو ہم آپکی بیعت کر لیں گے ورنہ آپ سے جنگ کریں گے"۔ آپ نے فرمایا "تمہارے لئے ہلاکت ہو کیا میں رسول اللہ پر ایمان لانے، ان کی معیت میں راہِ خدا میں جہاد کرنے اور ہجرت کرنے کے بعد اپنے اوپر کفر کی گواہی دوں"۔

اس کے بعد آخری کوشش کے طور پر آپ نے اپنے سپاہیوں کو ایک نشان عنایت فرمایا اور اعلان کرایا جو شخص اسکے سائے میں آجائیگا اسے امان دیجائے گی اور جو کوئی کوفہ چلا جائیگا وہ بھی محفوظ رہے گا۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ فروہ ابن نوفل اشجعی اپنی قوم کے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ خوارج سے کنارہ کش ہو گیا۔ اسکے بعد فریقین کی فوجیں صف آرا ہوئیں شدید جنگ ہوئی۔ خارجیوں کے چند آدمی بچے باقی سب کام آئے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو حضرت علیؑ نے زخمی خوارج کا علاج اپنے معالجوں سے کرایا۔ نہروان کی جنگ سے فارغ ہو کر ایک بار پھر آپ شام کی جانب متوجہ ہوئے۔

شہادت: حضرت علیؑ کی شہادت سے متعلق بہت سی روایتیں بیان کیجاتی ہیں جنکا خلاصہ یہ ہے کہ شہر کوفہ کے محلہ بنو کندہ میں کچھ خوارج رہتے تھے۔ ان میں ایک عورت قطام بنتِ الشحنہ تھی۔ یہ ایک خوبصورت بیوہ عورت

تھی بہت سے لوگ اس سے عقد کرنے کے خواہشمند تھے ان میں ایک ابنِ ملجم بھی تھا۔ اسکے باپ بھائی جنگ نہروان میں حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تھے لہٰذا اس نے اپنے عقد کی شرط حضرت علیؑ کا قتل رکھی تھی۔ جب ابنِ ملجم نے اس سے عقد کی پیشکش کی تو اس نے تین ہزار درہم نقد، ایک خوبرو کنیز خدمت کیلئے اور حضرت علیؑ کا قتل اپنا مہر قرار دیا۔ ابنِ ملجم نے کہا درہم اور کنیز کی شرط تو قبول ہے لیکن علیؑ کا قتل آسان کام نہیں" قطام نے جواب دیا کہ "یہ آسان ہے کنیز اور درہم کی شرط سے باز آؤں لیکن باپ بھائی کے انتقام سے باز نہیں آسکتی"۔ لہٰذا ابنِ ملجم آمادہ ہو گیا۔ قطام نے اس کام کیلئے اسے مددگار شبیب ابنِ حبیرہ اشجعی اور وردان فراہم کئے۔ اسکے بعد ابنِ ملجم نے اسی کے ہاں شب بسری اور شراب نوشی کی۔

ایام رمضان میں حضرت علیؑ ایک روز حضرت حسنؑ کے اور ایک روز حضرت امام حسینؑ کے افطار فرمایا کرتے تھے۔ اپنی شہادت سے چند روز قبل ہی سے آپ اپنی معمولاً کم خوراک میں مزید کمی کر دی تھی۔ اور لوگوں کے اصرار پر فرماتے کہ "میری موت قریب ہے میں نہیں چاہتا کہ حکم خدا کے پہنچنے پر آلودہ رہوں"۔

حضرت علیؑ کا معمول تھا کہ نماز سحر کیلئے مسجد میں تشریف لاتے تو وہاں سونے والوں کو نماز کیلئے جگا دیتے تھے۔ ۱۹ رمضان کو جب آپ کی ضربت کا واقعہ پیش آیا۔ آپ حسبِ معمول نماز سحر کے وقت وضوع کر کے گھر سے روانہ ہونے لگے تو بطخیں جو گھر میں پلی ہوئی تھیں شور مچانے لگیں اور آپ کے دامن کو پکڑنے لگیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مالک کو باہر جانے سے روکنا چاہتی ہیں۔ لوگوں نے انہیں ہٹانا چاہا تو آپ نے منع کیا اور فرمایا "یہ بطخیں مجھ پر نوحہ کر رہی ہیں"۔ اسکے بعد آپ نے مسجد میں پہنچ کر اذان دی۔ آپ کی صدائے اذان سنکر قطام نے ابنِ ملجم، شبیب اور وردان

کو جو اسکے گھر میں موجود تھے جگا کر کہا" قبل اسکے کہ لوگ مسجد میں آئیں میرا کام کر آؤ" لہٰذا یہ مسجد میں آئے اور وہاں سونے والوں کے ساتھ لیٹ گئے۔ حضرت علیؑ نے سونے والوں کو اٹھایا تو ابنِ ملجم سے کہا" اٹھو اور نماز پڑھو"۔

جب حضرت علیؑ نماز میں مشغول ہوئے اور سجدہ اولیٰ سے سر اٹھایا تو ابنِ ملجم ملعون نے ضرب لگا کر نمازی کا سر شگافتہ کر دیا۔ مورخین کا متفقہ قول ہے کہ وہ ضرب اسی مقام پر لگی جہاں یوم خندق عمرو بن عبدود کی تلوار سے لگی تھی۔ اس وقت آپ نے فرمایا فزت برب الکعبہ یعنی رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا۔ قاتل بھاگے مسجد میں شور بلند ہوا لوگ گھروں سے نکل کر دوڑے گریہ وزاری کی صدائیں گونجیں۔ ابنِ ملجم ملعون ضرب لگا کر مسجد سے نکلا کوفہ کی گلیوں میں دوڑا جاتا تھا کہ قبیلہ عبد قیس کے ایک شخص نے اسے پکڑ لیا۔ جب جراح نے حضرت علیؑ کے زخم کو دیکھا تو اپنا عمامہ سر سے اتار کر پھینک دیا اور کہا کہ جس تلوار سے آپ پر وار کیا گیا ہے وہ زہر آلود تھی لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قطام کا مذکورہ واقعہ اس حملے کا باعث نہ تھا بلکہ اس کے پس پردہ کوئی سازش کارفرما تھی۔ کیونکہ ایک عاشق تلوار سے تو وار کر سکتا ہے لیکن زہر آلود تلوار نہیں چلا سکتا یہ کام اس سازش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جس کے تحت مالک اشتر اور حضرت امام حسن کو زہر دیا گیا۔

جب آپ کی رحلت کا وقت قریب آیا تو آپؑ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو ضروری نصیحتیں اور وصیتیں کیں اور ان کے لئے دعائے خیر فرماتے ہوئے راہی خلد بریں ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خصائص نسائی کی ایک حدیث میں عمار بن یاسر سے روایت ہے کہ "پیغمبر خدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علیؑ! کیا میں تم کو ان دو آدمیوں کا حال بتاؤں جو بدبخت ترین مردم ہیں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ ہاں رسول اللہ۔ آنحضرت نے کہا کہ ایک تو قوم ثمود کا سرخ رنگ والا آدمی جس نے ناقہ صالح

کو پے (کوچیں کاٹ دیں) کیا۔ دوسرا وہ شخص جو تمہارے سر پر ضرب لگا کر تمہاری داڑھی کو خون سے خضاب کریگا"۔[1]

آپ کی شہادت ۲۱ رمضان ۴۰ھ کو ہوئی بہت سے لوگوں نے آپ کے مرثیہ کہے اور اس وقت سے آج تک مرثیہ گوئی کا سلسلہ جاری ہے لیکن کہتے ہیں کہ ابوالاسود الدوئلی کا مرثیہ بہت مشہور ہے۔

آپ کے مدفن کی بابت تاریخوں میں بہت سے اختلافی بیانات پائے جاتے ہیں۔ آپ کے روضۂ اقدس کی اہمیت کو کم کرنے اور جائے مدفن کو مشکوک بنانے کیلئے مختلف جگہوں پر آپکی تدفین کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن بقول ابن اثیر "حضرت علیؑ کی عمر ۶۳ سال کی تھی جبکہ انہوں نے اس دنیائے ناپائیدار سے انتقال فرمایا اور مسجد جامع کے قریب یا بقول بعض دوسری جگہ مدفون ہوئے۔ مگر صحیح ترین روایت یہ ہے کہ ان کی قبر شریف اسی جگہ ہے جہاں کی زیارت سے لوگ فیض یاب اور برکت اندوز ہوتے ہیں"۔[2]

ازواج واولاد : حضرت علیؑ کی پہلی زوجہ حضرت فاطمہ زہراؑ بنت رسول خدا تھیں۔ انکی حیات میں آپ نے کوئی دوسرا عقد نہیں فرمایا۔ حضرت فاطمہؑ سے حضرت حسن، حضرت حسین، دو فرزندان اور جناب زینب و جناب ام کلثوم دو دختران تھیں۔ انکے علاوہ جناب محسن بطن مبارک میں شہید ہوئے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کے بعد آپ نے نو عقد فرمائے ان ازواج سے پندرہ فرزندان اور اٹھارہ دختران پیدا ہوئیں۔ جنکی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ خولہ بنت جعفر بن قیس حنفیہ : کے بطن سے محمد اکبر پیدا ہوئے انکی کنیت ابوالقاسم تھی۔ اور محمد حنفیہ کے لقب سے مشہور تھے۔

۲۔ ام البنین (انکا نام فاطمہ تھا) بنت حزام بن خالد بن ربعہ : ان کے بطن سے عباس، جعفر، عبداللہ اور عثمان پیدا ہوئے۔ یہ چاروں بھائی میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

---

[1] تاریخ احمدی ص: ۲۱۴ [2] تاریخ احمدی ص: ۲۲۰

۳۔ ام حبیب بنت ربیعہ ثعلبیہ : انکے عمر ملقب بہ عمران اور رقیہ جڑواں پیدا ہوئے۔ عمران کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ صفین میں شہید ہوئے اور بابل کے کھنڈرات کے قریب دفن کئے گئے۔

۴۔ ام سعید بنت عروہ بن مسعود ثقفیہ : انکے بطن سے سات دختران ہوئیں جنکے نام رقیہ کبریٰ، رقیہ صغریٰ، زینب، ام کلثوم صغریٰ، الکرام، ام سلمیٰ اور رملہ تھیں۔

۵۔ ام شعیب مخزومیہ : انکے بطن سے ام الحسن اور رملہ تھیں۔ شیخ محمد عباس قمی نے ان کو ام سعید کے بطن سے بتایا ہے۔

۶۔ لیلیٰ بنت مسعود : (انھیں تاریخ انوارالسادات میں ہملا بنت مسروق حنظلیہ لکھا ہے) انکے بطن سے عبداللہ اور ابوبکر ہوئے۔ شیخ عباس قمی نے ان دونوں کو شہید کربلا لکھا ہے جبکہ تاریخ انوار السادات میں صرف ابوبکر کو شہید صفین تحریر کیا ہے۔

۷۔ امامہ بنت ابی العاص بن ربیعہ : انکے بطن سے محمد اوسط تولد ہوئے۔

۸۔ محیاۃ بنت امرا القیس : انکے ایک پسر احمد جو صغر سنی میں فوت ہوئے اور چھ دختران خدیجہ، تمیمہ، ام ہانی، میمونہ، فاطمہ، آمنہ تولد ہوئے۔

۹۔ اسماء بنت عمیس : انکے بطن سے یحییٰ انکی کنیت ابوالحسن تھی، محمد اصغر اور عون تولد ہوئے۔ بعض نے محمد اصغر ہی کو ابوبکر بتایا ہے۔

حضرت علیؑ کی چھ دختران اور بروایت دیگر آٹھ دختران کی شادی ہوئی بقیہ تمام دختران طفلی میں فوت ہوئیں۔ وہ چھ دختران یہ ہیں

۱۔ زینب یہ زوجہ تھیں عبداللہ بن جعفر طیار کی۔

۲۔ ام کلثوم یہ زوجہ تھیں محمد جعفر طیار کی۔

۳۔ رملہ یہ زوجہ تھیں ابوالہیاج (انوارالسادات میں ابوالصباح لکھا ہے) بن عبداللہ بن مغیرہ (ابوسفیان) بن حارث بن عبدالمطلب کی۔

۴۔ میمونہ یہ زوجہ تھیں عقیل بن عبداللہ بن عقیل بن ابی طالب کی

۵۔ فاطمہ یہ زوجہ تھیں محمد بن عقیل کی۔

۶۔ ام کلثوم صغریٰ یہ زوجہ تھیں کثیر بن عباس بن عبدالمطلب کی۔

حضرت علیؑ کا سلسلہ نسب آپ کے پانچ فرزندان سے چلا یعنی حسنؑ، حسینؑ، محمد حنفیہؒ، عباس، عمر (عمران) ہم نے حضرت امام حسنؑ اور آپ کی اولاد کا تذکرہ اسی جلد کے آخر میں کیا ہے۔ بقیہ فرزندان کے حالات اور انکی اولاد کی بابت تفصیل انشاء اللہ جلد سوئم میں تحریر کریں گے۔

فضیلت : حضرت علیؑ کے فضائل بے شمار و شہرہ آفاق ہیں۔ آپ کا ہر لمحہ فضائل سے پُر آپ کا ہر عمل باعث کمال، آپ کی زندگی مجسم فضیلت تھی آپ۔ پیدا ہوئے کعبۃ اللہ میں اور شہادت پائی مسجد میں یعنی اس عالم فانی میں تشریف لائے تو اللہ کا گھر میں اور جب عالم بالا میں تشریف لے گئے تو اللہ کے گھر سے۔ کیا شان ہے اس انسان کامل کی جسکی اللہ اور اسکا رسولؐ ہر ہر موقع پر مداح کریں۔ جسکی صفات کی بلندیوں تک رسائی نا ممکن ہے۔

مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نہایت معتبر اسناد کے ساتھ جتنے فضائل حضرت علی کے مروی ہیں اتنے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ نماز و روزہ، حج و زکوۃ، صبر و شکر، رحم و کرم، جود و سخا، عفو و حلم، ورع و تقویٰ، حیا و مروت، وعظ و نصیحت، زہد و قناعت، عدالت و شجاعت، تدبر و سیاست، غرض جملہ صفات حمیدہ میں سوائے رسالتمآبؐ آپ کا کوئی مثل نہیں آپکی کوئی نظیر نہیں۔ بقول شاعر "خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ"۔

قدمانے حضرت علیؑ کے فضائل کو جمع کرنے کیلئے ضخیم کتب مرتب کیں ہیں۔ ہم اپنے ان مختصر صفحات میں فضائل علیؑ بیان کرنے سے قاصر ہیں البتہ مسئلہ تفضیل سے متعلق مولانا عینی شاہ صاحب، نظامی حنفی مدظلہ (حیدرآباد دکن) کے مضمون سے ماخوذ کر کے چند سطور پیش کر رہے ہیں :

کسی اچھی صفت کا کسی میں بہ درجہ کمال پایا جانا فضیلت کا باعث ہے اور جب ایسی پاک صفات کا کوئی مجمع علیہ ہو تو وہ اپنے اقران میں ایک افضل

فرد مانا جاتا ہے۔ یہ رہابر قوم وملت کے ارباب حل وعقد کا مسلمہ کلیہ۔ مگر خلفائے راشدین کے معاملے میں ہمارے فقہا ساری دنیا سے الگ ہو کر صرف ترتیب خلافت کو تفضیل کا معیار دیتے ہیں اور معقولیت سے ذرا دور جا پڑتے ہیں۔ بھلا کیا کسی کا کسی منصب یا عہدے پر پہلے مامور ہو جانا کوئی معیار فضیلت ہو سکتا ہے؟ کیا سب سے پہلے نبی حضرت آدمؑ کو ہم آنحضرت سے افضل مان سکتے ہیں؟ ممکن ہے کہ فضیلت پر ترتیب خلافت کا خیال قرون وسطیٰ میں نیا حل ہونے کی وجہ سے خوشگور رہا ہو مگر آج کل جبکہ معقول و منقول کی عالمگیر اشاعت ہو رہی ہے وہ ایک فرسودہ اور بودا فقہی قیاس نظر آرہا ہے۔ آئمہ کلام میں تفضیل بر ترتیب خلافت کو معیار قطعیت پر پہنچانے والے ایک ابوالحسن اشعری ہیں۔ باقی اور بزرگوار ابو منصور ماتریدی۔ باقلانی۔ امام الحرمین، تفتازانی۔ فارابی۔ ابن رُشد۔ غزالی اور علامہ عضد ترتیب خلافت کو تو قطعی مانتے ہیں مگر فضیلت بر ایں ترتیب کو صرف قیاسی اور اجتہادی تصور کرتے ہیں جو معقول سی بات بھی ہے۔ کیونکہ اسلام میں افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کا امام اور خلیفہ بنایا جانا ناجائز اور منصوص ہے۔ چنانچہ پیغمبر وقت حضرت داؤد کے ہوتے ہوئے طالوت ایک غیر نبی خلیفہ اور امام بنائے گئے اور آنحضرت کے مواجہہ میں حضرت ابوبکرؓ نے کئی نمازیں پڑھائیں۔

علامہ آمدی کہتے ہیں کہ ہمارے سلف مسئلہ تفضیل کو حل نہ کر سکے۔ بعض تو تفضیل بر ترتیب خلافت کے معترف رہے بعض حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؑ کو ترجیح دیتے تھے اور بعض حضرت علیؑ کو افضل امت مانتے آئے (استعیاب جلد دوم ص : ۲۰۳ ص : ۴۷۵ اور تدریب الراوی ص : ۲۰۷) اسی وجہ سے حافظ ابن حجر، فتح الباری جلد ۱۴ ص : ۳۵۸ میں بروایت ہارون بن اسحٰق، یحییٰ بن معین سے راوی ہیں کہ ترتیب خلافت کو

مانتے ہوئے کسی نے حضرت علیؑ کی سابقیت و قرابت کا اعتراف کیا تو وہ یقینی اہل سنت سے ہے۔ اور ابن عبدالبر استعیاب جلد ۲ ج : ۴۷۹ میں لکھتے ہیں کہ ہمارے سلف نے افضل امت کون ہیں انکی کوئی یکسوئی نہ کی۔ چنانچہ سند المحدثین معمر بن راشد وغیرہم کا یہ فتویٰ ہے کہ خلفائے ثلاثہ کی تعظیم و تکریم کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ کو افضل امت ما کوئی قادح نہیں۔ شیخ محدث دہلوی تکمیل الایمان ص : ۷۸ میں علامہ خطابی سے ناقل ہیں کہ ہمارے سلف اس مسئلہ میں ہمیشہ مذبذب رہے چنانچہ وہ ابوبکرؓ خیر من علیؑ و علیؑ افضل من ابی بکرؓ کہا کرتے تھے۔

امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی روضہ ندیہ ص : ۱۸۹ پر لکھتے ہیں کہ مسئلہ تفضیل کا کوئی قطعی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بعض محدثین اہلسنت اور معتزلہ بصرہ فضل بر ترتیب کے زعیم رہے اور بعض سنی محدثین اور معتزلہ بغداد حضرت علیؑ کو افضل امت مانتے تھے۔

علامہ ابن حزم ملل و نحل جلد ۴ ص : ۱۱۲ میں لکھتے ہیں کہ امت نے اب تک اس کی یکسوئی نہ کی کہ افضل امت کون تھے۔ بعض معتزلی و مرجیہ و سنی اور سارے کے سارے شیعہ جناب امیرؑ کو افضل امت مانتے آئے جو بعض اجل صحابہ و تابعین کا بھی مذہب رہا ہے اور بعض سنی، معتزلی، ناصبی اور کل خارجی حضرت ابوبکرؓ کو ہی افضل امت تسلیم کرتے آئے ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر استعیاب جلد دوم ص : ۲۰۸ میں ابواسحٰق سبیعی سے بروایت محمد بن بشار ناقل ہیں کہ سبیعی نے حضرت علیؑ کو افضل ماننے والے بیس صحابیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ علامہ محی الدین نووی شرح مسلم جلد ۲ ص : ۲۴۸ میں حدیث منزلت کی شرح لکھتے ہوئے کہتے ہیں

وحذا الحديث لا حجته فيه لاحد منهم بل فيه اثبات فضيلته لعلى ولا تعرض فيه لكونه افضل من غيره اومثله وليس فيه دلالته

لاستخلافه بعد النبی صلی الله علیه و اله وسلم (ترجمہ یہ وہ حدیث ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ بھی کہ جس سے فضیلت علیؑ ثابت ہے۔ اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں کہ ان سے افضل کوئی نہیں ہے اور ان کے مثل کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ حدیث دلیل خلافت نہیں ہے کہ نبی کے بعد علیؑ خلیفہ ہیں۔) یعنی اس حدیث سے شیعہ کے دعاوی میں سے کسی ایک کی بھی دلیل نہیں ملتی۔ البتہ اس سے فضیلت علیؑ ثابت ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جناب امیرؑ اپنے غیر سے اور اپنے ہمسر سے افضل ہیں۔ لیکن آپ کے خلیفہ بلافصل ہونے کی اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں۔

علامہ ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ہمارے سلف بصرہ حضرت ابوبکرؓ کو اور سلف و خلف بغداد حضرت علیؑ کو افضل امت مانتے ہیں بلکہ بصرہ کے بڑے عالم محمد بن عبدالوہاب جبائی حدیث طیر کی صحت پر قاضی القضاۃ ابوالحسن عبدالجبار بن احمد البصری حدیث منزلت کی نص پر حضرت علیؑ کا ہی افضل اُمت ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ اور ابو محمد حسن بن متویہ بھی کفایہ میں روایات فضیلت جناب امیرؑ کی کثرت و صحت کی بناء پر آپ ہی کا افضل امت ہونا ثابت کرتے ہیں لہٰذا ہم خلف بھی باتباع ائمہ ہدیٰ حضرت امیرؑ کا افضل امت ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ اور بات بھی یہی ہے کہ جناب امیرؑ کی ان گنت اور بڑھی چڑھی فضیلتوں کے آگے کوئی بھی ہو تو اور کیا کر سکتا ہے۔

چنانچہ امیر المومنین حدیث احمد بن حنبل اور نسائی، حاکم، ابو علی نیشاپوری، قاضی اسمٰعیل بن اسحٰق، ابن جریر طبری، ابن عقدہ و ابن عبدالبر جیسے ائمہ حدیث بالاتفاق معترف ہیں کہ فضائل امیرؑ میں جس کثرت سے صحیح الاسناد حدیثیں آئی ہیں ایسی کسی اور صحابی کی شان میں نہ آئی ہیں۔

(مستدرک حاکم جلد ۳ ص: ۱۰۷، ستعیاب جلد ۲ ص: ۴۷۹ اور صواعق محرقہ ص: ۷۲)

حضرات ابنِ عباسؓ و ابنِ مسعودؓ و ابوذرؓ کا متفقہ بیان ہے کہ علیؑ کی شان میں جس کثرت سے آیتیں نازل ہوئیں کسی اور کی شان میں نہ آئی ہیں۔

(کنزالعمال ج: ۶ ص: ۱۵۳ ص: ۳۹۱ و ابو نعیم در حلیہ ص: ۶۶ و ریاض ص: ۲۰۷ و صواعق محرقہ ص: ۷۲، ۷۶، نیز حضرات ابی ابن کعبؓ حزیفہؓ و ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے ناقل ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی یاایھاالذین امنو کا خطاب وارد ہے علیؑ اس گروہ کے سردار اور رئیس ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ کی شان میں ۳۰۰ آیتیں نازل ہیں (صواعق محرقہ ص: ۷۲)

بعضوں کا یہ تخیل کہ خوارج و بنو امیہ کے برے سلوک کا آنحضرت کو پیش از پیش علم ہونے سے آنحضرت نے بطور حفظ ما تقدم فضائل علیؑ بہ کثرت بیان فرمائے (صواعق ص: ۷۴ و ازالۃ الخلفاء ص: ۲۵۱) کوئی دل لگتی تاویل نہیں کیونکہ آنحضرتؐ نے باوجود اس علم کے خلفاء ثلاثہ کو بھی مورد طعن بنایا جائے گا ان بزرگواروں کے اتنے فضائل بیان نہ فرمائے علاوہ بریں آنحضرت کی ذات قدسی صفات کی طرف ایسی بے تکی باتوں کی نسبت دینا بھی سوء ادبی اور گستاخی ہے۔ آنحضرتؐ نے جتنا جس کے متعلق فرمایا وہ عنداللہ بھی اتنے ہی کے مستحق تھے۔

بعض کا یہ قیاس کہ شیعہ نے ہماری کتابوں میں حضرت علیؑ کے صدہا وضعی فضائل الحاق کر دیئے ہیں نہایت ہی بھونڈا مغالطہ ہے کیونکہ اسی (۸۰) سالہ دور بنو امیہ میں فضائل علیؑ تو در کنار نام علیؑ بھی زبان سے نکالنا مستوجب قتل تھا اور شیعان علیؑ اپنی جان و آبرو کی خیر مناتے دبکے پڑے رہے تھے۔ اس دور میں جبکہ حقیقی فضائل علیؑ بھی زبان پر نہیں لاسکتے تھے تو وضعی فضائل کا الحاق اور اشاعت جان جوکھم کی بات تھی۔ اس کے قطع نظر فضائل علیؑ بکثرت روایت کرنے والے حضرات اساطین علمائے اہل سنت امام احمد بن حنبل، ابن ابی شیبہ، اعمش، نسائی، عبدالرزاق، ابو علی نیشاپوری، قاضی اسمٰعیل ابنِ عقدہ، ابنِ مردویہ، حاکم، ابو حاتم رازی، طبرانی، ابنِ جریر

طبری، ابنِ عبدالبر، ابو نعیم، دیلمی، ابنِ مغازلی، ابنِ اثیر جزری، خوارزمی، دولابی، سیوطی و ابنِ حجر مکی وغیرہم مستند ائمہ حدیث ہیں ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر موضوعات کا ادخال ان کی کتابوں میں کارے دارد تھا۔ تدوین کتب سے پہلے انہوں نے ہر روایت کی دیکھ بھال کر لی اور اپنے اطمینان کے بعد ہی ان حدیثوں کو منتقل کیا اور ہم تک پہنچایا۔ اس پر آج اہل یہ کہنا کہ ان کتابوں میں شیعہ کی ساختہ و پرداختہ روایتیں بھری پڑی ہیں ایک طفلانہ عذر ہے۔ بلکہ معاملہ تو اس کے برعکس ہوا ہے۔ خلفائے راشدین کی ختم خلافت کے ساتھ ساتھ بنو امیہ کا ۸۰ سالہ دور شروع ہو گیا اور اس دور کی چند خصوصیتوں میں استیصال فضائل علیؑ اور سب و شتم علیؑ بہت نمایاں تھا۔ بنو امیہ کی اس مسلسل سعی استیصال مناقب علیؑ کے باوجود آج اہل سنت کی کتب حدیثیہ میں ہزار ہا احادیث فضائل علیؑ کا موجود رہنا ان فضائل امیرؑ کی حقانیت کی دلیل ہے (کتاب الاحداث للعلامہ ابوالحسن علی ابن المدائنی)۔ جناب امیرؑ کی توہین و تنقیص کا مرض مسلمانوں میں ۴۱ھ سے جو شروع ہوا وہ چل کر ۲۵۶ھ میں کہیں نابود ہوا چنانچہ علامہ ابن رجنہ اندلسی متوفی ۶۳۳ھ اپنی کتاب اسماء النبی میں اس وبا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری جیسا امام فن حدیث بھی اس اثر سے بچ نہ سکا

بدانا بما اورده مسلم لانه اورده بکماله و قطعه البخاری و اسقط فيه علىٰ عادته كمائرىٰ وهو هما عيب عليه فی تصنيفه ماجرىٰ ولاسيّما ذكر علیؑ ابن ابی طالب ان حالات کے باوجود جناب امیرؑ کے ان گنت فضائل و مناقب کا وجود سب سے بڑا اعجاز ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جہاں حکومتیں آپ کے مناقب و فضائل کے استیصال میں اپنا خون پانی ایک کر دیں خدا نے ان کے مناقب و فضائل اتنے پھیلا دیئے کہ آج سب سے بڑھ کر آپ ہی کے فضائل ہماری حدیث کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

ایک طرف تو آپ کے خداداد محاسن و مکارم بے شمار نظر آتے ہیں اور دوسری طرف آپ کی فضیلتیں صدہا دکھائی دیتی ہیں۔ سب سے بڑا لطف یہ ہے کہ سب کی سب ثابت بھی ہیں، مسلم بھی، مرفوع بھی، اور مرسل بھی، بڑھی چڑھی اور انوکھی بھی۔

مسئلہ تفضیل سے متعلق جناب مولانا عینی شاہ نظامی کے مختصر مگر مستند و مدلل تحریر کے بعد اسی موضوع پر ایک اور نظامی صاحب مدیر ماہنامہ "منادی" نئی دہلی کا واقع نقل کرتے ہیں جو جناب عابد علی نظامی کی منقبت سے متعلق ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

منقبت: یہاں عابد حسین نظامی کی ایک نظم (منقبت) ماہنامہ "منادی" نئی دہلی کے ص: ۲۰ شمارہ ۸ جلد ۳۹ میں شائع ہوئی تھی جس پر مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی (لکھنؤ) کے اعتراض اور مدیر ماہنامہ مذکور کے جواب کو امامیہ مشن ٹرسٹ لاہور نے بشکل مقالہ نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا تھا۔ مضمون کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہم اسے نذر قارئین کر رہے ہیں۔

خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

علیؑ اخی محمدؐ علیؑ خدا کا ولی　　علیؑ کا نام ہے نام خدائے لم یزلی

علیؑ کے ذکر سے دشمنِ خدا کی بات چلی　　لکھا ہے بابِ ارم پر بخطِ سبز و جلی

خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

وہ کون ہے در حیدر کا جو نہیں سائل　　کہا جو حیدر کرارؑ حل ہوئی مشکل

ہیں ضرب حیدری کے جبرئیل بھی قائل　　ہیں اس حدیث پیمبر کے شافعیؒ ناقل

خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

علیؑ ہے فخر پیمبرؐ، علیؑ ہے نفس رسولؐ　　علیؑ ہے جانِ محمدؐ، علیؑ ہے زوجِ بتولؑ

جو علیؑ کا ہے بے شبہ از گروہ جہول　　یہ سن کے شاد ہے مسلم، تو خارجی ہے ملول

خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

علیؑ کا اسم ہے از اسمائے رب مجید　　علیؑ یگانۂ دوراں، علیؑ ہے فرد فرید
علیؑ ہے کفر کی کثرت میں حافظِ توحید　　خدائیان علیؑ کو یہ دی ہے حق نے نوید
خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

علیؑ کے پائے کا پایا نہ آج تک زاہد　　علیؑ سا دیکھا نہ بعد از نبی کوئی ساجد
علیؑ کے شیفتہ سب ہیں مگر بجز حاسد　　کھلا یہ ہم پہ حدیثِ غدیر سے عابد
خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

مولا علیؑ مشکل کشاء کی اس منقبت کے بارے میں جناب صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی کے خط کا مضمون ملاحظہ ہو۔ "تازہ منادی ابھی سرمایہ تفکر و تفریح دماغی ہوا۔ خدا آپ کو فیضِ رسانِ مسلمین و مسترشدین رکھے۔ ص : ۲۰ کی نظم شاید آپ نے غور سے نہیں دیکھی ورنہ ظاہر ہے کہ

خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

اہلسنت کے مجمع علیہ عقیدہ کے بالکل خلاف ہے اور کھلا ہوا تبرہ بھی ہے، نیز

ہیں ضربِ حیدری کے جبرئیلؑ بھی قائل

بھی سراسر غلط، باطل اور ہمارے مسلک کے خلاف ہے، کیا آپ اس کی تصیح کردیں گے۔"

اس کے جواب میں مدیرِ ماہنامہ مذکور نے تحریر فرمایا
حضرت شہید کا کرم نامہ پڑھ کر مجھے وہ مشہور واقعہ یاد آگیا کہ جب نظام دکن اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نے والد مرحوم حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سے پوچھا تھا۔
خواجہ صاحب! میں نے سنا ہے آپ تفضیلی ہیں اور خواجہ صاحب نے جواب دیا تھا :
"جی ہاں! صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے بزرگ بھی تفضیلی رہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو افضل مانتے آئے ہیں"۔

نظام دکن نے پوچھا : تفضیل کی کوئی دلیل ؟
خواجہ صاحب نے کہا : "دلیلیں بہت سی ہیں لیکن میں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد ہوں اور ان کے سلسلے میں مرید بھی ہوں، اپنے باپ کو سب بڑا کہتے ہیں اور اپنے پیر کو سب سے بڑا کہتے ہیں"۔
نظام دکن نے پھر سوال کیا۔ "اور ترتیب خلافت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟"
خواجہ صاحب نے جواب دیا "پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر دوسرے حضرت عمر تیسرے حضرت عثمان اور ۔۔۔۔۔"
نظام دکن ضبط نہ کر سکے اور بجھ کر کہا : "پھر وہ تفضیل کہاں رہی ؟"
حضرت خواجہ صاحب نے نہایت سکون سے جواب دیا۔ "جہاں سرکار دو عالم افضل الانبیاء خاتم النبیین حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی تفضیل رہی! آخر میں آنے سے فضیلت میں کیا فرق پڑ سکتا ہے ؟ ہمارے رسولؐ سب سے آخر میں تشریف لائے لیکن سب سے افضل تھے!"
نظام دکن نے زانوں پر ہاتھ مار کر کہا : "خواجہ صاحب! آج آپ نے میرے دل کی پھانس نکال دی"۔
حضرت شہید کی خدمت میں عرض ہے کہ میاں عابد حسین نظامی کی مراد بھی

خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ

سے تفضیل ہی ہے نہ کہ ترتیب خلافت، ترتیبِ خلافت تو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس سے کوئی سمجھدار آدمی کیسے انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص دیگر صحابہ کرام کی بزرگی کا منکر بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ نظامیت کا حلقہ پہننے والا کبھی تبرے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔
میاں عابد حسین نظامی نے "خدا کے بعد نبیؐ ہے نبیؐ کے بعد علیؑ" اس لئے کہا کہ جب وہ اپنے سلسلہ کا شجرہ پڑھتے ہیں تو جس طرح ان کو اللہ

اور اس کے رسولؐ حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کے درمیان کسی کا نام نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ہمارے سرکارؐ سے پہلے بیشمار انبیاء گزر چکے ہیں۔ اسی طرح اس شجرے میں ان کو رسولؐ کے بعد بھی بلا فضل آقا و مولا علیؑ کا نام ہی دکھائی دیتا ہے، حالانکہ ہمارے ولی نعمت علی علیہ السلام کے علاوہ اور بھی بیشمار صحابہ کرام ہیں لہٰذا انہوں نے خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد علی کی ترتیب قائم کی تو کچھ غلط نہیں کیا اور میاں عابد یہ ترتیب کیا قائم کرتے، یہ تو قدرتی طور پر قائم ہے ہمارا آپ کا اس میں دخل کہاں ہے۔ ہمارے لئے تو بس اللہ تعالیٰ نے مقسوم کردیا کہ تم کو امتِ محمدیؐ میں داخل کیا جاتا ہے اور اس امت میں تم دامن مرتضویؑ سے وابستہ ہو گئے۔
ہم کیا کریں کہ جس پیر مغاں کا رشتہ ازل سے ہمارے کان میں ہے اور جس ساقی کے ایک جرعے نے ہمارے رفتگان اور ہمارے آئندگان کو خراب کر رکھا ہے وہ کوثر والا علیؑ ہی ہے یہ بات ہمارے بس میں ہے کہاں کہ کسی اور سخی کے در پر صدا لگا آئیں۔ ہمارے حصہ کی تو اسی جگہ لکھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کی زنجیر سے باندھ دیا بندھ گئے اور جس کے ہاتھ سے جو کچھ پلا دیا پی رہے ہیں۔ اور یہ چیز ہماری وفاداری اور نمک حلالی سے بعید ہے کہ کھائیں تو کسی اور کا اور گائیں کسی اور کا! کسی کو بھی ہم غلامان ازلی سے توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ صبح و شام ہم ٹکڑے تو توڑیں علیؑ کے دستر خوان پر ہماری گزر بسر ہو خانہ زادگان علیؑ کے الش پر اور گیت گائیں ہم کسی اور سخی کے۔

> نوٹ : قرن اول یعنی آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ کے زمانہ کے حالات کی مزید تفصیل اور علیؑ ابن ابی طالب کی اولاد کے تفصیلی حالات جلد سوئم میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امام حسنؑ

ولادت و نسب : حضرت حسنؑ بن علیؑ کی ولادت باسعادت بتاریخ ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ مطابق ۶۲۳ء بروز شنبہ بوقت شب بمقام مدینہ منورہ میں ہوئی۔[۱] آپکا نسب دنیا کا بہترین نسب ہے۔ آپ نواسۂ رسولؐ اور اولاد علیؑ و بتولؑ ہیں۔ ولادت کے ساتویں دن آپکے نانا نے آپ کا عقیقہ کرایا سر کے بال منڈوائے اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی تول کر صدقہ کی۔
کنیت و لقب : حکم خداوندی کے مطابق رسالتمآبؐ نے اپنے دونوں نواسوں کے نام رکھے جیسا کہ اس حدیث میں ارشاد ہے کہ " میں نے حسن اور حسین اللہ کے حکم سے نام رکھے "[۲] ابن سعد نے عمران بن سلیمان کی زبانی لکھا ہے کہ " حسن اور حسین یہ دونوں نام جنتیوں کے ہیں۔ زمانہ جاہلیت یعنی اسلام سے پہلے کسی نے یہ نام نہیں رکھے تھے کیونکہ وہ ان دونوں ناموں سے واقف نہ تھے۔ "[۳] حضرت حسنؑ کی کنیت ابو محمد تھی اور آپکے مشہور القاب شبر، ذکی، مجتبیٰ، قائم، سبط، ولی اور سید تھے۔
مشابہت و محبوبیت : حضرت حسنؑ شکل و شباہت میں اپنے ناناؐ کی شبیہ تھے۔ امام بخاری نے حضرت انسؓ کی زبانی لکھا ہے کہ "امام حسن رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ اور امام حسنؑ کے سوا کسی اور کی صورت رسول اللہ ﷺ سے نہیں ملتی تھی۔[۴] لیکن بخاری نے یہی بات

[۱] منتہی الامال ص: ۳۶۸ ج: ۱ [۲] کنز الحقائق ص: ۲۶ [۳] تاریخ الخلفاء ص: ۲۱۶ [۴] صحیح بخاری ص: ۳۹۸ باب: ۶۳

امام حسینؑ کی بات بھی کہی ہے۔ رسالتمآب کو اپنے دونوں نواسوں سے بے پناہ محبت تھی جس کا اظہار آپ اکثر و بیشتر فرمایا کرتے تھے اور اپنے اصحاب کو بھی ان دونوں سے محبت کرنے کی تلقین فرماتے تھے اور صحابہ کرام آپؐ کی اس والہانہ محبت کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اپنے نواسوں سے رسالتمآب صلعم کی الفت و محبت سے متعلق کتب احادیث میں بہت سی روایات منقول ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱) جناب عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ " پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حسنؑ اور حسینؑ میری فرحت ہیں، میرے دل کا سکون ہیں اور وہ خوشبو ہیں جن کو میں پسند کرتا ہوں۔ " (صحیح بخاری ص: ۴۹۹، باب ۱۴، ص: ۵۳۵ باب ۳۴، جامع ترمذی ص: ۴۹۹، خصائص نسائی ص: ۲۶)

۲) جناب ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہؐ جناب فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کیا لڑکا یہاں ہے کچھ دیر نہ گزری تھی کہ امام حسنؑ دوڑتے ہوئے آئے اور حضورؐ نے ان کو سینہ مبارک سے چمٹالیا اور پیار کرنے لگے۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: اے پروردگار میں اسے پیار کرتا ہوں تو بھی اُس سے پیار کر جو اسے پیار کرے۔ " (صحیح بخاری ص: ۳۵۹، باب ۸، ص: ۳۸۸ باب ۴۳، ص: ۱۳۱ ج: ۸)

۳) حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ " میں نے جناب سرور کائنات کو منبر پر تشریف رکھتے ہوئے دیکھا کہ پہلو میں امام حسنؑ بیٹھے ہوئے تھے اور آنحضرت کبھی انکو دیکھتے اور کبھی حاضرین مجلس کی جانب متوجہ ہو کر فرماتے کہ یہ میرا بیٹا سردار ہے امید ہے کہ پروردگار اسکی وجہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔ (صحیح بخاری ص: ۵۸۱ باب ۱۰، ص: ۵۵۱، باب: ۲۹، جامع ترمذی ص: ۲۶۶، سنن ابن داؤد ص: ۲۹۲: ج: ۲، سنن نسائی ص: ۲۰۸ ج: ۱، مشکوٰۃ ص: ۱۳۱ ج: ۸، مستدرک ص: ۱۷۵ ج: ۳، مسند احمد حنبل ص: ۳۸ ج: ۵ وغیرہ)

۴) ابوسلمہؓ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ " آنحضرتؐ امام حسنؑ کیلئے

اپنی زبان دہن سے باہر نکالتے اور جب وہ زبان مبارک کی سرخی کو دیکھتے تو اس کی جانب جھک پڑتے۔ "
(مسند احمد بن حنبل ص: ۹۳ ج: ۴، انتخاب از کنزالعمال ص: ۱۰۴)

۵) عبداللہؓ بن زبیر سے روایت کی ہے کہ " تمام لوگوں کی نسبت حضرت امام حسنؑ رسول اللہؐ سے بہت مشابہ تھے اور سرور عالم ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میرا چشم دید ہے کہ سرور عالم سجدہ میں ہیں اور حضرت امام حسنؑ آکر آپ کی گردن یا پیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب تک حضرت حسنؑ خود خود نہ اتر جاتے رسول اللہؐ ان کو نہ اتارتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ سرور عالم رکوع میں ہیں کہ حضرت حسنؑ آئے اور آپؐ کی دونوں ٹانگوں میں سے ہو کر دوسری طرف نکل گئے۔ " (تاریخ الخلفاء ص: ۲۱۷)

۶) شیخان نے حوالہ براء بن عازب لکھا ہے کہ " میں نے خود دیکھا ہے کہ امام حسنؑ کو رسول اللہؐ اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے فرمارہے تھے۔ اے اللہ! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس کو محبوب بنا۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۱۷)

۷) ایک مرتبہ امام حسنؑ خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ ایک لمبے قد والا آدمی کھڑا ہوا جو ازد سے تھا اور بولا میں نے رسول اللہؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپؐ حسنؑ کو اپنی گود میں اٹھائے ہوئے کہہ رہے تھے کہ جو کوئی مجھے دوست رکھتا ہے وہ میرے اس بچہ کو دوست رکھتا ہے اور یہ میرا پیغام ان تک پہنچا دو جو یہاں نہیں ہیں۔ " (انتخاب از کنزالعمال ص: ۱۰۴، مسند احمد بن حنبل ص: ۳۶۶ ج: ۵، تاریخ الخلفاء ص: ۲۱۸)

۸) حاکم نے ابن عباس کی زبانی روایت بیان کی ہے کہ " رسول اللہؐ امام حسنؑ کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے یہ دیکھ کر ایک آدمی نے کہا اے صاحبزادے تمہاری سواری بڑی اچھی ہے۔ یہ سن کر سرور عالم نے فرمایا سوار بھی اچھا ہے"۔ (تاریخ الخلفاء ص: ۲۱۷)

فضائل و مناقب : حضرت امام حسنؑ بڑے سخی و جواد، بردبار و حلیم الطبع، مالک عزت و شرف، بلند شان و پر وقار، صاحب اقبال و احتشام اور روشن ضمیر و عبادت گذار تھے۔ آپ کے فضائل و مناقب کی بابت بہت سی روایات بیان کی گئی ہیں ان میں سے چند ایک روایات علامہ جلال الدین سیوطی سے نقل کر رہے ہیں :-

"حاکم نے عبداللہ بن عبید کی زبانی لکھا ہے کہ امام حسنؑ نے پیادہ پا پچیس حج کئے جن کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حشم و خدم اور سواریاں آپ کے ساتھ ہوتیں لیکن آپ خود پیدل چلا کرتے تھے۔"

" ابن سعد نے عمیر بن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام حسنؑ بڑے شیریں کلام تھے آپ جب گفتگو کرتے تو جی چاہتا کہ سلسلہ کلام جاری رکھیں اور خاموش نہ ہوں۔ میں نے آپکی زبان سے کبھی کوئی فحش بات نہیں سنی۔"

"ابن عساکر نے جویریہ بن اسماء کی زبانی لکھا ہے کہ امام حسنؑ کے جنازہ پر مروان نے گریہ وزاری کی تو امام حسینؑ نے فرمایا اب لاشہ پر رو رہے ہو در آنحالیکہ تم نے زندگی میں انکے ساتھ ہر قسم کی برائی کی۔ جس کے جواب میں پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مروان نے کہا میں یہ سب کچھ اس شخصیت کے ساتھ کیا کرتا تھا جو اس پہاڑ سے بھی زیادہ حلیم و بردبار تھا۔"

" علی بن زید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام حسنؑ نے دو مرتبہ اپنا پورا مال راہ خدا میں دے دیا اور تین مرتبہ اپنی ملکیت کی ہر چیز کو سبیل اللہ میں دے دی۔ "[1]

پیش آمدہ واقعات : حضرت حسن مجتبیٰؑ نے اپنی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال اپنے جد نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ عاطفت میں گزارے۔ آپ کی پہلی تربیت گاہ آغوش پیغمبرؐ تھی۔ آنحضرتؐ

[1] تاریخ الخلفاء ص: ۲۱۸ - ۲۱۷

کی وفات کے بعد اپنے پدر بزرگوار حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی زیر سرپرستی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سن بلوغ کو پہنچ کر نانا کے دین کی ترویج اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد عربوں کی عصبیت کے اس دیو نے جسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنے پیروں تلے کچل دیا تھا ایک بار پھر سر اٹھایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینۃ الرسول میں مسلمانوں نے اپنے ہی خلیفہ پر یلغار کر دی اس موقعہ پر خلیفہ سوئم حضرت عثمانؓ بن عفان کی مدافعت کرتے ہوئے حضرت حسن مجتبیٰؑ بلوائیوں کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ اور اسی عربی عصبیت کے باعث قبیلہ بنو ہاشم کے لئے عموماً اور اولاد ابوطالب کیلئے خصوصاً حالات ناسازگار ہونے لگے۔ حضرت امام حسنؑ ان تمام حالات و معاملات کا مشاہدہ فرماتے رہے اور نہایت صبر و استقلال سے تبلیغ دین میں مصروف رہے حتیٰ کہ وفات پیغمبرؐ کے چوبیس سال بعد ذی الحجہ ۳۵ھ کو امت مسلمہ نے آپ کے پدر محترم حضرت علیؑ کی بیعت کی۔ اس عرصہ میں قبائلی عصبیت اور بغض و حسد کی چنگاری شعلہ بن چکی تھی جسکے نتیجہ میں جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان وجود میں آئیں اس طرح حضرت علیؑ کو اپنی خلافت کا تقریباً ساڑھے چار سالہ دور میدان جنگ میں ہی گزارنا پڑا۔ حضرت امام حسنؑ اپنے پدر بزرگوار کیساتھ جنگوں میں مصروف رہے۔

حضرت علیؑ کی شہادت یعنی ۲۱ رمضان ۴۰ھ کے بعد حضرت حسن مجتبیٰؑ کو امامت و خلافت دونوں منصب تفویض ہوئے۔ منصب امامت تو بحکم خدا پدر بزرگوار نے عطا کیا جبکہ منصب خلافت چالیس ہزار سے زائد مسلمانوں کی بیعت کے ذریعہ ملا۔ جملہ مورخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد سب سے پہلے قیس بن سعد انصاری نے بیعت کیلئے ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ " میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور مخالفین

سے جنگ پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔" آپؑ نے فرمایا "کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کافی ہے اور تمام شرائط پر حاوی ہے"۔[1] قیس بن سعد کی بیعت کے بعد دیگر لوگوں نے بھی بیعت کی اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ تمام اہل عراق نے آپ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمد مصطفیٰؐ پر درود بھیجا پھر فرمایا اے لوگوں دنیا فتنہ و فساد کی جگہ ہے اسکی جس قدر نعمتیں ہیں سب روبہ زوال اور منتقل ہونے والی ہیں اللہ نے ہمیں دنیا کے حالات سے مطلع کیا ہے۔ سزا و جزا کا وعدہ فرمایا ہے کہ ہم عبرت حاصل کریں ظلم و فساد سے بچیں کہ قیامت کے دن ہم سے باز پرس نہ کی جائے تم اس ناپائیدار دنیا سے محبت نہ رکھو۔ اپنے ارادوں کو صرف نیکیوں پر وقف کر دو۔ تم سے جناب امیر المومنین علیؑ کے حالات پوشیدہ نہیں۔ تم نے انکا حسن معاشرت اور حلم دیکھا ہے خوب جانتے ہو کہ انہوں نے اپنی زندگی میں لوگوں کے ساتھ کسطرح زندگی بسر کی ہے اور جس وقت موت کا وقت آپہنچا تسلیم و رضا کیساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔ اور اپنے اہل بیت کو تم میں چھوڑ گئے۔ میں حسنؑ بن علی بن ابطالب ہوں۔ میں ظاہر و باطن اور ہر سختی و مصیبت میں تمہارا ساتھ دوں گا بشرطیکہ تم بھی میرے ساتھ اسی طرح کار بند رہو گے۔ جسکے ساتھ میں جنگ کروں تم بھی اس سے جنگ کرو اور جس سے میں صلح کروں تم بھی اس سے صلح کرو۔ مسجد سے تمام اطراف سے ہم نے سنا اور قبول کیا کی صدائیں بلند ہوئیں۔" (تاریخ اعثم کوفی ص: ۱۹۴)

اس خطبہ کی بابت مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ (ترجمہ)

"ہم حزب اللہ ہیں جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ انّ حزبُ اللہ ھُم المفلحون اور ہم رسول مقبولؐ کی عترت طیبہ اور اہلبیت طاہرہ ہیں۔ اور آنحضرتؐ نے جو دو عظیم چیزیں امت میں چھوڑی ہیں

[1] تاریخ اعثم کوفی ص: ۱۹۳

ان میں سے ایک ہم ہیں اور ایک قرآن مجید جس میں ہر شے کی تفصیل ہے اور ہم وہ ہیں جو قرآن مجید کی تاویل میں خطا نہیں کرتے بلکہ اس کے حقائق کو عین الیقین سے دیکھتے ہیں پس تم لوگ ہماری اطاعت کرو جو تم پر فرض ہے۔ کیونکہ ہماری اطاعت خدا و رسول کی اطاعت کے ساتھ مقرون فرمائی گئی ہے۔" (حوالہ تاریخ احمدی ص: ۲۲۳)

دوسری جانب امیر شام جو عالم اسلام پر حکمرانی کے متمنی تھے اور جنہوں نے اپنی اس خواہش کی تکمیل کیلئے جنگ بھی کی مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حیات مبارکہ میں ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ البتہ آپؑ کی شہادت کے بعد حالات امیر شام کی موافقت میں ہو گئے۔ چونکہ حضرت امام حسنؑ بڑے نرم خو، متحمل مزاج، صلح جو اور امن پسند تھے۔ لہٰذا بیعت ہو جانے کے بعد آپ نے سکوت فرمایا۔ مگر جب شامی فوج عبیداللہ بن عامر کی قیادت میں عین التمر ہوتی ہوئی مدائن کی طرف بڑھی تب آپ نے قیس بن سعد انصاری کو بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلے کیلئے روانہ کیا اور خود بھی روانہ ہوئے۔ ابو حنیفہ الدینوری کا بیان ہے کہ آپ مدائن سے کچھ فاصلہ پر مقام ساباط تک پہنچے تو آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے فوجی کمزوری دکھا رہے ہیں لہٰذا آپ وہیں رک گئے اور فوج کو مخاطب کر کے فرمایا!

"لوگو! میں کسی مسلمان کی جانب سے اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور تم کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں جس نظر سے اپنی ذات کو دیکھتا ہوں، میں تم لوگوں کے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ اسے مسترد نہ کرو گے، جس اتحاد و یکجہتی کو تم ناپسند کرتے ہو، وہ اس اختلاف اور تفرقہ سے افضل ہے جسے تم چاہتے ہو، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر لوگ جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہیں اور کمزوری دکھا رہے ہیں۔ اس لئے میں تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف مجبور کرنا نہیں چاہتا۔" (الاخبار الطوال ص: ۲۳۳)

آپ کی فوج میں شامل خارجیوں کی ایک جماعت نے کہا کہ "حسنؑ بھی اپنے باپ کی طرح کافر ہو گیا ہے" ان میں سے کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر دیا۔ ربیعہ و ہمدان کے لوگوں نے دوڑ کر خارجیوں سے آپ کی مدافعت کی۔ آپ دل برداشتہ ہوئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک خارجی جراح بن قبیصہ (شعبی نے اس کا نام سنان بن جرح اسدی لکھا ہے) نے جو آپ کی تاک میں چھپا ہوا تھا حملہ کر دیا۔ آپ کی ران میں زخم آیا۔ آپ کے ہمراہیوں نے خارجی کو پکڑ کر قتل کر دیا اور حسنؑ بن علیؑ نے مدائن پہنچ کر قیام فرمایا یہاں تک کہ آپ کا زخم بھر گیا۔ تب آپ دوبارہ شامیوں کے مقابلے کیلئے گئے جو عبید اللہ بن عامر کی سربراہی میں مدائن کے قریب جمع تھے۔ اس دوران امیر شام بھی فوجیں لیکر انبارہ پہنچ گئے جہاں قیس بن سعد انصاری پہلے سے موجود تھے۔ اسطرح حضرت امام حسنؑ عبیدہ کے مقابل اور قیس، امیر شام معاویہ بن ابو سفیان کے مدمقابل تھے۔

صلح حسنؑ: اس میں شک نہیں کہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ انکی فوج کا ایک مخصوص گروہ وہی کاروائیاں کر رہا تھا جو صفین کی جنگ میں کی گئی تھیں لیکن آپ کی فوج کا بڑا حصہ آپ کیلئے کٹنے مرنے پر تیار تھا۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ خود حضرت حسنؑ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ عرب کے سردار میرے قبضہ میں تھے۔ جس سے میں صلح کرتا اس سے وہ صلح کرتے اور جس میں جنگ کرتا اس سے وہ جنگ کرتے۔[1] لیکن آپ مسلمانوں کے خون کی قیمت پر خلافت خریدنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا آپ صلح پر آمادہ ہوئے۔ امیر شام پہلے ہی سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پیغام کیساتھ آپ کو بھیج چکے تھے کہ "آپ جن شرائط کو منظور کریں میں انہی

[1] مستدرک حاکم ص: ۱۷۰ ج: ۳

شرائط پر صلح کرنے کیلئے تیار ہوں" صورتحال کے ہر پہلو کا جائزہ لینے کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے حالات سے آگاہ کیا اور رائے طلب کی۔ سب نے صلح پر اتفاق کیا۔ لہٰذا آپ نے شرائط مرتب کر کے امیر شام کے پاس بھیج دیں۔ جملہ مورخین نے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ جو شرائط بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱) یہ کہ معاویہ بن ابوسفیان حکومت اسلام میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کریں گے۔
۲) یہ کہ معاویہ بن ابوسفیان اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے بلکہ ان کے بعد حسن بن علی خلیفہ ہونگے۔
۳) یہ کہ تمام مسلمانوں کے لیے ہر طرح کا امن ہوگا۔
۴) یہ کہ جہاں جہاں شیعان علی آباد ہیں ان کی عزت و آبرو، جان و مال اور اولاد ہر چیز کو تحفظ ہوگا۔
۵) یہ کہ حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ و دیگر بنو ہاشم کا امیر شام پورا پورا احترام کریں گے۔ اور پوشیدہ یا اعلانیہ کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔
۶) یہ کہ حضرت علیؑ کی شان میں نازیبا کلمات ترک کر دیے جائیں گے اور ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ کی جائیگی۔

امیر شام نے بلا تامل تمام شرائط منظور کر لیں اور بتاریخ ۱۵ ربیع الاول ۴۱ھ کو کوفہ کے قریب مقام انبار میں فریقین جمع ہوئے اور صلح نامہ کی باضابطہ تکمیل ہوئی۔ جس کے بعد فریقین کی فوجیں واپس ہوئیں۔[1]

[1] صلح نامہ سے متعلق جملہ واقعات الاخبار الطوال ص: ۲۳۱ - ۲۳۰ پر تحریر ہیں

حضرت امام حسنؑ اور امیر شام کے درمیان صلح تو ہو گئی' صلح نامہ پر فریقین کے دستخط اور گواہیاں بھی ہو گئیں' طرفین کی فوجیں بھی واپس چلی گئیں اور مملکت اسلامیہ میں معاویہ بن ابو سفیان کی حکمرانی کو تسلیم بھی کر لیا گیا لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ صلح نامہ کی شرائط پر کس حد تک عملدرآمد ہوا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد حکمرانوں نے اس صلح نامہ کو جس طرح تھو تاڑ کیا اس کی تفصیل جملہ کتب تواریخ میں مرقوم ہے۔

ہر جنگ کا اختتام فتح و شکست یا صلح پر ہوتا ہے۔ فتح و شکست کی صورت میں تو جنگ کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن صلح کی صورت میں جنگ ختم نہیں ہوتی بلکہ کچھ عرصہ کیلئے موقوف ہو جاتی ہے اور فریقین کے درمیان چند شرائط پر معاہدہ ہو جاتا ہے لیکن جلد ہی کوئی ایک فریق معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کے نتیجہ میں دوبارہ جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ صلح دو جنگوں کے درمیان وقفہ ہوتی ہے اور ہر صلح نئی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ صلح حدیبیہ ہو یا صلح حسنؑ۔ کربلا میں ہونے والی جنگ صلح حسنؑ کا لازمی نتیجہ تھی۔

صلح حسنؑ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ خلافت اور ملوکیت کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ " خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی اور اس کے بعد کٹ کھنی بادشاہت آجائے گی" یہ تیس سالہ مدت ربیع الاول ۴۱ھ میں ختم ہوئی جب کہ حضرت امام حسنؑ خلافت سے دستبردار ہوئے[۱]۔ اس کے بعد معاویہ بن ابو سفیان پہلے بادشاہ بنے۔ جیسا کہ ایک بار انہوں نے خود بھی کہا تھا "انا اول الملوک"[۲] ترجمہ: "میں مسلمانوں کا پہلا بادشاہ ہوں" اس کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ

[۱] البدایہ ص: ۱۶ ج: ۸ [۲] استیعاب ص: ۲۵۴ ج: ۱، خلافت و ملوکیت ص: ۱۳۸

مودودی صاحب نے ابن اثیر کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ

""حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی ریاست کے انتقال کو عبوری مرحلہ تھا۔ بصیرت رکھنے والے لوگ اسی مرحلہ میں سمجھ گئے کہ اب ہمیں بادشاہی سے سابقہ درپیش ہے چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جب حضرت معاویہؓ کی بیعت ہو جانے کے بعد ان سے ملے تو السلام علیک ایھا الملک کہہ کر خطاب کیا۔ حضرت معاویہؓ نے کہا اگر آپ امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا؟ انہوں نے جواب دیا: "خدا کی قسم جس طرح آپ کو یہ حکومت ملی ہے اس طریقہ سے اگر یہ مجھے مل رہی ہوتی تو میں اس کا لینا ہرگز پسند نہ کرتا""

(ابن اثیر ص: ۲۰۵ ج: ۳ حوالہ خلافت و ملوکیت ص: ۱۴۷)

خلافت راشدہ کے آخری خلیفہ حضرت امام حسنؑ تھے۔ آپؑ کی مدتِ خلافت جس قدر قلیل ہے اسی قدر جلیل ہے لیکن تاریخ میں اس کو وہ اہمیت نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی جلیل القدر شخصیت نے اس زمانہ کی سیاست کے پردے کو چاک کر دیا۔

تجزیۂ صلح حسنؑ: اگر تحقیق و بصیرت کی نگاہ سے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جن نامساعد حالات سے حضرت امام حسنؑ دوچار تھے ان میں اگر آپ صلح نہ فرماتے تو شہادت حسینؑ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا اور افق اسلام پر ہمیشہ کیلئے وہی منحوس گھٹائیں چھائی رہتیں جن کو فرو کرنے کیلئے ظلیلِ کربلا نے مہتم بالشان قربانی پیش کی۔ صلح حسنؑ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کیلئے اس وقت کے سیاسی حالات، عوامی نفسیات اور مخالفین کے اقدامات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ تو تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ صفین کی جنگ اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد جب حضرت امام حسنؑ سریر آرائے تخت

خلافت ہوئے تو مملکت اسلامیہ کے سیاسی حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔ ویسے بھی دنیا کا دستور ہے کہ جب حکومت تبدیل ہوتی ہے تو تخریبی عناصر اور مخالفین سلطنت اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ امیر شام جو پہلے ہی سے برسرپیکار اور درپۓ آزار تھے موقعہ سے فائدہ اٹھانے کیلئے اپنی تمام تر ریشہ دانیوں کے ساتھ میدان عمل میں مزید سرگرم ہو گئے۔ چونکہ بنو ہاشم سے اعلانیہ جنگ میں کامیاب نہ ہو سکنے کا تجربہ تو بنو امیہ ماضی میں کئی بار کر چکے تھے اور صفین کے میدان میں امیر شام نے خود بھی آزمایا تھا۔ لہذا جنگ کے میدان میں دوبدو لڑنے کے بجائے مکرو فریب، دھوکہ و دغا سے کام نکالنے پر پوری توجہ مرکوز کر دی گئی۔ کچھ تو وہ زر خرید کارندے جو صفین کے موقعہ پر بھیجے گئے تھے اب بھی اپنا کام کر رہے تھے کچھ مزید جاسوس غلط خبریں اور حوصلہ شکن افواہیں پھیلانے پر مامور کئے گئے جن کے پروپیگنڈے نے بھرپور اثر دکھایا ساتھ ہی امیر شام نے لشکر کشی کر دی۔

حضرت امام حسنؑ نے قیس بن سعد کو بارہ ہزار کا لشکر دیکر شامی حملہ آوروں کو روکنے کیلئے بھیجا تو امیر شام نے ایک طرف قیس کو خط لکھا کہ حسنؑ بن علیؑ مجھ سے صلح کی بات چیت کر رہے ہیں تم کس کیلئے جان دے رہے ہو۔ دوسری طرف امام حسنؑ کو خط ارسال کیا کہ قیس نے مجھ سے صلح کر لی ہے اور میرے وہاں پہنچنے پر لشکر سمیت مجھ سے مل جانے کا وعدہ کر چکا ہے۔ آپؑ کن سورماؤں کے بل بوتے پر مجھ سے نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں۔ امیر شام نے اسی قسم کے خطوط گورنروں اور نامور قبائل کے سرداروں کو بھی ارسال کئے اور اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کیلئے انعام و اکرام، منصب و جاگیر عطا کرنے کے وعدے کئے۔ حضرت امام حسنؑ کی فوج میں جاسوسوں کے ذریعہ نقد رقوم تقسیم کرا کے فوجیوں کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ مثلاً حکم کندی

کو امام نے چار ہزار کا رسالہ دیکر انبار بھیجا تھا جسے امیر شام نے رقم دیکر خرید لیا۔ اسی طرح قبیلۂ بنی مراد کا ایک شخص رشوت کے لالچ میں پھنس گیا۔ اس کے علاوہ کوفہ والوں کو توڑنے کیلئے جنگِ صفین کے وقت ہی سے امیر شام کے کارندے سرگرم عمل تھے جو حضرت علیؑ کی زندگی میں تو کامیاب نہ ہو سکے البتہ اب انہیں کچھ کامیابی ہوئی۔ اس طرح ایک طرف تو امیر شام کا فتنہ کالم ہمہ وقت مصروف تھا تو دوسری طرف خوارج و منافق حضرت امام حسنؑ کی جان لینے پر آمادہ تھے۔

ان حالات میں آپ خود غور فرمائیں کہ حضرت امام حسنؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا جنگ کی صورت میں امام کو فتح کی کچھ بھی امید ہو سکتی تھی؟ اور کیا اس جنگ میں امامؑ کا شکست کھانا اور قتل کر دیا جانا قطعاً یقینی نہ تھا؟ اور پھر غور کیجئے ایسی جنگ کے بعد تاریخ کیا فیصلہ لکھتی؟ یہی نا کہ تختِ خلافت کیلئے دو بادشاہ آپس میں نبرد آزما ہوئے ان میں سے ایک بادشاہ حسن بن علی قتل کر دیئے گئے اور دوسرے بادشاہ معاویہ بن ابو سفیان کو فتح حاصل ہوئی غور کیجئے کیا یہ نتیجہ بنو ہاشم اور آلِ محمدؐ کی روش، ان کے موقف، ان کے زاویہ نگاہ، ان کے لائحہ عمل اور ان کے بنیادی نظریات کے سراسر منافی نہ ہوتا۔ اور کیا اس نتیجہ میں وہ بنیادی اصول پاش پاش نہ ہو جاتا جس کے استحکام اور آبیاری کی خاطر پیغمبر ختمی مرتبتؐ اور علی مرتضیٰؑ نے اپنی پوری زندگیاں صرف کر دی تھیں۔ وہ لوگ یقیناً امام حسنؑ پر ظلم کرتے ہیں جو آپ کی سیاسی بے بسی و بے چارگی کو صلح کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی کی سیاسی بے بسی صلح کی وجہ قرار پا سکتی ہے تو حضرت امام حسینؑ کربلا میں حضرت امام حسنؑ سے کہیں زیادہ بے بس اور مجبور تھے۔ لہٰذا صلح حسنؑ کی صحیح علت ان کی بے بسی، مجبوری و بے چارگی ہرگز نہ تھی۔ بلکہ وہ نتیجہ تھا جو ایسی صورت میں جنگ کرنے سے پیدا ہوتا اور جس سے بنو ہاشم

اور بنو امیہ دور اول کے سیاسی حریف بن کر رہ جاتے۔ اور پھر امیر شام فاتح کی حیثیت سے امام حسنؑ کے تمام اعزاء و اقرباء کو بھی تہہ تیغ کر دیتے تو کوئی نہ تھا جو ان کا ہاتھ روک سکتا کیونکہ سیاسی جنگوں میں فاتح اپنے تمام مخالفین کو ہمیشہ کیلئے راستہ سے ہٹا دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ امیر شام بھی فتح پانے کے بعد یقیناً امام حسینؑ، امام زین العابدینؑ، محمد حنیفہؒ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن جعفرؓ اور بنو ہاشم کے دیگر سربرآوردہ افراد کو چن چن کر قتل کروا دیتے۔ نیز آئندہ چل کر اسی آڑ میں حکومت وقت خاندان بنو ہاشم کا یونہی صفایا کرتی چلی جاتی۔ اور یہ قتل عام قربان گاہ اقتدار کی بھینٹ کے سوا کچھ قرار نہ پاتا۔

اس پورے پس منظر میں بھرپور جائزہ لے کر آپ خود غور فرمائیں کہ اس جنگ کے تفصیلی نتائج کتنے بھیانک اور ہولناک ہوتے جس جنگ سے باز رہنے پر بعض کوتاہ نظر امام حسنؑ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور انہیں نعوذ باللہ من ذالک بزدل اور پست ہمت کہتے ہیں۔ درآنحالیکہ حق و انصاف کی بات تو یہ ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے اس موقعہ پر جنگ کے بجائے صلح کو اپنا کر قیامت تک کیلئے نہ صرف آل محمد کو طلب اقتدار اور حب جاہ کے الزام سے منزا کر دیا بلکہ شیعیان اہلبیت اور بنو ہاشم کی بقاء و حیات کی ضمانت بھی حاصل کر لی اور یہی نہیں بلکہ آپؑ نے تخت و تاج کو ٹھکرا کر بنو امیہ کی جعل سازی اور فریب کاری کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تشت ازبام کر دیا۔ حضرت امام حسنؑ خوب جانتے تھے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ یا آل محمد اور آل ابو سفیان کا یہ تصادم سطحی اور سیاسی نہ تھا بلکہ بنیادی اور اصولی تھا۔ یہ ٹکراؤ حق و باطل اور دین و دنیا کا ٹکراؤ تھا۔ بنو امیہ اسلام کی نشو و ارتقاء کو ہر ممکن طریقہ سے روکنے پر تلے ہوئے تھے لیکن اس تصادم اور ٹکراؤ پر حصول سلطنت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ حضرت امام حسنؑ

نے صلح کر کے اور حکومت و سلطنت سے کنارہ کش ہو کر دفعتاً یہ پردے چاک کر ڈالے۔

صلح حسنؑ کے واقعہ کو گزرے ابھی پورے بیس برس بھی نہ ہونے پائے تھے کہ دنیا پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آل ابو سفیان کو محمدؐ کی آل کا سکون و سکوت سے زندہ رہنا بھی گوارہ نہ تھا۔ اگر کوئی یہ فرض کر بھی لے کہ حضرت امام حسنؑ تخت و حکومت کیلئے امیر شام سے برسرپیکار تھے تو کوئی یہ بتائے کہ ۶۱ھ میں حضرت امام حسینؑ نے یزید سے تخت و حکومت کا کب مطالبہ کیا تھا؟ وہ تو اپنے مقام پر خاموش زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی طرف سے کون سی ابتداء ہوئی اور وہ کونسی اشتعال انگیزی تھی جس کے جواب میں ان سے کہا جا رہا تھا کہ "یا بیعت کرو یا موت کیلئے تیار ہو جاؤ" حضرت امام حسینؑ کا میدان کربلا میں یہ اعلان رہتی دنیا تک یادگار رہے گا کہ "اے عمر سعد! اگر تجھے میرا اس مملکت میں رہنا بھی گوارہ نہیں تو میں اس پر راضی ہوں کہ بچوں کو لیکر تمہاری حدود سے باہر کسی دور دراز ملک نکل جاؤں" لیکن بنو امیہ کی خون آشام تلواریں آپؑ کے خون ناحق سے پیاس بجھانے کیلئے بے تاب تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ آل محمدؐ کو کسی صورت بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے خواہ وہ تخت و تاج کے دعویدار ہوں یا نہ ہوں، وہ کسی دنیاوی منصب و اعزاز کے آرزومند ہوں یا نہ ہوں۔ اب غور فرمائیے کہ امام حسنؑ اس وقت جنگ میں الجھ جاتے تو قیامت تک آل محمدؐ کا تصادم اسی جنگ کا تسلسل قرار پاتا۔ اور شاید یہ راز کبھی نہ کھلتا کہ دنیا آل محمدؐ کی دشمن نہ تھی بلکہ آل محمدؐ کے مشن، ان کے اصول اور ان کے نقطہ نظر کی دشمن تھی۔ اور آل ابو سفیان کا مقصد آل محمدؐ کے پردہ میں دراصل اسلام کی بیخ کنی کرنا اور نظریات اسلام کی جڑیں کاٹنا تھا۔

حضرت امام حسنؑ تخت و خلافت پر بیٹھ چکے تھے اگر وہ جنگ کرتے تو یہ جنگ لامحالہ اقتدار ہی کی جنگ قرار پاتی۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسینؑ کا اس مسند سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے ان کی جنگ خالص اصولی جنگ تھی اور طلب حکومت کا الزام ان پر عائد نہیں ہو سکتا یہی نہیں اگر حضرت امام حسنؑ جنگ میں الجھ جاتے تو آپ سے لے کر حضرت قائم آل محمد عجل اللہ تعالیٰ تک پورے سلسلہ کا باطل سے تصادم اسی اقتدار کی جنگ کی کڑیاں تصور کی جاتیں۔ امام حسنؑ نے امیر شام سے صلح کر کے اس سلسلہ کو وہیں کاٹ دیا۔ اور اس طرح نہ صرف امام حسینؑ کی جنگ کو اصولی جنگ کہلوانے کا موقع بخشا بلکہ آئندہ آنے والے سلسلہ معصومین کے بنو امیہ اور بنو عباس سے ہونے والے ٹکراؤ کو اسی اصولی اور روحانی جنگ کی زنجیر میں منڈھ دیا۔

اس پوری تصویر کو سامنے رکھ کر اور تعصب و عناد کی عینک اتار کر حالات کا دیانتدارانہ جائزہ لیں تو کیا یہ سوال خود بخود حل نہیں ہو جاتا کہ کیوں امیر المومنین حضرت علیؑ اور سید الشہداء حضرت امام حسینؑ نے طاغوتی قوتوں سے جنگ کی اور کیوں ان دو عہدوں کے درمیان حضرت امام حسنؑ نے صلح کو اپنایا؟ اور پھر کیا یہ تینوں عہد فی الحقیقت ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں نظر نہیں آتیں اور کیا اس صلح و جنگ کے پردہ کے پیچھے ایک ہی لائحہ عمل اور ایک ہی مکتب خیال کا یکساں بہاؤ صاف دکھائی نہیں دیتا؟ امیر المومنین نے جنگ کی اس لئے کہ انہیں دشمن کے مقابلہ میں فتح کا یقین تھا۔ امام حسینؑ نے جنگ کی اسلئے کہ یہاں تخت و تاج کا کوئی دعویٰ نہ تھا۔ رہے امام حسنؑ تو ان کے حالات ان دونوں بزرگواروں کے حالات سے قطعاً مختلف تھے۔ نہ انہیں حضرت علیؑ کی طرح غلبہ حاصل تھا اور نہ ہی حضرت امام حسینؑ کی طرح دعویٰ سلطنت سے لاتعلقی حاصل تھی۔ لہٰذا حضرت امام حسنؑ کی صلح حق کی فتح اور دین کی سربلندی کا باعث بنی۔

عام طور پر لوگ جنگ کی نسبت صلح کو سبک اور آسان سمجھتے ہیں حالانکہ صلح کی منزل امام حسنؑ کیلئے کہیں زیادہ مشکل اور دشوار گزار تھی۔ امام حسینؑ کا امتحان یقیناً مشکل اور سخت ترین مشکل تھا۔ لیکن یہ ساری مشکل تین پہر کی مشکل تھی۔ صبح جنگ شروع ہوئی اور عصر تک تمام ہو گئی۔ جب کہ حضرت امام حسنؑ کی آزمائش جو صلح کے بعد دس سال تک جاری رہی انتہائی کٹھن تھی۔ آپؑ اور آپ کے ناموس ہدف طعن و تشنیع بنے رہے۔ آپؑ کے ہمدرد و مددگار عقوبت میں گرفتار کئے جاتے رہے۔ آل محمدؐ کا دم بھرنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جاتا رہا۔ امامؑ کو وقتاً فوقتاً دربار جبروت میں حاضر ہونا پڑتا جہاں آپؑ کی تذلیل کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا۔ جس مجلس میں امامؑ موجود ہوتے وہاں منصب امامت اور عہد مرتضویؑ پر رکیک حملے کئے جاتے۔ مسجدوں اور ممبروں سے آپؑ کے پدر بزرگوار پر سب ہوتی رہتی لیکن امام تھے کہ کوہ صبر و شکر و استقامت بنے ہوئے یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ یہ تھی صلح کی وہ صبر آزما وادی جس میں امام حسنؑ کو پورے دس برس چلنا پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مواقع آ جاتے ہیں جہاں جذبات اسے دشمن سے ٹکرا کر جان پر کھیل جانے کیلئے ابھارتے ہیں۔ جبکہ احساس فرض اسے خاموش رہنے اور دست و پا توڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی موقع ہوتا ہے جب اس انسان کی معراج کمال اور جوہر انسانیت کی ارتقائی منازل کو پرکھا جاتا ہے اور انکی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک موقع پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ میں اس وقت آیا جب آپ ۶ھ میں زیارت بیت اللہ کیلئے مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے تو کفار مکہ نے آپ کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس وقت اگر رسالتمآبؐ چاہتے تو اپنے ہزاروں جانثاروں کو جہاد کا حکم دیکر بزور شمشیر مکہ میں داخل ہو سکتے

تھے لیکن بقائے دین اور احساسِ فرض کو ترجیح دی اور حدیبیہ کے مقام پر اس عہد نامہ پر دستخط کرتے ہوئے دی جسے اُس وقت بھی لوگ ہتک آمیز سمجھتے تھے اور آج بھی بعض کوتاہ بین اسے غیر منصفانہ تصور کرتے ہیں۔ طاقت ہونے کے باوجود رسلتمآب کعبہ کی زیارت کئے بغیر واپس لوٹ گئے۔ ایسا ہی ایک موقع امیر المومنین حضرت علیؑ کی زندگی میں اُس وقت آیا جب آپؑ مفارقتِ رسلتمآبؐ کا زخم کھائے ہوئے ان کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے کہ اچانک خبر آئی کہ اصحاب کے ایک گروہ نے سقیفہ بنو ساعدہ میں حکومت و خلافت اپنے لئے طے کرلی۔ آپؑ کے غم و غصہ کا کیا عالم تھا لیکن جوشِ جذبات کے باوجود آپؑ کی اس فیصلہ پر خاموشی ضمیر کی کونسی مجبوریوں کی آئنہ دار تھی یہ نہج البلاغہ کے خطبۂ شقشقیہ میں دیکھنے کے قابل ہے۔

مفادِ اسلام، احساسِ فرض اور خیر و نفس کشی کی یہی وہ منزل تھی جو امام حسنؑ کو ان صبر آزما اور روح فرسا حالات میں خاموش رہنے پر مجبور کررہی تھی ورنہ جان دینا اور قربان گاہِ شہادت میں سر کی بازی لگا دینا تو خاندانِ بنو ہاشم کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کیلئے بھی ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

بہر حال سیاسی، اصولی اور دینی حالات کی اس صورتحال میں حضرت امام حسنؑ کے سامنے صرف اور صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آپؑ امیر شام کی پیشکش کو قبول فرما کر اپنی شرائط پر ان سے صلح کرلیں۔ اب کیسے ماتم نہ کیا جائے ان لوگوں کی فہم و ادراک پر اور ان کے جذبۂ دیانت و حق گوئی پر جو سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی صلح حسنؑ پر نکتہ چینی کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

جہاں تک امیر شام کا شرائط معاہدہ پر عمل درآمد کا تعلق ہے تو اس کی بابت تاریخ گواہ ہے کہ عنانِ حکومت سنبھالتے امیر شام کوفہ میں داخل ہوئے اور جمعہ کے خطبہ کے بعد اس طرح خطاب فرمایا۔

"مسلمانو! میں تمہارے اوپر حکومت و اقتدار چاہتا تھا صلح حسنؑ کے بعد میرا یہ مقصد پورا ہو گیا۔ اب وہ شرائط اور معاہدے جو میں نے حسنؑ سے کئے ہیں وہ میرے پیروں کے نیچے ہیں۔ ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں ہے۔"

لوگ یہ کلمات سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اس کے بعد جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں بھی اسی قسم کی تقریر فرمائی۔

"خدا! میں تمہاری حکومت کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے برسر اقتدار آنے سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے خوب جانتا ہوں، مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے تم کو مغلوب کر کے اسے لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اب اگر تم یہ دیکھو کہ میں تمہارا حق پورا پورا ادا نہیں کررہا ہوں تو تھوڑے پر مجھ سے راضی رہو"

(خلافت و ملوکیت ص:۱۵۹)

جسٹس امیر علی نے امیر شام کی بابت تحریر کیا ہے کہ

"Upon the abduction of Hasan, Muawaiyah become the de fecto rular of Islam..... The seat of government, which Ali had fixed at Kufa, was now removed to Demascus, where Muawiyah surrounded himself with the pomp and pageantry of the Persion and Byzantine monarchs."(A Short History of the Saracens P.71)

ترجمہ : حضرت امام حسنؑ سے اقتدار چھیانے کے بعد معاویہ مملکت اسلامی کے ناقص حکمران بن گئے۔۔۔۔ اور حضرت علیؑ کے کوفہ میں مقرر کردہ حکومتی مرکز کو وہاں سے ہٹا کر دمشق لے گئے جہاں وہ ایرانی اور بازنطینی بادشاہوں کی طرح بڑے طمطراق اور شان شوکت سے رہنے لگے۔

شہادت : الغرض اس خاتم المحن و ستمبرادی کے بعد حضرت امام حسنؑ کوفہ سے مدینہ منتقل ہو گئے اور بقیہ تمام زندگی جوارِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں گزار دی۔ جہاں آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تبلیغ دین حق کی ذمہ داریاں اپنے دستر خوان کے ذریعہ انجام دیتے رہے۔ حضرت امام حسنؑ کی اسی سیرت کی یاد میں آج بھی ہمارے گھروں میں آپؑ کے دستر خوان سجائے جاتے ہیں اور آپؑ کی سخاوت اور مہمان نوازی سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ آپ مدینہ میں انتہائی خاموش زندگی گذار رہے تھے پھر بھی حکمران خائف تھے اور آپکو راستے سے ہٹانے کیلئے کوشاں تھے اور بقول جمال الدین محدث یہ حکمران آرزو مند تھے کہ "کسی طرح امام حسنؑ کے وجود ذی جود سے میدان مقصود خالی ہو جائے۔"[1]

حضرت امام حسنؑ کی شہادت کی بابت ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ "امام حسنؑ کو ان کی بی بی جعدہ بنت اشعث نے زہر دے دیا اور محققین کے ایک گروہ کا قول ہے کہ معاویہ نے جعدہ سے خفیہ سازش کر کے امام حسنؑ کو زہر دلوایا۔"[2] مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی شہادت اس زہر سے ہوئی جو آپکی زوجہ جعدہ بنت اشعث نے دیا تھا۔ آپ نے ۲۸ صفر ۵۰ھ کو شہادت پائی بنو ہاشم نے آپؑ کی میت کو غسل و کفن دیا۔ حضرت امام حسینؑ نے بھائی کی خواہش کے مطابق ان کے جسدِ خاکی کو اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پہلو میں دفن کرنا چاہا تو عین تدفین کے وقت مروان بن حکم کی سرکردگی میں بنو امیہ اور ان کے حواریوں کی ایک جماعت وہاں پہنچ کر مذاحمت پر آمادہ ہوئی بنو ہاشم نے بھی ہتھیار سنبھال لئے جس کے باعث جدال و قتال کی صورتحال پیدا ہو گئی۔ موقعہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حضرت امام حسینؑ نے لوگوں کو

[1] روضۃ الاحباب بحوالہ تاریخ احمدی ص:۲۲۶ [2] ایضاً

صبر کی تلقین فرمائی اور فساد کو رفع کرنے کیلئے بھائی کی میت کو جنت البقیع میں اپنی مادرِ گرامی حضرت فاطمہ الزہرہ سلام اللہ علیہا کے پہلو میں دفن کر دیا۔

شاہ معین الدین احمد ندوی نے وفاتِ حسنؑ کی بابت تحریر کیا ہے کہ۔

"حضرت حسنؓ اپنے خلقِ عظیم کی بنا پر اتنے محبوب و مقبول تھے کہ ان کی وفات پر سارے مدینہ میں صفِ ماتم بچھ گئی، بازار بند ہو گئے، گلیوں میں سناٹا چھا گیا، بنی ہاشم کی عورتوں نے ایک مہینہ تک سوگ منایا، حضرت ابو ہریرہ مسجدِ نبویؐ میں فریاد و فغاں کرتے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے کہ لوگو! آج خوب رو لو، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا محبوب دنیا سے اٹھ گیا" (تاریخ اسلام ص: ۳۸۸ ج:۱)

جعدہ بنت اشعث : حضرت امام حسنؑ کی زوجہ جعدہ کا باپ اشعث قبیلہ کندہ کے ایک شخص قیس اشج کا بیٹا تھا جو یمن کا رہنے والا تھا۔ اشعث کے دو بیٹے محمد اور قیس تھے۔ جعدہ کی ماں ام فروہ بنتِ ابی قحافہ تھی جو حضرت ابو بکرؓ کی حقیقی بہن تھی۔ اس رشتہ سے جعدہ اور حضرت عائشہؓ ماموں پھوپھی کی بیٹیاں تھیں۔ جعدہ کے باپ اشعث کا اصل نام محمد کرب تھا لیکن چونکہ وہ پراگندہ مو اور ژولیدہ سر رہتا تھا اس لئے لوگوں نے اس کا نام اشعث یعنی بکھرے بالوں والا رکھ دیا تھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ اشعث حضرت عثمانؓ کے عہد میں آذربائیجان کا عامل تھا جسے حضرت علیؑ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں بحال رکھا۔ ابتداء میں یہ حضرت علیؑ کا حامی اور جنگِ صفین میں آپؑ کے دو مشہور جرنلوں میں سے ایک تھا۔ صفین کے میدان میں ابتدا اس نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے لیکن بعد میں امیر شام سے سازباز کر لیا اور رشوت لے کر ان کا آلۂ کار بن گیا یہی وجہ تھی کہ آخری دس روزہ معرکۃ الآرا جنگ میں اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ بڑی بے دلی کا مظاہرہ کیا۔ جنگ بندی کرنے اور تحکیم قبول کرنے پر دباؤ ڈالنے والوں میں یہی اشعث پیش پیش تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا

تھا کہ شامیوں کی شکست چند لمحوں کی بات ہے۔ امیر شام کے اشارے پر ابو موسیٰ اشعری کو حکم مقرر کرانے کیلئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔ واقعہ تحکیم کے دوران مسلمانوں کا جو گروہ خارج ہوا اس کا سربراہ یہی اشعث تھا۔ ابو الفداء کا کہنا ہے کہ "اشعث بن قیس وھو من اکبر الخوارج" (اشعث بن قیس جو اکابر خوارج میں تھا۔) علامہ مجلسی نے بحار میں تحریر کیا ہے کہ "یہی اشعث تھا جو حضرت علیؑ کے قتل میں شریک تھا اور ابن ملجم کا صلاح کار و مددگار تھا۔"

اسی اشعث کا بیٹا اور جعدہ کا بھائی محمد تھا جس نے حضرت مسلم کو طوعہ کے گھر کا محاصرہ کر کے زخمی حالت میں پکڑ کر ابن سعد کے پاس بھیجا تھا۔ ابن اثیر کے بیان کے مطابق اسی اشعث کے دوسرے بیٹے قیس نے میدان کربلا میں تیر و اصحاب حسینؑ کے سر قلم کئے تھے اور یہی وہ اشعث تھا جس کی بیٹی جعدہ نے فرزند رسولؐ حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔ گرچہ حضرت امام حسنؑ کو زہر دینے کے واقعہ کو امویوں اور ان کے حمایتیوں نے چھپانے کی بڑی کوشش کیں لیکن حق کو ظاہر ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

کثرت ازواج کا الزام : حضرت امام حسنؑ کی بابت مشہور کیا گیا ہے کہ آپ نے کثیر تعداد میں نکاح کئے اور طلاقیں دیں۔ اس افسانہ کی تشہیر میں مورخین اتنی شدت سے متحمک ہوئے کہ راویوں کی تضاد بیانی، حالات سے مطابقت، معاشرتی اصول و قوائد، مذہبی حدود و قیود، اقوال پیغمبرؐ و صحابہ کرامؓ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس فرد پر الزام تراشی کی جا رہی ہے اس کا ذاتی کردار و مصروفیات الغرض سب کچھ نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر ہم حکومت وقت کی کارگذاریوں، خوشامدیوں کی ریشہ دوانیوں اور اس وقت کے حالات کا تاریخ کے آئینہ میں جائزہ لیں تو یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان

حالات میں خاندان بنو ہاشم کے کسی بھی فرد پر کوئی بھی الزام بآسانی لگایا جاسکتا تھا لہٰذا اگر حضرت حسنؑ بن علیؑ پر کثرت سے نکاح کرنے اور طلاق دینے کا بہتان تراشا گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس سلسلہ میں چند روایتیں پیش ہیں۔

۱) علامہ شیرازی شافعی کے قول کے مطابق امام حسنؑ کی چونسٹھ بیویاں تھیں اور کنیزیں انکے علاوہ تھیں۔ پھر ایک اور مقام پر یہی علامہ صاحب اظہار خیال فرماتے ہیں کہ امام نے بہت سے عقد کئے کہا گیا ہے کہ ستر عقد کئے۔

۲) محمد ابن جمال مصری کا خیال ہے کہ امام نے نوے عقد کئے۔ (اسعاف الراغبین)

۳) ابو طالب مکی کا گمان ہے کہ امام نے دو سو پچاس یا تین سو نکاح کئے (قوت القلوب)

۴) علامہ سیوطی نے فرمایا امام کی سات سو آزاد عورتیں منکوحہ تھیں جبکہ ایک سو ساٹھ کنیزیں ان کے علاوہ تھیں۔ (اتحاف شافعی)

۵) محمد بن سیرین کی تحقیق ہے کہ امام نے صرف ایک عقد کیا ہاں کنیزیں ایک سو تھیں۔ (حلیۃ الاولیا)

چونکہ مذکورہ بیانات میں تضاد نمایاں ہے لہٰذا اصول روایت کے تحت ایسے تمام متضاد بیانات قابل رد ہیں نیز یہ کہ جن مورخین نے کثرت ازواج کا افسانہ بیان کیا ہے ان میں سے کسی ایک نے بھی ان ازواج کے نام یا ان کے قبائل کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام کی زندگی کو داغدار بنانے کیلئے یہ افسانہ گھڑا گیا۔

حضرت امام حسنؑ جیسی عابد و زاہد اور قائم اللیل و صائم النہار شخصیت پر کثرت سے نکاح کرنے اور طلاق دینے کا الزام لگا کر مخالفین نے یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ آپ معاذ اللہ عیش پرست اور رنگین مزاج تھے، الزام تراشی کرنے والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ جس ہستی

کی بابت اللہ کے رسولؐ نے سردار جوانان جنت ہونے کی بشارت دی ہو، جس کی تربیت وصی رسول اللہ نے کی ہو اور جسکے اوصاف و فضائل جملہ مورخین نے بیان کئے ہوں اس سے ایسے ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب کیونکر ممکن ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے نکاح و طلاق شرعی افعال ہیں جن کے حدود و قیود متعین ہیں۔ گو کہ اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے مگر انتہائی احتیاط کیساتھ، بلاجواز طلاق کو غیر مستحسن فعل قرار دیا ہے۔ حالت مجبوری اگر طلاق کی نوبت آجائے تو اسلام نے اسکے ضوابط مقرر کئے ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ نواسہ رسولؐ آئے دن نکاح کریں اور پھر بلاجواز طلاق دیدیں۔ اور یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو شخص راتیں نماز میں گذارے اور دن روزے سے بسر کرے، تبلیغ دین میں مشغول رہے، پچیس حج پاپیادہ کرے، غربا پروری و مہمانوازی میں مصروف ہو وہ کیونکر اتنی کثیر ازواج جن کی تعداد چونسٹھ سے سات سو تک بتائی جاتی ہے کو معاشی، معاشرتی و ازدواجی طور پر مطمئن و خوش رکھ سکتا ہے اور کیا اتنی کثیر ازواج کا خیام امام میں ہونا ممکن ہے؟ آیئے ان ممکنات پر نظر ڈالتے ہیں :

۱) اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امام کثرت سے نکاح کرتے تھے تو کیا آپ ان ازواج سے تعلقات زن و شو قائم رکھتے تھے؟ اگر یہ تعلقات نہیں تھے تو عقد کرنا بے معنی تھا۔ نیز یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ یہ ازواج بغیر ازدواجی تعلقات کے امام کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہوتیں اور یہ بھی ممکنات میں سے نہیں کہ یہ ازواج عابدہ و زاہدہ تھیں جو امام کی طرح شب و روز عبادت الٰہی میں مصروف رہتی ہوں۔ دوسری صورت میں اگر امام ان خواتین سے ازدواجی تعلقات رکھتے تھے تو سات سو ازواج اور ایک سو ساٹھ کنیزوں میں سے کتنی کے اولاد ہوئی۔ سب نہ سہی اگر آدھی ہی عورتوں کے

اولاد ہوئی ہوتی تو مدینہ و کوفہ میں ہر طرف آپ ہی کی اولاد نظر آتی اور جن کا ذکر تاریخ میں بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت امام حسنؑ کی ازواج کی تعداد ہرگز اتنی کثیر نہیں تھی جتنی مشہور کی گئی ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی ازواج کی کل تعداد نو (۹) تھی جن سے آپ کی اولاد کی تعداد زیادہ سے زیادہ اکیس تھی۔

۲) اگر ازواج امام کی بیان کردہ کثیر تعداد فرض کر لی جائے تو دیکھنا ہوگا کہ ان کی کفالت و معاش کا کیا انتظام تھا۔ ان کی خوراک و دیگر ضروریات کیلئے درکار کثیر رقم کہاں سے آتی تھی اور کیونکر خرچ ہوتی تھی۔ اس نکتہ پر کسی مورخ نے توجہ نہیں دی۔ کثیر ازواج کے افسانے کو تو ایک دوسرے سے نقل کرتے رہے لیکن ممکنات پر غور کرنیکی کسی نے بھی زحمت گوارہ نہ کی۔ اس مسئلہ کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب تمام مورخین حضرت امام حسنؑ کی سخاوت و فیاضی کا اعلانیہ اعتراف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ آپکے پاس جو کچھ ہوتا وہ غرباء و مساکین اور راہ خدا میں خرچ کر دیتے تھے ایسی صورت میں ان کثیر ازواج کی ضروریات کیونکر پوری ہوتی ہوں گی۔ نیز اسکا بھی امکان نظر نہیں آتا کہ یہ تمام عورتیں قانعہ و صابرہ ہوں گی۔ پھر کیونکر یہ ازواج امام کیساتھ زندگی بسر کر سکتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ امام کی کثیر ازواج کا افسانہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا۔

۳) اگر ازواج امام کی روایت کردہ تعداد کو مختلف اوقات میں بھی فرض کر لیا جائے تب بھی ان کی سکونت و رہائش ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ نیز امام نے ان کثیر ازواج کی باری کا کیا نظام مرتب کیا ہوگا اور ایک زوجہ کی باری کتنے عرصہ بعد آتی ہوگی۔ اس جانب کسی مورخ نے کوئی نشان دہی نہیں کی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ امام نے ان تمام ازواج کو بلا کسی عدل و انصاف کے ایک ہی مکان میں مقید کر رکھا ہو۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں کیونکہ اول تو

امام سے غیر عادلانہ فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ دوئم یہ کہ قبائل عرب کی وہ باعزت وباحمیت خواتین اس فعل کو کبھی برداشت نہ کرتیں اور نہ ہی ان کے میکے والے اس ظلم پر خاموش بیٹھتے۔ لہذا ثابت ہوا کہ ازواج امام کی وہ تعداد ہر گز نہ تھی جو روایات میں بیان کی گئی ہے۔

۴) یہ بھی مشہور کیا گیا کہ امام نکاح کرتے اور طلاق دیدیتے تھے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امام نکاح کے کچھ ہی دن بعد طلاق دیدیا کرتے تھے تو کیا طلاق دیتے وقت امام کے پاس عذر شرعی موجود ہوتا تھا اور کیا آپ ان ازواج کا حق مہر و دیگر حقوق ادا کرتے تھے۔ چونکہ اسلام نے جس طرح نکاح کے اصول بنائے اسی طرح طلاق کے قواعد وضوابط بھی مرتب کئے ہیں جن سے اس دور کا ہر مسلمان بخوبی واقف تھا۔ کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام کے طلاق دینے کی وجوہ کیا ہوتی تھی۔ اور یہ عورتیں طلاق حاصل کرنے کے بعد کیونکر خاموشی سے اپنے میکے لوٹ جاتی تھیں اور کیونکر ان کے میکے والے یعنی باپ بھائی وغیرہ ان عورتوں کو خوشی قبول کر لیتے تھے اور امام سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نکاح میں آنے والی عورتیں یہ جانتے ہوئے کہ آپ نکاح کے بعد طلاق دیدیتے ہیں آپ سے نکاح کرنے پر کیونکر آمادہ رہتی تھیں یا انکے باپ بھائی کیونکر امام کے عقد میں دینے پر رضامند رہتے تھے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی جواب نہیں۔ چونکہ بلاعذر شرعی طلاق دینا معیوب وغیر اسلامی فعل ہے جس کا ارتکاب امام سے ممکن نہیں۔ للذا طلاق دینے کا یہ افسانہ انتہائی بیہودہ اور من گھڑت ہے۔

۵) جن مورخین نے ازواج امام کی تعداد کو ناقابل یقین حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ بتانے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ امام نے مدینہ میں کتنے عقد کئے اور کوفہ میں کتنے اور

کن کن قبائل کی عورتوں سے۔ ہم امام کی پوری زندگی کا مختصر جائزہ لیکر یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا امام کی مصروف ترین زندگی میں اتنے زیادہ عقد کرنے ممکن بھی تھے یا نہیں۔

حضرت امام حسنؑ ۱۵ر رمضان ۳ھ کو پیدا ہوئے اور ۲۸ر صفر ۵۰ھ کو شہید ہوئے آپ کی کل زندگی چھیالیس ۴۶ سال پانچ مہینے تیرہ دن تھی۔ حضرت علیؑ کی خلافت ظاہری کی بیعت ۱۸ یا ۲۵ر ذی الحجہ ۳۵ھ کو ہوئی اس وقت آپ کی عمر بتیس سال تین مہینے گیارہ دن تھی۔ آپ اپنے والد کے ہمراہ جنگ جمل، صفین اور نہروان میں شریک رہے جنگی مدت مجموعی ایک سال نو مہینے پندرہ دن بنتی ہے۔ ذی قعدہ ۳۷ھ سے آپ نے کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ ۲۱ر رمضان ۴۰ھ کو خلیفہ ہوئے۔ ۲۵ر ربیع الاول ۴۱ھ کو صلح نامہ کے تحت خلافت سے دستبرداری اختیار کی۔ ربیع الثانی ۴۱ھ سے دوبارہ مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے اور آخری وقت تک وہیں مقیم رہے اس طرح کوفہ میں قیام کی مدت تقریباً ساڑھے چار سال اور مدینہ میں دوبارہ قیام کا عرصہ آٹھ سال گیارہ مہینے بنتا ہے۔ ہم آپ کی پوری زندگی کو درج ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:۔

	دن-مہینے-سال
۱۔ ابتدائی دور:- ابتدائی مدنی زندگی ۱۵ر رمضان ۳ھ تا ۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ	۳۲ - ۳ - ۱۱
۲۔ ہنگامی دور:- جنگ جمل، جنگ صفین وجنگ نہروان ۲۶ر ذی الحجہ ۳۵ھ تا ۱۰ر شوال ۳۷ھ	۱ - ۹ - ۱۵
۳۔ کوفہ میں قیام کا دور:- ۱۱ر شوال ۳۷ھ تا ۲۱ رمضان ۴۰ھ	۳ - ۱۱ - ۱۱
۴۔ دوسرا ہنگامی دور:- معاویہ سے جنگ وصلح ۲۲ر رمضان ۴۰ھ تا ۲۵ر ربیع الاول ۴۱ھ	۰ - ۶ - ۴

۵۔ آخری دور:- دوبارہ مدنی زندگی ۲۶ر ربیع الاول ۴۱ھ تا ۲۸ر صفر ۵۰ھ	۸ - ۱۱ - ۲
کل مدت حیات =	۴۶ - ۵ - ۱۳

اب ہم وہ ایام نکالتے ہیں جن میں کسی بھی وجہ سے عقد کرنا ممکن نہ تھا۔

۱۔ ولادت سے سن بلوغ تک - کم از کم	۱۴ - ۰ - ۰
۲۔ مندرجہ بالا دوسرے اور چوتھے ادوار کی مدت میدان جنگ میں ہونے کے باعث	۲ - ۵ - ۱۵
۳۔ آپ نے پچیس حج پاپیادہ کئے۔ ایام حج میں بھی عقد کرنا ممکن نہ تھا۔ فی حج چار ماہ کے حساب سے	۸ - ۴ - ۰
کل مدت =	۲۶ - ۹ - ۱۵

گوکہ حضرت امام حسنؑ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد سرکاری سطح پر آپ کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کے باعث عقد تو دور کی بات ہے لوگ آپ سے ملاقات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے بہر حال پھر بھی اگر آپ کی کل عمر میں سے وہ مدت منہا کر دیں جس میں عقد کرنا ممکن نہ تھا تو وہ ایام حاصل ہوں گے جن میں عقد کرنے ممکن تھے اور یہ مدت انیس سال آٹھ ماہ بنتی ہے۔ یعنی تقریباً سات ہزار ایک سو چھتر دن اب اگر سات سو منکوحہ عورتوں کا اوسط نکالیں تو دس یوم فی عقد آتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ امام کے پاس کوئی اور کام نہ تھا سوائے عقد کرنے اور طلاق دینے کے۔ یہ کتنی عجیب اور ناقابل یقین بات ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت امام حسنؑ کی کثرت ازواج سے متعلق کہانی حالات و واقعات کے منافی اور جھوٹ پر مبنی ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ازواج : کتب تواریخ میں جہاں آپ کی اولاد کا ذکر ہے وہاں ان کی ماؤں کے نام بھی تحریر کئے گئے ہیں۔ آپ کی اولاد کی تعداد کے بارے

مورخین کی مختلف آراء ہیں۔ مثلاً واقدی، ہشام اور کلبی نے امام کے پندرہ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں بتائی ہیں۔ جبکہ ابن جوزی نے سولہ فرزندان اور پانچ دختران بیان کی ہیں۔ ابن شہر آشوب نے پندرہ فرزندان اور چھ دختران تحریر کی ہیں جبکہ شیخ مفید علیہ رحمۃ نے آٹھ فرزندان اور سات دختران بتائی ہیں۔ شیخ محمد عباس قمی نے شیخ مفید علیہ رحمۃ سے اتفاق کیا ہے اور اسے درست قرار دیا ہے۔ ابن سعد نے سولہ بیٹے اور پانچ بیٹیاں لکھی ہیں۔ بعض دیگر کتب میں بیس بیٹے اور بارہ بیٹیوں کے نام بھی لکھے ہیں جو بقول شیخ محمد عباس قمی ان میں سے بیشتر مجہول ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت امام حسنؑ کی اولاد کی زیادہ سے زیادہ تعداد تیس اور کم سے کم پندرہ تھی۔ لہذا ہم ابن سعد کے بیان کردہ نام جن کی مجموعی تعداد اکیس ہے۔ اور شیخ محمد عباس قمی کے بیان کردہ نام جن کی تعداد پندرہ ہے تحریر کرتے ہیں۔

ابن سعد کے مطابق اولاد امام حسنؑ کے نام اور ان کی ماؤں کے نام یہ ہیں: محمد اصغر، جعفر، حمزہ، اور فاطمہ یہ چاروں ام کلثوم بنت فضل بن عباس بن عبدالمطلب کے بطن سے تھے۔ محمد اکبر، اور حسن، خولہ بنت منظور فلیفانیہ سے تھے۔ زید، ام حسن، اور ام خیر کی ماں ام بشر بنت ابومسعود (جنکا نام عقبہ بن عمرو تھا) انصاری سے تھے۔ اسمٰعیل، اور یعقوب، جعدہ بنت اشعث بن قیس کے بطن سے تھے۔ قاسم، ابوبکر اور عبداللہ ان تینوں کی ماں ام فروہ تھی۔ حسین الاثرم، عبدالرحمٰن اور ام سلمہ، ایک کنیز (جس کا نام ظمیا تھا) کے بطن سے تھے۔ عمر ایک کنیز سے تھے۔ ام عبداللہ کی ماں صافیہ تھی۔ طلحہ کی ماں ام اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمی تھی اور عبداللہ اصغر کی ماں زینب بنت سبیع بن عبداللہ تھی۔ سبط ابن جوزی نے مذکورہ بالا ناموں کو درست قرار دیا ہے۔[1]

[1] تذکرۃ الخواص ص: ۲۶۳

شیخ محمد عباس قمی اور شیخ مفید کی بیان کردہ ترتیب اس طرح ہے۔ زید' ام حسن اور ام حسین ان تینوں کی ماں ام بشیر بنت عقبہ ابی مسعود بن خزرجی تھیں۔ حسن کی ماں خولہ بنت منظور فزاریہ تھیں۔ عمر' قاسم' اور عبداللہ کی ماں ام ولد تھیں۔ حسین الاثرم' طلحہ اور فاطمہ کی ماں ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبداللہ تمیمی تھیں۔ ام عبداللہ' فاطمہ' ام سلمہ اور رقیہ ہر ایک کی ماں جدا تھیں۔ عبدالرحمٰن کی ماں ام ولد تھیں۔[1]

مندرجہ بالا ہر دو بیانات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ازواج امام کی کل تعداد نو تھی جن کے نام یہ تھے۔

(۱) ام کلثوم بنت فضل بن عباس بن عبدالمطلب (۲) خولہ بنت منظور غطفانیہ (۳) ام بشر بنت عقبہ ابو مسعود بن عمرو خزرجی انصاری (۴) جعدہ بنت اشعث بن قیس (۵) ام اسحاق بنت طلحہ بن عبیداللہ تمیمی (۶) زینب بنت سبیع بن عبداللہ۔ یہ چھ ازواج منکوحہ تھیں انکے علاوہ کنیزیں تھیں جن کے نام یہ ہیں (۷) ام فروہ (۸) ثمیاظ (۹) صافیہ۔

اب حاصل کلام یہ ہوا کہ حضرت امام حسنؑ کی کل نو ازواج تھیں جن میں چھ منکوحہ اور تین کنیزیں تھیں۔ اور آپ کی اولاد کی صحیح تعداد اکیس تھی جن میں سولہ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔

اولادِ حضرت امام حسنؑ: حضرت امام حسنؑ کے فرزندان میں سے صرف زید' حسن' حسین اور عمر کے اولاد تھی بقیہ تمام فرزندان لاولد تھے۔ ان چاروں میں سے بھی حسین اور عمر کے نرینہ اولاد نہ ہونے کے باعث ان کی نسل آگے نہ چل سکی۔ لہٰذا حضرت امام حسنؑ کے صرف دو فرزندان زید اور حسن کی اولاد سے حسنی سادات پورے عالم میں پھیلی۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت امام حسنؑ کے آٹھ فرزندان اپنے چچا حضرت امام حسینؑ کے ہمراہ کربلا میں تھے ان میں سے تین بیٹے قاسم'

[1] منتہی الامال ص: ۲۹۴ ج: ۱

عبداللہ' اور عمر جن کی ماں ام فروہ تھیں میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ عمر کی بابت شیخ مفید کہتے ہیں کہ یہ شہید نہیں ہوئے بلکہ ان کو اسیر کر کے قافلہ کے ہمراہ دمشق بھیجا گیا۔ کتب مقاتل میں احمد و ابوبکر کو بھی شہدائے کربلا کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ بقیہ فرزندان مختلف مقامات پر شہید کر دیئے گئے۔ البتہ حسن بن حسنؑ زندہ بچے اور مدینہ پہنچے۔ ان کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ طلحہ بن حسنؑ یہ مرد بزرگ تھے اور اپنی جود وسخا اور بخشش و کرم کے باعث طلحہ الجواد' مشہور تھے۔ ایک بیٹے حسین بن حسنؑ تھے جو اپنی شرافت و فضیلت کے باعث قابل احترام تھے۔ جس شخص کے سامنے کے دانت ٹوٹے ہوں اسے عربی میں الاثرم کہتے ہیں اور چونکہ ان کے سامنے کے چار دانت ٹوٹے ہوئے تھے اس لئے یہ حسین الاثرم مشہور تھے۔ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی حسین الاثرم کی بیٹی ام سلمہ زوجہ تھیں حسن بن زید بن حسنؑ کی اور ماں تھی قاسم بن حسن بن زید بن حسنؑ کی۔ اس لئے حسین الاثرم کی نسل آگے نہ چل سکی۔

حضرت امام حسنؑ کی دختران میں سے ایک بیٹی ام حسن زوجہ تھیں عبداللہ بن زبیر کی۔ دوسری بیٹی ام حسین زوجہ تھیں حضرت علی زین العابدینؑ کی۔ ان سے آپ کے چار فرزندان حضرت امام محمد الباقرؑ' حسن' حسین اور عبداللہ الباہر تولد ہوئے۔ تیسری بیٹی ام سلمہ زوجہ تھیں عمر بن علی زین العابدینؑ کی۔ چوتھی رقیہ جو زوجہ تھیں عمرو بن منذر بن عوام کی۔

زید بن حسنؑ: یہ امام حسنؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ ان کی کنیت ابوالحسن تھی۔ ان کے عادات و خصائل نیک نفسی و عبادات کے بارے میں شیخ مفید اور شیخ محمد عباس قمی نے وضاحت سے تحریر کیا ہے۔ علامہ العاملی نے اعیان الشیعہ میں شیخ مفید کی عبارت جوں کی توں نقل

کی ہے جس کا ترجمہ آغا سلطان مرزا صاحب نے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "زید بن الحسن جناب رسول اللہ کے صدقات کے متولی تھے اور بنو ہاشم میں سب سے بڑے تھے۔ جلیل القدر اور کریم الطبع اور پاکیزہ تھے ان میں بہت سی خوبیاں تھیں یہ لوگوں سے نیکیاں کرتے تھے۔ شعراء نے انکی تعریف کی ہے۔ لوگ دور دراز ممالک سے طلب فضل کیلئے انکی خدمت میں حاضر ہوتے تھے"۔ اصحاب السیر لکھتے ہیں کہ زید بن الحسن جناب رسول خدا کے صدقات کا انتظام کرتے تھے۔ جب سلیمان بن عبدالملک حکمران ہوا تو اس نے عامل مدینہ کو لکھا کہ وہ زید بن حسن کو صدقات رسول کی تولیت سے ہٹا کر انکے خاندان کے فلاں بن فلاں کو دیدے اور انکے انتظام میں اس شخص کی مدد کرے۔ لیکن جب عمر بن عبدالعزیز حکمران ہوئے تو انہوں نے حکم دیا کہ زید بن حسن بنی ہاشم کے شرفاء میں سے ہیں اور عمر میں سب سے بڑے ہیں پس تمام صدقات رسول ان کو واپس کر دیئے جائیں۔[1]

قطب راوندی نے حضرت امام جعفر الصادقؑ سے روایت بیان کی ہے کہ زید بن حسن نے امام محمد الباقرؑ سے رسول خدا صلعم کے اوقاف کی بابت تنازعہ کیا اور زید بن علی زین العابدین (زید شہید) سے طعنہ زنی و بدکلامی کی۔ اس روایت پر بہت سے علماء و مورخین نے تنقید کی ہے اور اسے من گھڑت قرار دیا ہے۔ جناب سلطان مرزا صاحب نے اس روایت پر مدلل بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ زید بن حسنؑ کا امام محمد باقرؑ سے کبھی بھی کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کوئی وجہ تنازعہ موجود تھی کیونکہ تولیت کا منصب زید بن حسن کے پاس تھا اور آخر تک انہی کے پاس رہا۔ جہاں تک زید بن علیؑ (زید شہید) سے طعنہ زنی کی بات ہے تو یہ واقعہ ایک مقدمہ کے دوران کا تھا جو زید بن علی (زید شہید) اور عبداللہ بن حسن مثنیٰ کے مابین تھا

[1] نور المشرقین من حیات الصادقین ص: ۱۸۵، منتہی الامال ص: ۲۹۴، اعیان الشیعہ ص: ۳۹۱ ج: ۲[illegible]

جس کی تفصیل بہت سے مستند مورخین نے لکھی ہے اور ہم بھی زید شہیدؒ کے باب میں روشنی ڈالیں گے۔ اس پورے واقعہ میں کہیں بھی زید بن حسنؑ کا ذکر نہیں ہے۔ الغرض اس تنازعہ سے متعلق روایت جسکا واحد راوی قطب راوندی ہے حقائق کے منافی اور زمانہ کے اعتبار سے نامناسب ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت بھی بنی ہاشم کو رسوا کرنے کی غرض سے گھڑی جانے والی روایات میں سے ایک ہے۔

زید بن حسن کو علماء نے متقی' عابد' زاہد اور ثقہ لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زید بن حسنؑ نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد عبداللہ بن زبیر کی بیعت کرلی تھی کیونکہ انکی بہن ام حسن، ابن زبیر کی زوجیت میں تھیں۔ [۱]

زید بن حسنؑ کی وفات صاحب عمدة الطالب نے ایک سو سال کی عمر میں بتائی ہے جبکہ علامہ محسن الامین العاملی نے لکھا ہے کہ " جناب زید بن حسنؑ نوے سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ بہت سے شعراء نے ان کے مرثیے کہے اور ان کے فضائل و محامد کا ذکر کیا۔" واقدی کے حوالہ سے علامہ سبط ابن جوزی نے لکھا ہے کہ " زید بن حسنؑ نے بطحا بن ازہر میں وفات پائی یہ مقام مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ انکا جنازہ بقیع میں لایا گیا۔ ان کی تاریخ وفات نہیں معلوم ہو سکی مگر یہ کہ وہ تابعین کے دوسرے طبقہ سے ہیں"۔ [۲] اس ضمن شیخ عباس قمی نے وفات کے وقت ان کی عمر پچانوے (۹۵) سال بتائی ہے اور وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان موضع حاجرہ میں فوت ہوئے۔ [۳]

اولاد زید بن حسنؑ : زید بن حسنؑ کی زوجہ لبابہ بنت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب تھیں۔ یہی لبابہ پہلے حضرت ابوالفضل العباس ابن علیؑ کی زوجیت میں تھیں۔ کربلا میں حضرت عباس کی شہادت کے بعد لبابہ

[۱] عمدة الطالب ص: ۴۸، [۲] تذکرة الخواص ص: ۲۶۵، [۳] منتہی الامال ص: ۲۹۵

نے زید بن حسنؑ سے عقد کرلیا۔ ان کے بطن سے زید کے ایک بیٹا حسن اور ایک بیٹی نفیسہ پیدا ہوئے۔ زید کے ایک بیٹے کا نام محمد تھا جن کی ماں ام ولد تھی محمد لاولد فوت ہوئے۔ واقدی وغیرہ نے زید کے یہی تین اولاد یعنی حسن' محمد اور نفیسہ بتائی ہیں لیکن مقاتل الطالبین اور نور المشرقین میں ایک اور بیٹے ابراہیم کی اولاد کا تذکرہ ملتا ہے۔ کہ محمد بن حسن بن محمد بن ابراہیم بن زید بن حسنؑ کو بعہد معتدی ۲۵۵ھ میں حرث بن اسد نے قتل کیا۔ [۱] بہر حال زید بن حسنؑ کی نسل انکے بیٹے حسن سے چلی۔

حسن بن زید بن حسنؑ : ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ اولاد امام حسنؑ میں یہ ایسے شخص تھے جو حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے ہی خاندان کے خلاف سرگرم رہتے تھے۔ یہ اکثر و بیشتر انکی چغلیاں کرتے اور مخبری کرتے تھے۔ محمد نفس ذکیہ کی تلاش میں جب منصور مدینہ آیا تو اس نے اولاد حسنؑ کے ایک ایک فرد کو بلا کر نفس ذکیہ کا پتہ معلوم کیا مگر کسی نے کچھ نہ بتایا البتہ حسن بن زید نے نہ صرف ان کا پتہ بتایا بلکہ یہ بھی کہا کہ "وہ تیرے اوپر ضرور حملہ کرنے والا ہے تجھ کو چاہیے کہ اسکا انتظام کرے مجھے تیرے لیے اسکی طرف سے بڑا خوف ہے"۔ [۲] حسن بن زید ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر سیاہ لباس پہنا جو اس وقت تک بنو عباس کا مخصوص لباس تھا۔ انہی خاشامدانہ کارگذاریوں کے صلہ میں منصور دوانقی نے انہیں مدینہ کا والی مقرر کیا۔ خطیب بغدادی کے بیان کے مطابق یہ پانچ سال تک مدینہ کے گورنر رہے پھر منصور نے غضبناک ہو کر ان کو معزول کیا۔ انکا مال متاع ضبط کرلیا اور انھیں قید میں ڈال دیا۔ یہ منصور کی وفات تک قید میں رہے جب مہدی خلیفہ ہوا تو ان کو رہائی ملی اور ان کا مال و املاک واپس کیا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو ظالم کی مدد کرتا ہے وہ خود بھی اسکے ظلم کا شکار ہوتا ہے اسکی بہترین مثال ابو مسلم

[۱] نور المشرقین ص: ۳۹۸، [۲] ایضا ص: ۳۱۰

خراسانی کی ہے۔ بہر حال حسن بن زید تقریبا اسی ۸۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے انکے سات فرزند قاسم' علی' زید' اسحاق' ابراہیم' عبداللہ اور اسمٰعیل تھے۔

بعض نسب نگاروں نے حسن بن زید کے ایک اور بیٹے ابوالحسن کا ذکر کیا ہے اور انکی پانچویں پشت میں سید علی ہجویریؒ المعروف بہ داتا صاحب کو دکھایا ہے آپکا سلسلہ نسب اسطرح بیان کیا گیا ہے۔ سید علی ہجویریؒ بن عثمان بن علی بن عبدالرحمٰن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن بن حسن بن زید بن حضرت امام حسن علیہ السلام۔ گو کہ ابوالحسن علی شدید بن حسن بن زید کی کنیت تھی۔

۱) قاسم بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ یہ سب سے بڑے بیٹے تھے ان کی ماں ام سلمہ بنت حسین اثرم تھیں ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ پہلے عبدالرحمٰن شجری' شجرہ مدینہ کے ایک قریہ کا نام ہے یہ اسی سے منسوب تھے۔ یہ صاحب اولاد تھے انکے ایک فرزند قاسم بن حسن بن علی بن عبدالرحمٰن شجری اور انکے بیٹے محمد نقیب بغدادی' معزالدولہ دیلمی کے زمانہ میں صاحب " قضایائی کثیرہ" تھے۔ انکا ذکر عمدة الطالب میں مرقوم ہے۔ دوسرے محمد چونکہ یہ عرصہ دراز تک بطحا میں رہے۔ لہٰذا البطحائی کہلائے' یہ فقیہ تھے۔ صاحب اولاد اور جد قبائل تھے۔ اصفہانی سادات جو سادات گلستانہ کہلاتی ہے محمد بطحائی سے منسوب ہے۔ تیسرے حمزہ اور چوتھے حسن تھے' قاسم بن حسن بن زید بن حسنؑ کی دو دختران میں سے ایک خدیجہ تھی جو زوجہ تھی اپنے ابن عم عبدالعظیم حسنی کی جو مدفون ہیں رے میں۔ دوسری عبیدہ تھی جو زوجہ تھی اپنے چچا کے بیٹے طاہر بن زید بن حسن بن زید بن حسنؑ کی۔

۲) علی بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کی کنیت ابوالحسن اور لقب شدید تھا۔ انکی ماں ام ولد تھی۔ انہوں نے منصور کی قید میں وفات پائی۔ انکے ایک بیٹی فاطمہ تھی۔ علی شدید کی وفات کے چند دن بعد ان کی ایک کنیز حیفاء کے بطن سے ان کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔ دادا (حسن بن زید) نے اس کا نام عبداللہ رکھا جس نے طویل عمر پائی اور اس کے نو فرزند ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ احمد' قاسم' حسن' عبدالعظیم' محمد' ابراہیم' علی اکبر' علی اصغر اور زید۔ عبداللہ کے بیٹے عبدالعظیم کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ یہ محدث' عالم' زاہد و عبادت گذار تھے۔ یہ جلیل القدر اور صاحب شان و شوکت تھے۔ یہ حضرت جواد اور ہادی علیہما السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کی قبر رے میں ہے جو زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ عبدالعظیم کے ایک فرزند محمد تھے جو زیرک و دانا اور کثرت سے عبادت کرنے والے تھے۔ محمد سامرہ منتقل ہو گئے تھے ان کا انتقال سامرہ کے قریب مقام بلایک میں ہوا۔ یہاں ان کی قبر امام زادہ سید محمد کے نام سے مشہور ہے۔

۳) زید بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کی کنیت ابو طاہر تھی۔ انکے دو بیٹے اور ایک بیٹی ام عبداللہ تھی۔ بیٹوں کے نام طاہر اور علی تھے۔ طاہر کی ماں اسماء بنت ابراہیم مخزومی تھی۔ طاہر کے دو بیٹے محمد و علی تھے محمد کے تین دختران خدیجہ' نفیسہ اور حسناء تھیں نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔

۴) اسحاق بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کا لقب کوبکی تھا ان کے تین فرزند حسن' حسین اور ھرون تھے۔ ھرون کے بیٹے کا نام جعفر اور جعفر کا بیٹا محمد تھا جو شہر مازندران میں رافع بن لیث کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ان کی قبر زیارت گاہ ہے۔

۵) ابراہیم بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کے بیٹے کا نام بھی ابراہیم ہی تھا جس کی ماں حسینی سادات سے تھی۔ دوسرا بیٹا علی جو حمیدہ نامی کنیز سے تھا۔ ابراہیم بن ابراہیم کے دو فرزند محمد و حسن تھے۔ محمد کے تین بیٹے فن' عبداللہ اور احمد تھے جنکی ماں سلمہ بنت عبدالعظیم تھیں۔

۶) عبداللہ بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کے پانچ بیٹے علی' محمد' حسن' زید اور اسحٰق تھے۔ زید کے علاوہ سب لاولد فوت ہوئے۔ زید کی ماں ام ولد تھی۔ زید نے کوفہ میں ابوالسرایا کے خروج میں شمولیت کی اور قتل ہوئے۔ زید کے چار بیٹے محمد' علی' حسین اور عبداللہ ان کی ماں علوی سادات سے تھیں۔ محمد بن زید کے تین فرزند حسن' علی اور عبداللہ تھے۔ یہ حجاز میں سکونت پذیر ہوئے۔

۷) اسمٰعیل بن حسن بن زید بن حسنؑ : ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ انکے تین بیٹے حسن' علی اور محمد تھے۔ ان سے میں سے علی کے چھ فرزند حسین' حسن' اسمٰعیل' محمد' قاسم اور احمد تھے۔ اسمٰعیل بن حسن کے تیسرے بیٹے محمد جنکی ماں حسینی سادات سے تھیں انکے چار فرزند احمد یہ بخارا میں آباد ہوئے اور وہیں قتل کر دیئے گئے علی' اسمٰعیل ان کی ماں خدیجہ دختر عبداللہ بن اسحاق بن قاسم بن اسحاق بن عبداللہ بن جعفر بن ابیطالب تھیں جو حبش البطن مشہور تھیں۔ زید انکی ماں شجری قبیلے سے تھیں اور ان کے دو پسر تھے ایک امیر حسن جن کا لقب داعی کبیر تھا اور دوسرے محمد جو اپنے بھائی کے بعد لقب داعی سے مشہور ہوئے۔

حسن بن زید بن حسن بن اسمٰعیل کے ایک دختر نفیسہ تھیں جو زوجہ تھیں اسحاق بن امام جعفر الصادق علیہ السلام کی یہ بڑی عابدہ وزاہدہ اور صاحب جلالت و شان والی خاتون تھیں ان کے تفصیلی حالات امام جعفر صادق کے باب میں رقم کئے جائیں گے۔

حسن بن حسنؑ : ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ چونکہ ان کے والد کا نام بھی حسن تھا لہٰذا ان کو حسن مثنیٰ کہا جانے لگا۔ حسن مثنیٰ کی ماں خولہ بنت منظور تھیں جو بنو غطفان کے قبیلہ فزارہ سے تھیں۔ بقول شیخ محمد عباس قمی' حسن مثنیٰ جلیل و رئیس' صاحب فضل وورع اور اپنے زمانہ میں صدقات امیر المومنین حضرت علیؑ کے متولی تھے۔ چونکہ فاطمہ کبریٰ بنت امام حسینؑ ان کی زوجیت میں تھیں اس لئے یہ حضرت امام حسینؑ کے داماد تھے۔ انہوں نے میدان کربلا میں جہاد کیا اور زخمی ہو کر زمین پر گرے۔ دشمن انہیں مقتول جان کر وہیں چھوڑ گئے بعد میں جب شہداء کے سر قلم کرنے کی غرض سے لاشوں کو الٹ پلٹ کیا گیا تو ان میں زندگی کے آثار باقی تھے۔ اس موقعہ پر موجود یزیدی فوج کے سالار اسماء ابن خارجہ فزاری نے ان کو پہچان لیا کیونکہ وہ قبیلہ فزارہ کا سردار اور رشتہ میں حسن مثنیٰ کا ماموں ہوتا تھا۔ اس لئے وہ حسن مثنیٰ کو اپنے ہمراہ کوفہ لے گیا چونکہ فزاری قبیلہ طاقتور تھا لہٰذا ابن زیاد والئی کوفہ نے خاموشی اختیار کی۔ اسماء نے ان کا علاج کرایا۔ جب صحتمند ہو گئے تو مدینہ بھیج دیا۔ حسن مثنیٰ نے بقیہ زندگی مدینہ ہی میں گذاری۔ وہیں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

ان کی اولاد کی زیادہ سے زیادہ تعداد دس بتائی گئی ہے۔ ابن قتیبہ دینوری نے ان کے آٹھ فرزند بتائے ہیں۔ شیخ محمد عباس قمی نے چھ بیٹے اور چار بیٹیاں بتائی ہیں اور ان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے: عبداللہ' ابراہیم' حسن مثلث' زینب اور ام کلثوم ان پانچوں کی ماں فاطمہ بنت حسینؑ تھیں۔ داؤد اور جعفر کی ماں حبیبہ رومیہ ام ولد تھیں۔ محمد کی ماں کا نام رملہ تھا۔ رقیہ اور فاطمہ زوجہ تھیں معویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار کی۔ اس کے علاوہ بعض دیگر ماہرین انساب کی رائے میں داؤد' جعفر بن مصعب بن زبیر کی زوجہ تھیں جن حضرات نے ملیکہ اور ام قاسم

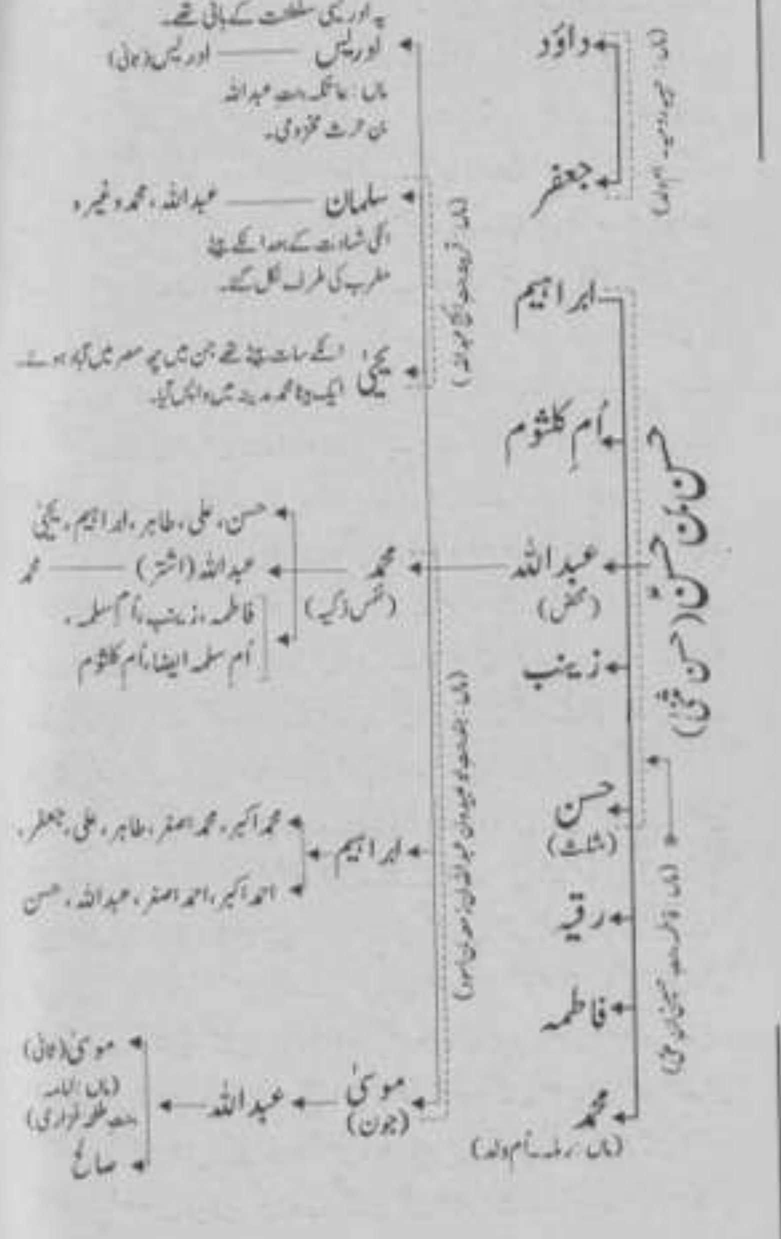

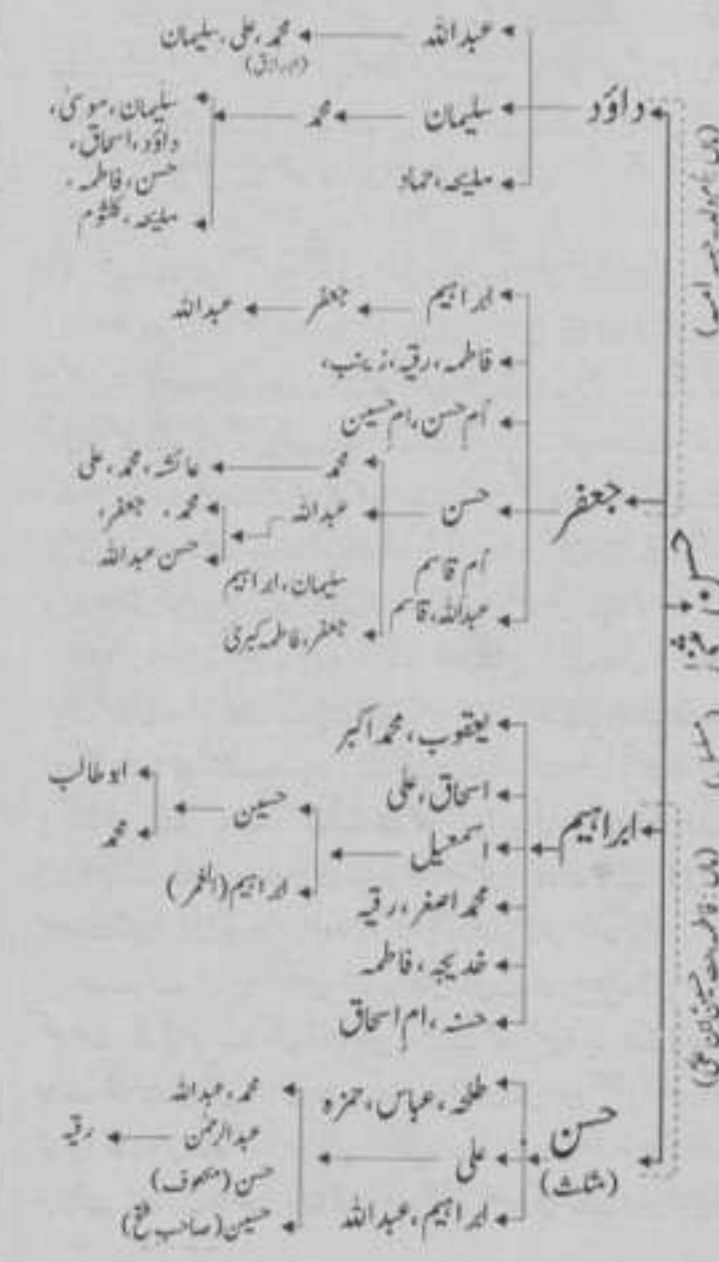

جعفر' ملیکہ اور ام القاسم' حبیبہ رومیہ کے بطن سے تھے اور ملیکہ کے نام لکھے ہیں انہوں نے رقیہ کا نام تحریر نہیں کیا اسی طرح موسیٰ اور عباس دو فرزندان کے نام مزید لکھے ہیں مگر انہوں نے محمد کا نام شامل نہیں کیا۔ اولاد حسن مثنیٰ کے مختصر حالات ذیل میں درج ہیں :

۱) **عبداللہ بن حسن مثنیٰ :** ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ چونکہ انکے دادا حضرت امام حسنؑ اور نانا حضرت امام حسینؑ تھے لہٰذا ان کا لقب "محض" مشہور ہوا۔ اور یہ عبداللہ محض کہلائے۔ یہ شیخ بنی ہاشم اور قوی النفس تھے علم و فضل میں بہت سوں سے بہتر تھے۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو محمد عبداللہ بن حسن مثنیٰ مدینہ کے چوتھے طبقے تابعین میں سے تھے۔ یہ صاحب ہیبت و شرافت اور فصیح و بلیغ تھے۔ آپ مدینہ ہی میں قیام پذیر رہے یہانتک کہ بنی امیہ کی حکمرانی اپنے انجام کو پہنچی اور عباس بن عبدالمطلب کی اولاد تخت خلافت پر متمکن ہوئی اور بنی عباس کہلائی۔ عباسیوں کے پہلے خلیفہ ابو العباس سفاح کی وفات کے بعد ابو جعفر عبداللہ "المنصور" کے لقب سے حکمران ہوا۔ تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اسے عبداللہ محض کے بیٹے محمد نفس ذکیہ کی تلاش و جستجو ہوئی۔ اس کام کے لئے اس نے والئی مدینہ کو خصوصی احکامات دیئے ناکامی کی صورت میں اس کی جگہ دوسرا اور پھر تیسرا گورنر ریاح بن عثمان کو مقرر کیا۔ اس شدت سے تلاش و جستجو کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ۱۳۲ھ میں عباسی حکومت کے قیام سے قبل تمام بنی ہاشم نے محمد نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی تھی۔ ان بیعت کرنے والوں میں ابو جعفر منصور بھی شامل تھا۔ اس لئے وہ نفس ذکیہ کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتا تھا اور ہر وقت ان سے خائف رہتا تھا۔ ابو جعفر منصور کی بابت مورخین کی

رائے ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑتا تھا جس پر اسے خفیف سا بھی شک ہو کہ وہ اس کے لئے کسی طرح بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔

جہاں ایک طرف منصور نفس ذکیہ سے خائف تھا وہاں نفس ذکیہ بھی منصور سے خوفزدہ تھے۔ وہ اس سے بچنے کیلئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ حجاز سے یمن' یمن سے بصرہ' بصرہ سے سندھ اور سندھ سے کوفہ۔ یہی وجہ تھی کہ منصور کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ مسلسل ناکامی کے بعد ۱۴۱ھ میں جب منصور مدینہ گیا تو اس نے عبداللہ محض کو طلب کیا اور ان سے ان کے بیٹوں محمد و ابراہیم کی بابت دریافت کیا۔ عبداللہ نے لاعلمی ظاہر کی تو منصور برہم ہو گیا اور بدکلامی پر اتر آیا۔ اس پر عبداللہ نے کہا " خدا کی قسم اگر وہ دونوں میرے قدموں کے نیچے ہوتے تو بھی میں قدموں کو نہ اٹھاتا"۔ بس پھر کیا تھا منصور نے حاکم مدینہ کو حکم دیا کہ عبداللہ کو قید کرے اور خاندان کے دوسرے لوگوں سے پوچھ گچھ کرے۔ لہٰذا عبداللہ محض قید کر دیئے گئے تین سال تک تو یہ مدینہ میں قید رہے اس کے بعد ۱۴۴ھ میں جب منصور دوبارہ گیا اور ربذہ میں ٹھہرا تو دیگر اولاد امام حسنؑ کے ہمراہ عبداللہ کو بھی بیڑیاں پہنا کر انتہائی بدترین حالت میں مدینہ سے ربذہ لیجا کر منصور کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدالرحمن ابن موالی کا بیان ہے کہ میں نے ان لوگوں کی ربذہ میں یہ حالت دیکھی کہ وہ لوگ دھوپ میں پڑے ہوئے تھے اور منصور محمد و ابراہیم کا پتہ دریافت کرتا جب وہ نہیں بتاتے تو ان کے کوڑے لگواتا تھا۔ یہاں تک کہ محمد دیباج کی کوڑہ لگنے سے ایک آنکھ جاتی رہی اور اس کی کھال اتر والی گئی۔ پھر اولاد حسنؑ کو اونٹوں کے پالانوں پر سوار کر کے اس بے کسی کے عالم میں انہیں مدینہ سے نکالا کہ ان کے سر ننگے' اونٹوں کی پشت پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ بھوکے پیاسے تھے اسی حالت میں انہیں کوفہ لایا گیا۔

"واقدی کا بیان ہے کہ اولاد امام حسنؑ کے بیس افراد تھے جنہیں کوفہ کے قریب ایک سرداب میں رکھا گیا جو زمین کے نیچے تھا جس میں نہ رات کا پتہ چلتا تھا نہ دن کا۔ یہ سرداب کوفہ کے پل کے سامنے معروف جگہ ہے جہاں اب زیارت کی جاتی ہے۔ ان کے پاس پانی تک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جب ان میں سے کوئی مر جاتا تو اس کو دفن بھی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے سامنے گل سڑ کر مٹی ہو جاتا اور وہ اسے دیکھتے رہتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ سرداب ان پر گر پڑا اور وہ سب وہیں دب کر مر گئے"۔[۱]

ان اسیروں میں حسن مثنیٰ کی درج ذیل اولاد تھی :

۱) عبداللہ ۲) ابراہیم ۳) حسن

۴) جعفر ۵) عباس ۶) علی پسران حسن مثنیٰ

۷) سلیمان ۸) عبداللہ پسران داؤد بن حسن مثنیٰ

۹) محمد ۱۰) اسمٰعیل ۱۱) اسحاق پسران ابراہیم بن حسن مثنیٰ

۱۲) موسیٰ بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ ؒ

اولاد امام حسنؑ کے علاوہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے پڑپوتے محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان کو بھی قید کر کے سخت ترین اذیتیں پہنچائیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ یہ اولاد حسن کے مادری بھائی تھے اپنی ماں کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اسلئے تمام بھائی ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ یہ نہایت خوبصورت تھے اس لئے محمد دیباج کہلاتے تھے۔ ربذہ میں منصور نے انکے اتنے کوڑے لگوائے کہ یہ لہولہان ہو گئے پھر انکے جسم پر ایک کپڑا ڈلوا دیا جو خون کی وجہ سے جسم سے چپک گیا بعد میں اس کپڑے کو کھینچا گیا جسکے ساتھ انکی کھال بھی اتر آئی اور ایک کوڑا لگنے سے ان کی ایک آنکھ بھی نکل گئی۔ ان کی ایک بیٹی رقیہ' ابراہیم بن عبداللہ محض کی زوجہ تھیں۔

[۱] تذکرۃ الخواص ص : ۱۷۱' ۲' نورالمشرقین من حیات الصادقین ص : ۲۸۳'

اولاد عبداللہ محض : المختصر یہ کہ عبداللہ محض اپنے دیگر اعزاء کے ساتھ اسی سرداب میں قید رہے حتیٰ کہ ۱۴۵ھ میں پچھتر برس کی عمر میں قتل کر دیئے گئے۔ "ابن سعد نے طبقات میں واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو محمد عبداللہ محض مدینہ کے چوتھے طبقہ تابعین میں تھے۔ یہ صاحب ہیبت و شرافت اور فصیح و بلیغ تھے۔ ۱۴۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ امام حسن کی اولاد جو منصور کی قید میں تھے ان میں سب سے پہلے عبداللہ فوت ہوئے۔ یہ عید قرباں کا دن تھا۔ قید خانہ کے داروغہ کے کہنے پر ان کے بھائی حسن بن حسن بن حسنؑ (حسن مثلث) نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اس وقت عبداللہ کی عمر پچھتر سال تھی۔ بعض نے ان کی عمر بہتر اور چھہتر سال بھی لکھی ہے لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔"[۱] واقدی کے بیان کے مطابق عبداللہ محض کی کل اولاد کی تعداد تیرہ تھی جن میں نو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں جبکہ شیخ عباس قمی نے چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تحریر کی ہیں۔ اور بیٹوں کی تفصیل بھی تحریر کی ہے واقدی کے مطابق عبداللہ کی اولاد میں محمد' ابراہیم' موسیٰ' ہارون' فاطمہ' زینب' رقیہ اور ام کلثوم ان سب کی ماں ہند بنت ابو عبیدہ بن عبداللہ بن زمعہ بن اسود تھیں۔ عیسیٰ' ادریس اور داؤد کی ماں عاتکہ بنت عبدالملک بن حرث شاعر مخزومی تھیں۔ سلیمان اور یحییٰ کی ماں قریبہ بنت ربیح عبداللہ بن ابو عبیدہ بن عبداللہ بن زمعہ بن اسود تھیں۔

محمد بن عبداللہ محض : اب ہم فرزندان عبداللہ محض کی بابت قدرے تفصیل سے تحریر کرتے ہیں۔ جناب عبداللہ بن حسن بن حسنؑ کے ایک فرزند محمد تھے جنکی کنیت ابو عبداللہ اور لقب نفس ذکیہ تھا۔ آپ کی والدہ ہند بنت ابو عبیدہ تھیں۔ آپ بڑے متقی' پرہیزگار' عابد و زاہد

[۱] حوالہ نورالمشرقین ص : ۲۸۴

اور جری وبہادر تھے۔ آپ کی بابت علامہ سید مناظر احسن گیلانی تحریر کرتے ہیں کہ :

"بچپن ہی سے بعض غیر معمولی آثار رشد و صلاح کے ان میں پائے جاتے تھے، ان کی ان ہی خصوصیتوں کو دیکھ کر لوگوں میں "نفس ذکیہ" کے نام سے مشہور ہوئے تھے۔ بلکہ نام ان کا چونکہ محمد اور والد کا نام عبداللہ تھا اور غالباً والدہ کا نام بھی آمنہ تھا اسی بنیاد پر بعض لوگوں نے ان حدیثوں کا مصداق ان کو قرار دینا شروع کیا، جن میں امام مہدی کے ظہور و خروج کی پیش گوئی کی گئی ہے"۔ (امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ص : ۳۳۶)

آپکے فضائل حسنہ اور خصائل حمیدہ کے باعث ہی جناب یحییٰ بن زید الشہیدؒ نے آپ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اور انہی خوبیوں کے سبب ۱۳۲ھ میں جب بنی امیہ کے مروانی حکمرانوں کا سورج غروب ہو رہا تھا اس وقت تمام بنی ہاشم نے مدینہ میں جمع ہو کر آپکو خلیفہ مقرر کیا اور آپکے ہاتھ پر بیعت کی ان بیعت کرنے والوں میں ابو جعفر منصور بھی شامل تھا جو بعد میں بنو عباس کا خلیفہ دوئم بنا۔[1] اور اسی بیعت کے سبب اس نے اولاد امام حسنؑ پر بے پناہ مظالم کئے منصور کے دل میں نفس ذکیہ کی بیعت کا واقعہ ہمیشہ کھٹکتا رہا جبکہ نفس ذکیہ نے کبھی بھی اس بیعت سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی سفاح و منصور کی تخت نشینی میں کوئی رکاوٹ پیدا کی۔ جسٹس امیر علی نے نفس ذکیہ کی بیعت کی بابت لکھا ہے کہ :

"When the Ommeyade Caliphate was falling to pieces, the family of the prophet were naturally interested in the event. A meeting was held in Madina, at which were present most of the members of the the Banu Hashim including Mansur himself. (The apostolical Imam Jaafar as Sadik was not present.) At this gathering. Mohammad, a great grand - son of Hasan,

[1] نور المشرقین من حیات الصادقین ص : ۲۶۷

regarded as the head of Banu Hasan, was chosen as caliph, notwith standing that his father was alive. His noble and pure character, his high aspirations and lofty standard of virtue, had obtained for him the name of an- Nafs-us-Zakiya' or "the pure soul." There was a consensus of openion regarding his worth and pre-eminence, and the entire assembly, including Abu-Jaafar (Mansur), took the oath of fealty to him. We have seen, however , how the caliphate fell eventually into the hands of Abbasides. When Mansur was seated on the pontifical throne, the memory of that unforgtten oath darkened his life and deepened his suspicion. And his spies poisoned his mind with false accusations against the Banu-Hasan. He attempted to seize the person of Mohammad and his brother Ibrahim, but they escaped. He then arrested all the leading members of the family, including the old father, Abdullah, and the head of the caliph Osman's decendants, named Mohammad al Osmani, whose daugher was married to Ibrahim. They were sent in chains to Kufa, and imprisoned in the castle of Habaira."

(History of the saracens P. 220)

تحریک بنو ہاشم کا مختصر جائزہ : واقعہ کربلا کے بعد عام مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں اہلبیت رسولؐ سے وابستہ ہو گئیں اور انہوں نے مختار ثقفی کی قیادت میں اموی حکومت کے خلاف زبردست کاروائی کی۔ گو کہ یہ عامۃ المسلمین کی جانب سے واقعہ کربلا اور قتل حسینؑ کا رد عمل تھا لیکن حکمرانوں نے اس کی بنیاد پر اولاد علیؑ کو مورد الزام ٹھراتے ہوئے ان پر سختیاں شروع کر دیں جنکے باعث اولاً زید بن علی زین العابدینؑ (زید شہیدؒ)

اور بعدہ، یحییٰ بن زید الشہیدؒ کو چاروناچار تلوار اٹھانا پڑی۔ انہوں نے ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی جو انہیں میدان جنگ میں نصیب ہوئی۔ جناب یحییٰ بن زید الشہیدؒ کی شہادت کے کچھ ہی دنوں بعد اموی اقتدار کی شمع گل ہو گئی اور مروانی حکومت اپنے انجام کو پہنچی اور اہلبیت رسولؐ کے نام پر چلنے والی بنی ہاشم کی تحریک کے نتیجہ میں بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی۔ عباسی حکومت کے قیام تک بنی عباس کی اصطلاح رائج نہ تھی۔ بلکہ تمام اولاد عبد المطلب بنی ہاشم کہلاتی تھی جس میں لازمی طور پر اولاد عباس بن عبد المطلب بھی شامل تھی مگر اقتدار حاصل کرنے کے بعد ابو جعفر منصور کے عہد میں بنی عباس کی اصطلاح رائج ہوئی۔ کیونکہ "المنصور ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے عباسیوں اور علویوں کے درمیان فتنہ انگریزی کی، حالانکہ اس فتنہ و فساد سے پہلے یہ دونوں متفق و متحد تھے"۔[1]

حالات وواقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ تحریک بنی ہاشم کے رہنماؤں میں سے خواہ وہ محمد حنفیہ ہوں یا زید الشہیدؒ یحییٰ بن زید الشہید ہوں یا محمد نفس ذکیہ کسی نے بھی حصول اقتدار کیلئے ناجائز ذرائع استعمال نہیں کئے۔ اپنے اجداد کی طرح ان حضرات نے بھی مصلحت اندیشی، حیلہ سازی اور دروغ گوئی جیسی غیر اخلاقی حرکتوں سے ہمیشہ اجتناب برتا۔ مگر جب یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہونے لگی تو عباسیوں نے اپنی جدوجہد کا رخ موڑ لیا۔ اور ہر جائز وناجائز طریقہ کو حصول اقتدار کا ذریعہ بنا لیا۔ خوش قسمتی سے انہیں ابو مسلم جیسا شاطر و ظالم کارکن میسر آگیا جسکے ذریعہ انہوں نے اپنا مقصد حاصل کیا اور اقتدار میں آنے کے بعد منصور نے اپنے اس محسن کو محل میں بلا کر دھوکے سے قتل کرا دیا۔ بقول آغا

[1] تاریخ الخلفاء ص : ۲۹۴، نور المشرقین من حیات الصادقین ص : ۲۸۴

سلطان مرزا" اگر خاندان بنو عباس کی کارکردگیوں کو چند الفاظ میں پیش کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ قصر سلطنت بنی عباس کے ارکان واقعہ کربلا اور مکر و ظلم ابو مسلم پر کھڑے کیے گئے تھے اور اس عمارت کو بنو ہاشم کے خون سے تعمیر کیا گیا تھا"۔[1]

منصور کا برتاؤ : بہر حال جب ۱۳۲ھ میں بنی امیہ کے مظالم اور اہلبیت رسول کی مظلومیت کے سہارے عباسی حکومت قائم ہوئی تو عبد اللہ بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب اس خاندان کا پہلا خلیفہ بنا اور ابو العباس سفاح کے لقب سے مشہور ہوا۔ اسکا چار سالہ دور امویوں کے قتل عام اور حکومت کے استحکام میں گذرا جسکے باعث اہلبیت و دیگر بنی ہاشم حکمرانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رہے مگر سفاح کے انتقال کے بعد جب اسکا بھائی ابو جعفر عبد اللہ ۱۳۶ھ میں المنصور کے لقب سے بنی عباس کا دوسرا خلیفہ مقرر ہوا تو بقول ابن اثیر" اسکو کوئی چیز فکر میں ڈالنے والی سوائے محمد کے معاملہ اور انکے دریافت حال نہ تھی "اور یہ اسلئے کہ اس نے خود نفس ذکیہ کی بیعت کی ہوئی تھی جسکے باعث وہ انکی طرف سے شاکی تھا۔ منصور کی سرشت کی بابت مولانا سبط شبر زیدی نے تحریر کیا ہے کہ :

"سفاح کے مظالم 'انتقام کے جوش میں سرزد ہوتے تھے مگر اس کے جانشین منصور کے مظالم' کمال غور و تامل اور جوڑ توڑ کا نتیجہ ہوتے تھے وہ کسی ایسے آدمی کو زندہ نہ چھوڑتا تھا جس پر اسے خفیف سا بھی شک ہو جاتا"۔ (حیات الداریں ص : ۳۱)

چونکہ محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم دونوں روپوش ہو گئے تھے لہٰذا منصور نے عامل مدینہ زیاد بن عبید اللہ کو تاکید کی کہ وہ ان دونوں بھائیوں کو تلاش کرے جب زیاد ناکام رہا تو منصور نے اسکی جگہ خالد بن عبد اللہ القسری کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا۔ مگر جب وہ بھی محمد و ابراہیم کو گرفتار نہ کر سکا تو

[1] نور المشرقین من حیات الصادقین ص : ۲۶۶

منصور نے اسے بھی ہٹادیا اور صلاح مشورہ کے بعد ریاح بن عثمان بن حیان المری کو رمضان ۱۴۴ھ میں اس عہد و پیان پر مدینہ کا حاکم مقرر کیا کہ وہ ان دونوں بھائیوں کو ہر حال میں گرفتار کر کے منصور کے روبرو پیش کریگا۔ ایک طرف تو ریاح بن عثمان نے آل ابطالب سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کسی کو ہراساں کیا' کسی کو اذیتیں دیں' کسی کو پابند سلاسل کیا۔ اور دوسری طرف منصور نے اپنے بہت سے جاسوس چھوڑے جو محبّ اہلبیت کی شکل میں محمد و ابراہیم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب صورتحال کچھ اسطرح تھی کہ منصور' محمد نفس ذکیہ سے خائف تھا اور نفس ذکیہ' منصور کے خوف سے شہر بہ شہر' قریہ بہ قریہ چھپتے پھر رہے تھے۔ وہ حجاز سے یمن' یمن سے بصرہ' بصرہ سے سندھ اور پھر سندھ سے کوفہ و مدینہ منتقل ہوتے رہے۔

روپوشی و خروج : روپوشی و دربدری کے شدائد و مصائب نے آپ کی زندگی کو پہلے ہی تلخ بنا رکھا تھا کہ منصور نے ان کے والد عبد اللہ محض اور اولاد ابطالب کے بہت سے دیگر افراد کو قید کرلیا اور اولاد حسنؑ پر شدید مظالم ڈھائے لہذا "تنگ آمد بہ جنگ آمد" محمد نفس ذکیہ نے ۲۸/ جمادی الآخر ۱۴۵ھ مطابق ۲۳/ دسمبر ۷۶۲ء کو مدینہ میں ظہور فرمایا۔ اور اپنی حمایت حاصل کرنے کیلئے مختلف صوبوں میں اپنے نمائندے بھیجے۔ بقول مسعودی' نفس ذکیہ نے اپنے ایک بیٹے علی کو مصر' دوسرے بیٹے عبد اللہ کو خراسان اور تیسرے بیٹے حسن کو یمن اور اپنے بھائی موسیٰ کو جزیرہ موصل وغیرہ، دوسرے بھائی یحییٰ کو رے و طبرستان اور تیسرے بھائی ادریس کو مغربی علاقہ جات (افریقہ' مراکش وغیرہ) اور چوتھے بھائی ابراہیم کو بصرہ و کوفہ (عراق) میں نمائندے مقرر کیے۔[1]

---
[1] تاریخ کامل ص : ۱۱۷ ج : ۵

علامہ جلال الدین سیوطی ان کی بابت تحریر کرتے ہیں کہ :

"ان سب کو اپنے اپنے علاقوں میں بڑی اچھی کامیابیاں میسر آئیں۔ انہی کامیابیوں ہی کے پیش نظر محمد نفس ذکیہ نے مدینہ میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ مگر عباسیوں کی قسمت نے یاوری کی۔ نفس ذکیہ شہید ہوئے اور ان کے تمام نمائندے جہاں جہاں تھے شہید کر دیے گئے۔ بعض نے قید خانوں میں جان دی۔ البتہ ادریس بن عبد اللہ مغرب اقصیٰ میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ایک زمانے تک یہاں اس خانوادہ کی حکمرانی قائم رہی ان کی اپنی مستقل تاریخ ہے"

(تاریخ الخلفاء ص : ۳۳۸)

نفس ذکیہ نے حجاز کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا اور مدینہ سے خروج کا آغاز کیا۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسے جید علماء و فقہاء نے محمد نفس ذکیہ کے جہاد کی حمایت کی' ان کے حق میں فتوے دیئے بلکہ ابن خلدون اور مسعودی کے بیان کے مطابق ان کی بیعت بھی کی۔[1] گو کہ تمام اہل مدینہ نے منصور کی بیعت کرلی تھی لیکن جب محمد نفس ذکیہ ماہ رجب میں منصور کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور صرف ڈھائی سو سواروں کی مختصر جماعت کے ساتھ انہوں نے مدینہ میں خروج کیا تو ان کی کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی انہوں نے سب سے پہلے قید خانے کے دروازے توڑ کر تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا اور حاکم مدینہ جو اولاد ابطالب پر مسلسل ظلم و زیادتی کر رہا تھا اس کو ہشام کے گھر میں قید کر دیا۔ اس کے بعد خطبہ دیا جس میں منصور کے مظالم پر روشنی ڈالی۔ اس خطبہ کے بعد ہی سے محمد نفس ذکیہ کی عام بیعت کا سلسلہ شروع ہو گیا لوگ جوق در جوق بیعت کرنے لگے۔ واقدی کے بیان کے مطابق مکہ' مدینہ اور یمن پر نفس ذکیہ کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنے گورنر مقرر کئے لوگ ان کو خلیفہ کہہ کر سلام کرنے لگے۔

---
[1] تاریخ ابن خلدون ص : ۲۹۶ ج : ۲' تاریخ کامل ص : ۱۱۷ ج : ۵

اس صورتحال سے منصور بہت پریشان ہوا۔ پہلے تو اس نے سیاسی مکاری سے کام لیتے ہوئے نفس ذکیہ کو خط کے ذریعہ امان کی پیشکش کی اور خاندانی قربت و فضیلت کا واسطہ دیا لیکن جب یہ حیلہ کارگر ثابت نہ ہوا تو عیسیٰ بن موسیٰ کو کثیر فوج کیساتھ محمد نفس ذکیہ کے مقابلے کیلئے بھیجا۔ اسکے علاوہ اس نے تمام عمائدین مدینہ کو جو نفس ذکیہ کیساتھ تھے خطوط و پیغامات کے ذریعہ اپنی حمایت کرنے اور نفس ذکیہ کا ساتھ چھوڑنے کی ترغیب دی۔ جان بخشی کا وعدہ اور انعام و اکرام کا لالچ دیا۔ اسطرح عیسیٰ نے بھی محمد کے ساتھیوں سے رابطے کئے اور خطوط کے ذریعہ امان کی پیشکش کی۔ منصور نے عیسیٰ کو ہدایت کی تھی کہ آل ابطالب میں سے جو اس سے ملنے آئے اس کی اطلاع اسے پہنچاتا رہے اور جو نہ آئے اسکی جائیداد و املاک ضبط کرلے۔ لہذا اولاد ابطالب میں سے بہت سوں کی املاک ضبط کرلی گئیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ جن کا اس پورے واقعہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا انکی املاک بھی ضبط کرلی گئیں۔ منصور و عیسیٰ کی ان تمام تر کوششوں کے نتیجہ میں مدینہ کے ایک لاکھ افراد جو نفس ذکیہ کیساتھ تھے ان میں بہت سے عیسیٰ سے جاملے۔ اس بگڑتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر نفس ذکیہ نے خطوط کا وہ تمام ریکارڈ نذر آتش کرا دیا جسکے ذریعہ لوگوں نے انکی حمایت و بیعت کا اقرار کیا تھا۔ اسطرح نفس ذکیہ نے ایسے خطوط لکھنے والے تمام افراد کو اس مصیبت عظیم سے بچالیا جو ان خطوط کی موجودگی میں منصور ان پر ڈھاسکتا تھا۔ اس ریکارڈ کے تلف ہونے کے بعد نفس ذکیہ نے کہا کہ "اب میں طیب خاطر سے مروں گا"۔ اسکے بعد نفس ذکیہ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی اور جنگ کیلئے تیار ہو گئے۔ جب آپ مقابلے کیلئے نکلے تو ایک لاکھ ساتھیوں میں سے اہل بدر کی تعداد کے برابر یعنی صرف تین سو تیرہ جانثار رہ گئے۔ ان میں سے چند بنو ہاشم کے نام درج ذیل ہیں۔

موسیٰ برادر نفس ذکیہ، حسن اور علی پسران زید بن علیؑ (زید الشہیدؒ)، حمزہ بن عبد اللہ بن عبد اللہ بن محمد بن حسین، علی اور زید پسران حسن بن زید بن حسن بن علیؑ، حسن، یزید اور صالح پسران معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر بن ابطالب، قاسم بن اسحاق بن عبد اللہ بن جعفر بن ابطالب، علی بن جعفر بن اسحاق بن علی بن عبد اللہ بن جعفر بن ابطالب۔ ان میں سے علی اور زید کے والد حسن بن زید' قاسم کے والد اسحاق بن عبد اللہ اور علی کے والد جعفر بن اسحاق یہ تینوں بزرگ منصور کیساتھ تھے۔[1]

شہادت : جناب نفس ذکیہ نے غسل کیا کافور لگایا اور اپنے تین سو تیرا جانثاروں کے ہمراہ عیسیٰ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ بہادری و شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ تین مرتبہ عیسیٰ کے لشکر کو پسپا ہونا پڑا۔ دوران جنگ نفس ذکیہ کے ایک تیر لگا آپ گر پڑے اور آپ کی روح پرواز کر گئی آپ کی شہادت کے بعد حمید بن قحطبہ آپ کا سر قلم کر کے عیسیٰ کے پاس لے گیا اور جسم کو وہیں چھوڑ دیا جسے نفس ذکیہ کی بہن زینب اور بیٹی فاطمہ نے جنت البقیع میں دفن کیا۔ بقول ابن اثیر "محمد اور ان کے ساتھیوں کے سر عیسیٰ بن موسیٰ نے محمد بن ابی الکرام بن عبد اللہ بن علی بن عبد اللہ بن جعفر بن ابطالب کے ہاتھ منصور کے پاس بھیجے اور فتح کا مژدہ قاسم بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابطالب کے ہاتھ منصور کے پاس بھیجا"۔[2] منصور نے نفس ذکیہ کے سر کو کوفہ میں نصب کرایا اور شہر میں تشہیر کیا۔

یہ لڑائی مدینہ کے قریب مقام جرف میں ۱۵/ رمضان ۱۴۵ھ مطابق ۶/ دسمبر ۷۶۲ء کو ہوئی۔ اس وقت نفس ذکیہ کی عمر پینتالیس ۴۵ سال تھی۔ نفس ذکیہ کے خروج اور شہادت کے درمیان دو ماہ سترہ دن کا عرصہ تھا کیونکہ اول رجب میں خروج کیا اور رمضان کی چودہ راتیں گذاری تھیں کہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

---
[1] نور المشرقین ص : ۲۹۰' [2] تاریخ کامل ص : ۱۳۶ ج : ۵

اولاد : محمد نفس ذکیہ کے چھ بیٹے عبداللہ' علی' طاہر' ابراہیم' حسن اور یحییٰ تھے اور پانچ بیٹیاں فاطمہ' زینب' ام کلثوم' ام سلمہ اور ام سلمہ ایضا تھیں۔ بیٹوں میں عبداللہ جنکا لقب اشتر تھا انکے حالات ذیل میں درج ہیں۔ دوسرے بیٹے علی کو قید کرکے منصور کے روبرو پیش کیا گیا اور غالباً اسکے دربار ہی میں قتل کردیا گیا۔ جبکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مہدی عباسی کے دور میں گرفتار کئے گئے۔ انکی والدہ ام سلمہ بنت حسن بن حسنؑ تھیں۔ انکے اولاد تھی۔ تیسرے بیٹے طاہر کے حالات نہیں ملتے۔ چوتھے بیٹے ابراہیم کے ایک بیٹے کا نام محمد تھا انکے علاوہ دختران بھی تھیں انکی ماں اولاد حسینؑ سے تھیں۔ محمد بن ابراہیم کے بھی اولاد تھی۔ پانچویں بیٹے حسن واقعہ فخ میں میدان جنگ میں زخمی ہوئے پہلے عباسیوں نے انہیں امان دی لیکن بعد میں انکی گردن اڑادی۔ انکے بھی فرزند تھے۔ چھٹے بیٹے یحییٰ یہ مدینہ میں رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ بیٹیوں میں سے فاطمہ کا عقد ان کے چچا کے بیٹے حسن بن ابراہیم بن حسن مثنیٰ سے ہوا۔ اور زینب کا نکاح محمد بن سفاح سے ہوا۔

عبداللہ اشتر : محمد نفس ذکیہ کے فرزند عبداللہ کی کنیت ابو محمد اور لقب اشتر تھا عربی میں اشتر ایسے شخص کو کہتے ہیں جسکے پپوٹے آنکھوں پر جھکے ہوں۔ اشتر سے مراد وہ شخص بھی لیا جاتا ہے جس کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔ ویسے اشتر اسم تفضیلی ہے جو اکبر کے ہم وزن ہے۔[1] چونکہ عبداللہ سب سے بڑے فرزند تھے لہٰذا اشتر مشہور ہوئے۔ آپ کی والدہ سلمہ بنت محمد بن حسن مثنیٰ تھیں۔ آپ کی ولادت کا زمانہ مسلمانوں کی تاریخ کا انتہائی پرآشوب دور تھا۔ ایک طرف بنوامیہ اپنی زوال پذیر حکومت کو بچانے کیلئے کوشاں تھے تو دوسری طرف بنو عباس حصول اقتدار کیلئے جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔

[1] حیات دارین ص : ۱۸

آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت والدین کے علاوہ حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام محمد باقر علیہما السلام نے بھی فرمائی۔ جس کے اثرات آپ کی زندگی میں نمایاں رہے۔ آپ زاہد و متقی تھے۔

جب نفس ذکیہ نے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو دین کی تبلیغ اور حمایت اہلبیت کی دعوت کیلئے مختلف علاقوں میں بھیجا تو عبداللہ اشتر کو بصرہ روانہ کیا اور ہدایت کی کہ گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے سندھ کی طرف نکل جائیں لہٰذا عبداللہ نے بصرہ سے عمدہ و اعلیٰ نسل کے گھوڑے خریدے اور چند جانثاروں کے ہمراہ بحری جہاز کے ذریعے سندھ پہنچے۔ والئی سندھ عمر بن حفص بن عثمان سے جب آپ کی ملاقات ہوئی تو وہ آپ سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ گھوڑوں کی خرید و فروخت میں آپ کی مدد کریں۔ چند روز بعد آپ کے ساتھیوں میں سے ایک نے والئی سندھ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ "گھوڑوں کے متعلق جو آپ نے حکم دیا ہے اس کا میں مشکور ہوں مگر اس سے زیادہ بہتر چیز آپکے سامنے پیش کرتا ہوں جو دنیا و آخرت دونوں میں آپ کیلئے باعث نجات ہے" چونکہ عمر بن حفص پہلے ہی اہلبیت کا حامی تھا لہٰذا اس نے خوشی یہ دعوت قبول کرلی اور ان لوگوں کو مخفی و محفوظ جگہ پر رکھا اور اپنے معتمدین سے مشورے کے بعد آپ کی بیعت کیلئے ایک جمعرات کا دن مقرر کیا ایک سفید علم تیار کرایا اور جناب عبداللہ کیلئے سفید کپڑے بنوائے جنہیں پہن کر آپ کو خطبہ دینا تھا۔

بیعت لینے کا مقررہ دن آیا' تمام انتظامات مکمل ہوگئے تھے۔ سوئے اتفاق سے اسی دن بغداد سے ایک جہاز آیا جس میں ایک عراقی تاجر عمر بن حفص کی زوجہ کا خط لایا تھا۔ اس خط میں تحریر تھا کہ محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم دونوں شہید ہوئے۔ عمر یہ خط لیکر عبداللہ کے پاس پہنچا اور آپ

کے والد اور چچا کی تعزیت کی۔ اس صورتحال سے عبداللہ متفکر ہوگئے۔ عمر نے ان کو تسلی دی اور کوشش کرکے پڑوسی ہندو راجہ کے ہاں آپکی رہائش کا بندوبست کیا۔ اس راجہ کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ راجہ خود مختار' قول کا پکا' بات کا دھنی اور قابل بھروسہ تھا۔ جب آپ راجہ کے پاس پہنچے تو اس نے آپکی بڑی عزت کی اور ہر طرح سے آپ کے آرام و آسائش کا بندوبست کیا۔ آپ وہاں عبادت الٰہی اور تبلیغ دین میں مشغول رہتے تھے۔ جوں جوں لوگوں کو آپ کی بابت علم ہوتا رہا وہ آپ کے پاس جمع ہوتے رہے تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے عقیدت مندوں کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی۔

عبداللہ اشتر نے سندھ میں تقریباً نو دس سال گذارے۔ یہیں پر آپ کے ایک فرزند محمد پیدا ہوئے جن کی نسبت سے آپ کی کنیت ابو محمد ہوئی۔ جب ۱۵۱ھ میں منصور دوانقی کو آپ کا علم ہوا تو اس نے عمر بن حفص سے جواب طلبی کی اور عمر کو سندھ سے ہٹا کر افریقہ کا گورنر مقرر کیا۔ اس کی جگہ ہشام بن عمر تغلبی کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ جب ہشام دربار خلافت سے رخصت ہوا تو منصور نے اسے خصوصی ہدایت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو عبداللہ اشتر کو گرفتار کرے خواہ اس کے لئے اسے راجہ کی ریاست پر حملہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

ہشام سندھ پہنچا' حالات کا جائزہ لیا۔ چونکہ ہشام کے دل میں اہلبیت کیلئے نرم گوشہ تھا لہٰذا وہ عبداللہ کو کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ خلیفہ کے حکم کی تعمیل نہ کرنے کے نتائج سے بھی خوب واقف تھا لہٰذا اس نے یہ مشہور کیا کہ وہ راجہ سے خط و کتابت کر رہا ہے اور یہی اطلاع منصور کو بھی بھیجتا رہا۔ اسی دوران ایک مقام پر سورش ہوگئی جس کو فرو کرنے کیلئے اس نے اپنے بھائی سیح (سفیح) کو فوج کے ایک دستہ کے ہمراہ روانہ کیا۔ یہ فوجی دستہ راجہ کی سرحد کے قریب سے گذر رہا تھا کہ

دور سے ایک غبار نظر آیا سیح نے غنیم کی فوج سمجھ کر مقابلہ کی تیاری کی لیکن جب غبار چھٹا تو اس میں سے صرف دس سوار برآمد ہوئے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ عبداللہ اشتر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیر و شکار کو نکلے ہیں۔ سیح نے ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا اس پر اسکے آدمیوں میں سے چند نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ خاندان رسالتمآبؐ سے ہیں بلاوجہ ان کا خون نہ بہاؤ مگر وہ نہ مانا۔ ان پر حملہ کردیا تب عبداللہ اور انکے ساتھیوں نے مقابلہ کیا۔ بڑی بہادری سے جنگ کی۔ مولانا ابو ظفر ندوی تحریر کرتے ہیں کہ :

"یہانتک کہ ایک ایک کرکے ان کے ساتھی سب مارے گئے اور خود بھی دو ساتھیوں کے بیچ میں گر کر آخرت کی راہ لی' ان کی لاش مقتولیں میں کچھ اس طرح مشتبہ ہوگئی کہ معلوم نہ کی جاسکی' اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ دریائے سندھ میں ان کے طرفداروں نے ان کی لاش کو اس لئے ڈال دیا کہ ان کا سر کاٹ کر خلیفہ کے پاس لوگ نہ بھیج سکیں۔"

(تاریخ سندھ ص : ۱۵۶ مطبوعہ اعظم گڑھ)

مذکورہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سر قلم نہیں کیا گیا جبکہ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھیج دیا گیا جیسا کہ مولانا سبط شبر کے اس بیان سے بھی واضح ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ :

"حضرت عبداللہ شاہ غازی کا سر تن سے جدا کرکے منصور کے پاس بھیج دیا گیا اور جسم کو بعد میں شاہ غازی کے چاہنے والوں نے ایک پہاڑی پر دفن کردیا جو کہ آج بھی خوبصورت ساحل سمندر کلفٹن میں ایک پہاڑی پر دفن ہے۔ ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ شاہ غازی کا سر کہاں دفن ہے؟ تاریخ خاموش ہے" (حیات دارین ص : ۳۸)

دور حاضر میں عبداللہ اشتر کو عبداللہ شاہ غازی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کلفٹن میں جس پہاڑی کی چوٹی پر آپ کا مزار ہے اسی پہاڑی میں عین مزار کے نیچے ایک غار میں میٹھے پانی کا چشمہ ہے گو کہ کراچی کی وسیع و عریض حدود میں شاید ہی کہیں میٹھا پانی میسر آئے جبکہ سمندر کے کنارے

پر میٹھے پانی کے چشمہ کا وجود اللہ کی رحمت اور صاحب مزار کی برکت کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس خاکسار نے ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ اس مزار کی زیارت کی تھی اور چشمہ پر جا کر پانی پیا تھا جو شفاف اور میٹھا تھا۔ اُس زمانہ میں کلفٹن پر رؤسا کی چند کوٹھیاں تھیں اور ایک لال پتھر کی بڑی خوبصورت عمارت تھی جو " مہتا پیلس " کہلاتی تھی۔ اس عمارت میں وزارت خارجہ کے دفاتر تھے۔ بقیہ تمام علاقہ ریتیلا چٹیل میدان تھا۔ اُس وقت مزار بھی انتہائی سادہ تھا۔ جبکہ آج کلفٹن کا علاقہ شہر کا بہترین علاقہ بن گیا ہے ہر طرف بلند و بالا عمارتیں' خوبصورت بنگلے اور وسیع کوٹھیاں تعمیر ہو گئی ہیں۔ عبداللہ شاہ غازی کے عقیدت مندوں نے مزار کو جدید طرز تعمیر سے آراستہ کر دیا ہے۔ اندرونی وبیرونی دیواریں ٹائلز اور پچکاری سے مزین ہیں۔ مزار پر جانے کے لئے خوبصورت و آرام دہ سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جن سے تھکان کا احساس نہیں ہوتا۔

عبداللہ شاہ غازی نے ایک کنیز کو شرف زوجیت بخشا جن سے آپ کے فرزند محمد تولد ہوئے۔ اور محمد کابلی کہلائے۔ محمد اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کیلئے منصور نے راجہ پر حملہ کرایا۔ راجہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ہشام تغلبی نے محمد کو گرفتار کر کے فوجی دستے کی نگرانی میں منصور کے پاس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد محمد کو بغداد سے مدینہ بھجوادیا گیا۔ بقول مولانا سبط شبر زیدی' محمد کابلی نے طویل عمر پائی۔ محمد کابلی کے پانچ بیٹے طاہر' علی' احمد' ابراہیم اور حسن اعور جواد تھے۔ محمد کی نسل پانچویں بیٹے حسن جواد سے چلی جو انتہائی متقی تھے اور ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ حسن جواد کے چار بیٹے ابو جعفر محمد' ابو عبداللہ حسین' ابو محمد عبداللہ اور قاسم تھے۔[1]

[1] حیات دارین ص : ۹۲

اسپین میں علوی حکومت : الناصر علی بن حمود نے ماہ محرم ۴۰۷ھ میں اسپین میں علوی حسنی سادات کی بنیاد رکھی لیکن ماہ ذیقعدہ ۴۰۸ھ میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی مامون قاسم تخت نشین ہوا جو ۴۱۲ھ میں معذول کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا یحیٰی بن الناصر علی بن حمود المعتلی حکمران ہوا جسے ایک سال سات ماہ کے بعد قتل کر دیا گیا۔

طبرستان میں علوی حکومت : اس حکومت پر صرف چھ حکمران گذرے ان میں سے تین اولاد امام حسینؑ سے اور تین امام حسنؑ کی اولاد میں سے تھے۔ اولاد امام حسینؑ سے ہشام داعی حق حسن بن زید بن محمد بن اسمٰعیل بن حسین بن زید بن جواد بن حسن بن حسین بن علی نے ۲۵۰ھ میں مقام رے اور ویلم پر اپنی بادشاہت قائم کی۔ اسکے بعد اس کا بھائی قائم حق محمد حکمران ہوا جسے ۲۸۸ھ میں قتل کر دیا گیا اور پھر اس کا دوست مہدی حسن بن زید قائم بالحق بادشاہ ہوا اس کے بعد امام حسنؑ کی اولاد میں سے تین حکمران ہوئے۔ (تاریخ الخلفاء ص : ۵۱۸)

ابراہیم بن عبداللہ محض : مورخین نے ابراہیم کی کنیت ابوالحسن لکھی ہے جبکہ انکے والد عبداللہ کے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی کنیت ابوالقاسم تھی۔ ابراہیم اپنے بھائی محمد نفس ذکیہ کے ساتھ روپوش رہے۔ جب نفس ذکیہ نے ظہور فرمایا تو ابراہیم کو بصرہ روانہ کیا بقول ابن سعد ابراہیم یکم رمضان ۱۴۵ھ کو بصرہ میں داخل ہوئے ان کے ساتھ فقہاء کی ایک جماعت تھی جن میں عیسیٰ بن یوسف' معاذ بن معاذ' عباد بن عوام' اسحاق بن یوسف' ارزق اور معاویہ بن ہیثم بن بشیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے علماء کے ایک گروہ کیساتھ منصور کے خلاف خروج کیا۔ بصرہ میں ایک انبوہ کثیر ابراہیم کے ساتھ ہو گیا اور لوگ جوق درجوق ان کی طرف مائل ہونے لگے ابراہیم کے پاس تقریباً ایک لاکھ کا لشکر ہو گیا۔ اہواز و فارس ابراہیم کے قبضہ میں آگئے۔

جب ابراہیم کو نفس ذکیہ کی شہادت کی خبر ملی تو وہ منصور سے جنگ کرنے کیلئے بیتاب ہو گئے۔ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ بصرہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ شعبی کے بیان کے مطابق کوفہ سے سولہ فرسخ کے فاصلہ پر مقام باخمری میں ابراہیم اور عباسی فوجوں کا سامنا ہوا جنگ شروع ہوئی۔ ابراہیم کو لوگوں نے مشورہ دیا کہ عیسیٰ کے لشکر پر شب خون ماریں۔ ابراہیم نے اسے پسند نہیں کیا اس پر لوگ بد ظن ہو گئے۔[1] شعبی کا بیان ہے کہ ابتداء میں منصور کے لشکر کو شکست ہوئی ابراہیم کی کامیابی ظاہر تھی لیکن اچانک کسی طرف سے ایک تیر آیا اور اپنا کام کر گیا ابراہیم زمین پر گرے اور کہنے لگے۔ " امر الٰہی مقدر ہو چکا ہے ہم کچھ ارادہ کرتے ہیں اور خدا کا ارادہ کچھ اور ہوتا ہے" ابراہیم کے گرتے ہی ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ عیسیٰ کے آدمیوں نے ابراہیم کا سر قلم کر کے عیسیٰ کو پیش کیا پھر وہ سر منصور کے پاس بھجوا دیا گیا۔ ابراہیم کی شہادت پیر کے دن ۲۵ ذیقعدہ ۱۴۵ھ کو ہوئی شہادت کے وقت ابراہیم کی عمر اڑتالیس (۴۸) سال تھی۔

جب ابراہیم کا سر منصور کے پاس پہنچا تو پہلے اس نے سر کو شہر میں گشت کرایا پھر ربیع کے ذریعہ ابراہیم کے باپ عبداللہ کے پاس قید خانہ میں بھیجا۔ جب ربیع وہاں پہنچا تو عبداللہ نماز پڑھ رہے تھے۔ ربیع نے کہا جلدی نماز ختم کرو۔ عبداللہ نے نماز ختم کی سلام پھیر اپنے بیٹے کے سر کو دیکھا تو اٹھا لیا اور گود میں رکھ کر کہا " خدا تجھ پر رحمت نازل کرے' اے ابوالقاسم اھلا وسہلا بیشک تم نے اللہ کے عہد و میثاق کو پورا کیا" ربیع نے دریافت کیا " ابوالقاسم تمہارے نزدیک کیسا تھا" عبداللہ نے جواب دیا جیسا کہ اس شعر میں کہا گیا ہے۔

[1] تذکرۃ الخواص ص : ۲۷۸

فتی کان تحمیہ من الذل سیفہ

ویکفیہ سوات الذنوب اجتنابھا

ترجمہ : ایسا جوان تھا کہ اس کی تلوار ذلت سے بچاتی اور گناہوں سے ان کا اجتناب کافی ہے۔

اس کے بعد عبداللہ نے ربیع سے کہا " اپنے صاحب سے جا کر کہنا کہ ہماری تنگی و ترشی اور تیری ناز و نعمت کے دن گذر گئے ہیں۔ ہماری ملاقات قیامت کو ہو گی اور خدا فیصلہ کرنے والا ہو گا"۔ ربیع کا بیان ہے کہ " میں نے عبداللہ کا پیغام ابو جعفر کو پہنچایا۔ میں نے اسے کبھی متاثر نہیں پایا جتنا میرے اس کہنے سے متاثر ہوا۔"[1] پھر ابراہیم کے سر کو منصور نے کوفہ میں نصب کرادیا۔

مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم دونوں شہید ہو چکے اور ابراہیم کا سر مبارک منصور کے دربار میں پیش کیا گیا تو اس سر کو دیکھتے ہی منصور بلبلا کر رو پڑا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ منصور کے آنسو ابراہیم کے رخسار پر گر رہے تھے۔ منصور روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ :

" قسم ہے خدا کی جو مشکل پیش آئی میرے لئے سخت ناگوار ہے مگر کیا جائے ابراہیم ! تم ہمارے ساتھ جتلا کئے گئے اور میں تمہارے ساتھ جتلا ہوا " (تاریخ کامل ص : ۲۱۲ ج : ۵)

پھر دربار عام منعقد ہوا خلیفہ کے حاشیہ نشین یکے بعد دیگرے داخل ہوتے جاتے تھے اور ابراہیم کے حق میں سخت و سست کہتے جاتے تھے مگر منصور خاموش بیٹھا رہا۔ جب جعفر بن حنظلہ آیا اور خلیفہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا " اپنے چچازاد بھائی کیساتھ جو سلوک آپ نے کیا خدا اس کا آپ

[1] منتہی الامال ص : ۳۳۹ ج : ۱

کو اجر دے اور اُن سے آپ کے حق میں جو زیادتی ہوئی اسے معاف فرمائے"[1] اس پر منصور منتشر ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بدبخت نے منصور کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ابراہیم کے چہرے پر تھوک پھینکا اس پر منصور برہم ہوگیا۔ غصہ میں اس نے چوبدار کو حکم دیا کہ اس کی ناک توڑ دو اور اس مردود کی ٹانگ گھسیٹتے ہوئے باہر پہنچاؤ۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

اس قسم کے واقعات کو ایک مخصوص نظریہ رکھنے والے مصنفین و مورخین شاہی کی طرفداری میں بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ اگر مذکورہ بالا واقعہ کو درست تسلیم کرلیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ واقعی منصور کی آنکھوں سے نکلے والے آنسو مگرمچھ کے آنسو نہ تھے بلکہ حقیقی تھے تو پھر ابراہیم کے سر کا شہر میں گشت کرانا' باپ کے پاس قید خانے بھجوانا' کوفہ میں آویزاں کرنا' اولاد ابطالب پر مظالم جاری رکھنا' علماء و فقہا کو اذیت پہنچانا یہ سب کچھ کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رائے عامہ کی خوشامد و چاپلوسی کے لئے اس قسم کے مظاہرے کئے جاتے تھے اور شاہی کے طرفدار مصنفین و مورخین شاہوں کے ایسے افعال کو بہترین انداز میں تحریر کرتے ہیں تاکہ ان کی برائیوں کی پردہ پوشی ہوسکے۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی:

" تجربات و مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ سیاسی اقتدار کی باگ قوم کے جن افراد کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ ان میں مطلق العنانی کا احساس ہو عتار ہتا ہے جس کے تحت وہ فرعون بے سامان بننے میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ ان کا ہر ایک پر دباؤ ہوتا ہے جبکہ وہ ہر دباؤ سے آزاد ہوتے ہیں ان کے خلاف کوئی زبان نہیں کھول سکتا۔ بلکہ ان کی ہر برائی کو خوشنما تعبیروں میں پیش کرنے والے ہر زمانہ میں پیدا ہو جاتے

[1] تاریخ کامل ص: ۲۱۲ ج: ۵

ہیں۔ اور جن کی زندگی اندر سے باہر تک عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ لیکن نظم و نثر میں مداحوں کا ایک طبقہ انکی ساری برائیوں کی پردہ پوشی کرتا رہتا ہے اور یہ انتہائی خطرناک صورتحال ہوتی ہے۔" (امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ص: ۳۳۸)

محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم کی شہادت کے بعد منصور نے اولاد ابطالب پر جو مظالم ڈھائے وہ تو اپنی جگہ لیکن بقول علامہ جلال الدین سیوطی " منصور نے ان علماء کو بھی سخت تکلیفیں پہنچائیں جنہوں نے محمد و ابراہیم کے ساتھ خروج کیا تھا یا خروج کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ اکثر علماء کو قتل کیا اور بیشتر عالموں کو سخت ترین تکالیف میں مبتلا کیا۔ ان مظلوم علماء میں امام اعظم ابو حنیفہ' عبدالحمید بن جعفر' ابن عجلان کے نام سرفہرست ہیں کیونکہ انہوں نے محمد و ابراہیم کے ساتھ ہو کر خروج کرنے کا فتویٰ دیا تھا اور انہی مظلومین میں مالک بن انس کا نام بھی شامل ہے"[1]

اولاد ابراہیم : ابراہیم بن عبداللہ محض کے دس بیٹے محمد اکبر' طاہر' علی' جعفر' محمد اصغر' احمد اکبر' احمد اصغر' عبداللہ' حسن اور ابو عبداللہ تھے۔ محمد اکبر کا لقب کشاش تھا۔ دیگر بیٹوں میں طاہر' علی' احمد اصغر' ابو عبداللہ اور عبداللہ مصر چلے گئے وہیں آباد ہوئے اور مصر میں ہی ان کی نسل پھیلی۔ محمد اکبر کے دو بیٹے تھے۔ جعفر کے ایک بیٹا زید تھا۔ محمد اصغر شاعر تھا اس کے بھی اولاد تھی۔

موسیٰ بن عبداللہ محض : موسیٰ کی کنیت ابوالحسن اور لقب جون تھا۔ ان کی ماں ہند بنت ابو عبیدہ بن عبداللہ تھیں۔ یہ ادیب و شاعر تھے۔ منصور نے انہیں بھی انکے والد کے ساتھ قید کیا ہوا تھا۔ قید خانہ میں عبداللہ محض کو منصور دوانقی کا پیغام ملا کہ قیدیوں میں کسی ایک کو

[1] تاریخ الخلفاء ص: ۲۹۴

اسکے پاس بھیجیں پیغام میں یہ بھی باور کرایا گیا کہ وہ شخص انکے پاس واپس نہیں پہنچے گا جس کا مطلب تھا کہ اسے قتل کردیا جائیگا۔ عبداللہ محض کے بچوں نے اس قربانی کیلئے اپنے آپ کو پیش کیا مگر عبداللہ نے کہا کہ " میں اپنے جون کی خاطر اپنے بچوں کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔" چنانچہ انہوں نے اپنے کم سن بیٹے موسیٰ کو منصور کے پاس بھجدیا۔ مورخین نے موسیٰ کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ " جب میں دربار میں پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی منصور نے حکم دیا کہ اسے ایک ہزار کوڑے مارو۔ چنانچہ مجھے کوڑے مارے گئے حتیٰ کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو مجھے میرا ہی خون پینے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنے بھائیوں محمد و ابراہیم کو تلاش کر کے لاؤں۔ مجھے ایک خط دیکر مدینہ بھجدیا گیا۔" اس طرح موسیٰ جون کو قید سے رہائی ملی۔ اس کے بعد کے واقعات کا ذکر نہیں ملتا۔ انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔[1]

اولاد موسیٰ : موسیٰ جون کے بیٹے عبداللہ اور انکے بیٹے موسیٰ ثانی تھے جنکی ماں امامہ بنت طلحہ فزاری تھیں۔ موسیٰ ثانی کی کنیت ابو عمرو تھی اور یہ راوی حدیث تھے بقول مسعودی انکو سعید الحاجب نے بصرہ میں قتل کیا اور انکے بیٹے ابراہیم کو والئی مدینہ محمد بن احمد نے بزمانہ معتدی قید کردیا موسیٰ جون کے ایک پوتے کا نام صالح تھا انکے ایک بیٹی دلفاء اور چار بیٹے تھے جن میں سے تین بیٹے دوسرے مقام پر جاکر آباد ہوئے جبکہ ایک بیٹے کا نام محمد اور کنیت ابو عبداللہ تھی یہ شہید مشہور ہیں ان کی قبر بغداد میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

موسیٰ جون کی نسل میں بڑے بڑے اولیاء اللہ گذرے ہیں۔ شجرجات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر کے چند عظیم صاحب کشف

[1] نورالمشرقین من حیات الصادقین ص: ۲۷۹

و کرامات بزرگان انہی کی اولاد میں سے تھے مثلاً ایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مادر گرامی بی بی ماہ نور ہیں جنکا سلسلہ نسب اسطرح ہے بی بی ماہ نور بنت داؤد بن ابی عبداللہ بن یحییٰ زاہد بن محمد مورث بن داؤد بن موسیٰ ثانی بن عبداللہ بن موسیٰ جون بن عبداللہ محض۔ دوسرے مخدوم علاء الدین احمد صابر کلیری' سرگروہ سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ ہیں آپ کا مزار کلیر شریف (یوپی ہندوستان) میں ہے۔ آپ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے بھانجہ و داماد تھے اور سلسلہ تصوف میں آپکے خلیفہ تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ علاء الدین احمد عبدالرحیم بن عبدالسلام بن سیف الدین بن عبدالوہاب بن ابوصالح موسیٰ بن ابی عبداللہ بن یحییٰ زاہد بن محمد مورث بن داؤد بن موسیٰ ثانی بن عبداللہ بن موسیٰ جون بن عبداللہ محض۔ تیسرے سید عبداللہ شاہ المعروف بہ بھلے شاہ ہیں جو موسیٰ جون کی بائیسویں پشت سے ہیں۔

یحییٰ بن عبداللہ محض : یحییٰ کی کنیت ابوالحسن تھی ان کی ماں کا نام قریبہ بنت عبداللہ اکبج بن ابو عبیدہ تھا۔ یہ جلیل القدر اور صاحب فضیلت بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی محمد نفس ذکیہ کے خروج میں حصہ لیا۔ نفس ذکیہ کی شہادت کے بعد حکمرانوں کو ان کی تلاش ہوئی انکی گرفتاری کیلئے بڑی کوشش کی گئی لیکن بقول ابوالفرج اصفہانی یہ امن کی تلاش میں شہر بہ شہر حیران و سرگرداں پھرتے رہے۔ مگر سرکاری کارندوں نے کہیں چین نہ لینے دیا۔ آخرکار انہوں نے فضل بن یحییٰ برمکی سے رابطہ کر کے اسے اپنے حالات سے آگاہ کیا اور اپنی جائے رہائش کی بات بتایا۔ جس کے جواب میں فضل نے مشورہ دیا کہ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ لہٰذا یہ چلتے چلاتے دیلم پہنچے مگر انہیں وہاں بھی امن نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً انہوں نے بھی میدان جنگ کی موت کو قبول کرتے ہوئے ۱۷۶ھ میں خروج کیا اور صاحب دیلم کہلائے۔

ہمارے اس دعوے کی تاریخ مشاہد ہے کہ حکمران اور انکے زر خرید کارندے آل ابیطالب کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے شدید مظالم کرتے تھے اور جب یہ لوگ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے اصول پر کاربند ہوتے تو کہا جاتا کہ "آئے دن کی شورش سے علویوں نے خلفاء کو تنگ کر رکھا ہے۔"

یحیٰ بن عبد اللہ کے خروج کا اعلان کرتے ہی مشرقی ملکوں کے بہت سے باشندے ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور چند دنوں میں ان کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ ہارون کو فضل بن یحیٰ برمکی کو ان کے مقابلے کیلئے مامور کرنا پڑا۔ برمکی خاندان اہلبیت کا ہمدرد تھا اس لئے فضل نے لڑنے کے بجائے حسن تدبیر سے یحیٰ کو صلح پر آمادہ کر لیا اور یہ شرط قرار پائی کہ خود ہارون رشید ان کو امان لکھ کر دیگا جس پر قضاۃ' فقہاء اور عمائدین بنی ہاشم کے دستخط ہوں گے۔ ہارون نے یہ شرطیں مان لیں اور انعام و اکرام سے بھی نوازا لیکن اپنے پیش رو خلفاء کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بعد میں یحیٰ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔[1]

اولاد یحیٰ: یحیٰ بن عبد اللہ کے سات بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ان کا ایک بیٹا محمد مدینہ میں ہارون کے عہد میں قید کیا گیا اور وہ قید ہی میں فوت ہو گیا۔ بقیہ تمام بیٹے مصر چلے گئے اور وہیں آباد ہوئے۔

سلیمان بن عبد اللہ محض: سلیمان کی کنیت ابو محمد تھی۔ یحیٰ اور سلیمان ماں جائے بھائی تھے۔ یہ حسین بن علی کے ہمراہ میدان فخ میں، لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ وقت شہادت ان کی عمر ترپن (۵۳) سال کی تھی۔ ان کے نو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں ان میں سے دو بیٹے عبد اللہ اور محمد باپ کی شہادت کے بعد مغرب کی طرف چلے گئے ان کی نسل وہیں پھیلی۔ البتہ محمد کے ایک پوتے عبد اللہ بن سلیمان بن محمد بن سلیمان کوفہ واپس آئے۔ یہ جلیل القدر عالم و محدث تھے۔

[1] الفخری ص: ۱۷۶

ادریس بن عبد اللہ محض: ادریس کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ ادریس' عیسیٰ اور داؤد ماں جائے بھائی تھے ان کی ماں عاتکہ بنت عبد الملک بن حرث تھیں۔ ادریس بھی اپنے دیگر برادران کے ہمراہ میدان فخ میں شریک تھے۔ فخ میں شکست کے بعد یہ بچ کر مصر پہنچے۔ وہاں محکمہ ڈاک کا افسر اعلیٰ جس کا نام "واضح" تھا ادریس پر مہربان ہو گیا اس نے ادریس کو ڈاک کے گھوڑوں پر ملک بربر بھیجدیا۔ آل رسول کے ساتھ ہمدردی کرنے کے جرم میں خلیفہ نے "واضح" کو قتل کرا دیا۔ بربر پہنچ کر ارض طنجہ کے شہر ولیلہ میں ادریس نے قیام کیا۔ یہاں کے بربر ان کے معتقد ہو گئے جن کی مدد سے ادریس نے یہاں اپنی طاقتور سلطنت قائم کی جو ادریسی سلطنت کہلائی اور جس کی اپنی تاریخ ہے۔

ادریسی سلطنت: یہ سلطنت ۱۷۲ھ ۷۸۸ء تا ۳۱۰ھ ۹۲۲ء تقریباً ایک سو سینتیس (۱۳۷) سال قائم رہی اور بقول سلطان مرزا صاحب اس کے دس حکمران ہوئے۔[1] لیکن جسٹس امیر علی صاحب نے تسلسل سے ان حکمرانوں کے واقعات لکھے ہیں انکی تعداد آٹھ بنتی ہے۔[2] بہر حال ادریس نے وہاں ایک شہر تعمیر کرایا جس کا نام "فیض" رکھا اور اسے اپنا دار الخلافہ قرار دیا۔ اس کے درخشاں انتظام و انصرام کی وجہ سے فیض شہر جلد تعلیم و تمدن کا مرکز بن گیا۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق مغربی علاقہ جات میں عباسی حکمرانی کو سخت دھچکا لگا۔ لہٰذا ہادی عباسی نے ایک خاص قسم کا زہر اپنے غلام شماخ کے سپرد کر کے اسے ادریس کی طرف بھیجا اور ہدایت کی کہ پہلے تو وہ اپنے آپ کو اہلبیت کا دوست ظاہر کرے اور ادریس سے تعلقات بڑھائے۔ اور موقع پا کر ادریس کو زہر دیدے۔ شماخ نے ہدایت پر عمل کیا۔ ایک روز ادریس نے

[1] نور المشرقین ص: ۳۲۱' [2] شارٹ ہسٹری آف سارا سینس ص: ۵۸۱

اپنے دانتوں میں درد ہونے کی شکایت کی۔ شماخ نے زہر آلود منجن ادریس کو یہ کہہ کر دیا کہ اسکو صبح استعمال کریں اور وہ خود راتوں رات وہاں سے بھاگ نکلا۔ صبح جب ادریس نے وہ منجن استعمال کیا تو اس کے خون جاری ہو گیا۔ زہر اپنا کام کر گیا۔ شماخ کو تلاش کرایا تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس طرح ادریس بن عبد اللہ محض کی وفات ہوئی۔

ادریس نے ۱۷۵ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا نوعمر بیٹا جس کا نام بھی ادریس تھا اپنی ماں اور وزیر غالب کی سرپرستی میں تخت نشین ہوا اور ادریس ثانی کہلایا۔ بڑا ہو کر یہ ادریس ثانی ایک عظیم سپہ سالار ثابت ہوا جس نے جنوب کی طرف وسیع فتوحات حاصل کیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ادریس اول کی وفات کے بعد ادریس ثانی پیدا ہوا اور اس نے ادریسی سلطنت قائم کی۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ واقعات کے تسلسل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۶۹ھ میں واقعہ فخ رونما ہوا جس میں ادریس اول شریک تھا۔ ۱۷۰ھ میں ادریس بربر پہنچا اور ۱۷۲ھ میں ادریسی حکومت قائم ہوئی اور ۱۷۵ھ میں ادریس اول نے وفات پائی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ادریس بن عبد اللہ محض یا ادریس اول ہی ادریسی سلطنت کا بانی تھا۔ جسٹس امیر علی کے درج ذیل بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے:

> **"In the reign of Hadi, Idris, a descendent of Hassan I., esaped into Western Mauritania, and there, with the assistance of the Barbar tribes, who accepted him as ther chief and Imam, estiblished a powerful kingdom, which for a long time flourished in Northern Africa."** **(History of Saracens P: 581)**

ترجمہ: "ہادی عباسی کے عہد حکومت میں حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں سے ادریس بھاگ کر مغربی ماریتانیہ پہنچے جہاں کے بربر قبائل نے انھیں اپنا سردار و امام تسلیم کر لیا۔ ان قبائل کی مدد سے ادریس نے وہاں طاقتور سلطنت قائم کی جو شمالی افریقہ میں عرصہ دراز تک قائم رہی"۔

ادریس اول کے بیٹے ادریس ثانی نے اس سلطنت کو قوت اور وسعت بخشی۔ ادریس ثانی کی بابت حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا۔" خدا رحمت کرے ادریس بن ادریس پر کہ وہ نجیب شجاع اہلبیت تھے۔"[1]

۲۱۳ھ میں ادریس ثانی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد خلیفہ ہوا۔ اس نے اپنے زمانہ میں صوبوں کی گورنری اپنے خاندان کے افراد کے سپرد کی۔ محمد بن ادریس ثانی کا انتقال ۲۲۱ھ میں ہوا۔ اسکے بعد اسکا بیٹا علی صرف نو سال کی عمر تخت نشین ہوا۔ اسکی تخت نشینی کو تمام لوگوں نے صدق دل سے تسلیم کیا اور اسکے والد کے وفاداروں نے انتہائی کامیابی سے اس کی حکومت کو چلایا جس کی بابت مورخین کو لکھنا پڑا "اس کا زمانہ بے حد خوشحال تھا۔" بائیس سال کی عمر میں علی بن محمد کا انتقال ہوا جس کے بعد اس کا بھائی یحیٰ بن محمد خلیفہ ہوا۔ اپنے طویل دور حکومت میں اس نے ہر سمت اپنی طاقت میں اضافہ کیا اور مملکت کو دولت و خوشحالی میں ترقی کی راہ پر گامزن کیا اس نے فیض شہر کو وسعت و زیبائش عطا کی جس کے باعث ہر طرف سے لوگ گروہ در گروہ یہاں آکر آباد ہوئے۔ یحیٰ بن محمد کا انتقال ۲۶۳ھ میں ہوا اور اس کا بیٹا یحیٰ اس کا جانشین مقرر ہوا۔ یحیٰ کے زمانہ میں بغاوت ہوئی اور اسے بھاگ کر اسپین جانا پڑا۔ اسپین ہی میں اسکا انتقال ہوا۔ اسکی تخت سے دستبرداری کے بعد اس کا چچا زاد بھائی علی بن عمر تخت نشین ہوا۔ جسکے زمانہ میں خارجیوں نے سر اٹھایا اور اسے بھی اسپین میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اسکے چلے جانے کے بعد فیض کے

[1] منتھی الامال ص: ۳۱۳ ج: ۱

لوگوں نے ادریس ثانی کے پوتے جسکا نام بھی یحییٰ تھا اور یہ قاسم بن ادریس ثانی کا بیٹا تھا۔ کو اپنا امام و خلیفہ بنایا۔ یہ صاحب علم، فقیہہ اور قدیم روایات کا عالم تھا۔ اس نے ادریسی حکومت کو استحکام دینے کی کوشش کی لیکن ایک فاطمی گورنر "مکناسا" نے ٣٠٩ھ کو اچانک اس کی حکومت کو ختم کردیا اور اسے مملکت سے نکال دیا۔ اسکے بعد یحییٰ سوئم نے گوشہ نشینی اختیار کی اور اپنے انتقال ٣٣١ھ تک مہدیہ میں قیام کیا۔ یحییٰ سوئم کے زوال کے ساتھ ہی ادریسی خلافت ختم ہوگئی۔

ابراہیم بن حسن مثنیٰ : ابراہیم کی کنیت ابوالحسن تھی۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت حسینؑ ابن علیؑ تھیں۔ یہ اپنے فضائل و محاسن اور شرافت و سخاوت کے باعث غمر کے لقب سے مشہور تھے۔ اور راوی حدیث تھے۔ کوفہ میں پانچ سال محبوس رہے قید و بند کا یہ زمانہ نہایت رنج و غم اور تکلیف و اذیت میں گذارا۔ ربیع الاول ١٤٥ھ میں زندان ہی میں انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر انہتر ٦٩ سال تھی۔ ابراہیم کے چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ جن کے نام یعقوب، محمد اکبر، محمد اصغر، اسحٰق، علی، اسمٰعیل، رقیہ، خدیجہ، فاطمہ، حسنہ اور ام اسحاق تھے۔ ان میں سے محمد اصغر اپنی خوبصورتی کی وجہ سے دیباج اصغر کہلاتے تھے انکی ماں کا نام عالیہ تھا جو ام ولد تھیں یہ بھی منصور کی قید میں رہے منصور نے انھیں پتھر کے ستون میں چنوا دیا۔ ابراہیم کے ایک بیٹے اسمٰعیل دیباج اکبر کے لقب سے مشہور تھے ابو الفرج نے ان کا لقب طباطبا اور ماں کا نام ربطہ بنت محمد بن عبداللہ بن عبداللہ بن ابی لیۃ لکھا ہے[1] یہ بھی دیگر اولاد ابطالب کے ہمراہ منصور کی قید میں رہے۔ رہائی کے بعد جنگ فخ میں شرکت کی۔ ان کے ایک بیٹے اسحاق تھے جنکے دو بیٹے حسن اور ابراہیم

[1] مقاتل الطالبین ص: ١٣٥

تھے۔ حسن غازیان فخ میں سے تھے انھیں ہارون نے بائیس سال قید میں رکھا ہارون کی موت کے بعد انھیں رہائی ملی۔ رہائی کے تین سال بعد تیرسٹھ ٦٣ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی اولاد میں ابو عبداللہ تاج الدین محمد بن ابی جعفر القاسم بن الحسین بن الحسنی الدیباجی الحلی معروف بابن معیہ جلیل القدر، عالم و فاضل تھے۔ انساب، معرفت، رجال، فقہ، حدیث، ریاضی وغیرہ کی کثیر کتب کے مصنف تھے۔ آپ شیخ شہید کے استاد تھے آپ نے ٨ ربیع الاول ٧٧٦ھ مقام حلہ میں وفات پائی۔ آپ کا جنازہ مشہد میں دفن کیا گیا۔ انکے دو فرزند ابو طالب محمد اور ابوالقاسم علی تھے۔ اسمٰعیل دیباج اکبر کے دوسرے بیٹے ابراہیم کا لقب الغمر طباطبا تھا۔ قبطی زبان میں سید السادات کو طباطبا کہا جاتا ہے ان کے گیارہ فرزند اور دو دختران تھیں جنکے نام جعفر، ابراہیم، اسمٰعیل، موسیٰ، ہارون، علی، عبداللہ، محمد، حسن، احمد، قاسم، لبابہ اور فاطمہ تھے۔ ان میں سے احمد نے ٢٧٠ھ میں مصر میں خروج کیا اور احمد بن طولون کے ہاتھوں مارے گئے ان کا سر قلم کرکے معتمد کے پاس بھیجا گیا۔ ان کی اولاد متفرق مقامات پر آباد ہوئی۔ ابراہیم طباطبا کے ایک بیٹے محمد نے ابو السرایا کی معاونت سے ١٩٩ھ میں کوفہ میں خروج کیا انھیں اقتدار حاصل ہوا۔ لیکن ابو السرایا کی حرکات آپ کو پسند نہ تھی لہٰذا محمد طباطبا نے اسے کچھ نصیحتیں کیں اور اس سے کنارہ کشی اختیار کی مگر کچھ ہی دنوں بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔ محمد طباطبا کی اولاد کثیر تھی۔ ان کی اولاد میں ابو حمزہ اور ابوالحسن یحییٰ الہادی بن حسین بن قاسم الرسی نے ایام معتضد ٢٨٠ھ میں یمن میں ظہور کیا اور ہادی الی الحق کے لقب سے مشہور ہوئے۔

طباطبائی سلطنت : انکی کنیت ابو محمد تھی انہوں نے جمادی الاول ١٩٩ھ میں طباطبائی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اسی زمانہ میں الہادی یحییٰ بن حسن

بن قاسم بن ابراہیم طباطبا نے یمن میں اپنی حکومت کا اعلان کیا اور خود کو امیر المومنین کہلوایا۔ ۱۸ ذی الحجہ ٢٠٨ھ میں وفات پائی۔ اسکے بعد ان کا بیٹا المرتضیٰ محمد حکمران ہوا جس نے ٣٢٠ھ میں انتقال کیا۔ اسکے بعد ان کا بھائی الناصر احمد تخت نشین ہوا جو ماہ صفر ٣٢٣ھ میں انتقال کر گیا اسکے بعد اس کا بیٹا منتخب حسین تخت حکومت پر بیٹھا یہ ٣٢٩ھ میں فوت ہوا۔ جس کے بعد اسکا بھائی مختار قاسم حکمران ہوا جسے ماہ شوال ٣٤٤ھ میں قتل کردیا گیا پھر اس کا بھائی ہادی محمد اور اسکے بعد رشید عباس حکمران ہوئے اسکے بعد طباطبائی حکومت ختم ہوگئی۔[1]

حسن بن حسن مثنیٰ : چونکہ یہ اپنے سلسلہ کے تیسرے حسن تھے یعنی حسن بن حسن بن حسنؑ اسلئے یہ حسن مثلث کہلائے۔ یہ اور عبداللہ محض ماں جائے بھائی تھے۔ حسن مثلث صاحب فضل و ورع تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل کرتے تھے یہ مذہب زیدیہ کی طرف مائل تھے۔ جب انکے بھائی عبداللہ محض کو قید کرکے اذیتیں پہنچائیں گئیں تو انھیں بہت صدمہ ہوا۔ یہ ہر وقت اپنے بھائی کی یاد میں گریہ کرتے تھے۔ انہوں نے لذات دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ یہ نہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے نہ نیا کپڑا زیب تن کرتے تھے۔ منصور نے انھیں بھی کوفہ کے قید خانہ میں ڈلوا دیا جہاں یہ اڑسٹھ (٦٨) سال کی عمر میں ذیقعد ١٤٥ھ میں فوت ہوگئے۔[2]

اولاد حسن مثلث : انکے چھ بیٹے طلحہ، عباس، حمزہ، ابراہیم، عبداللہ اور علی تھے۔ طلحہ کے اولاد نہ تھی عباس کی ماں عائشہ بنت طلحہ الجود بن عمر تمی تھیں۔ عباس نوجوانان بنی ہاشم میں سے تھے۔ عباسی حکومت نے انھیں بھی ماخوذ کرکے قید کرنے کا حکم دیا لہٰذا ایک روز یہ اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ سرکاری کارندوں نے گرفتار کرلیا۔

[1] تاریخ الخلفاء ص: ٥١٧، [2] منتہی الامال ص: ٣١٦

ان کی ماں نے ان لوگوں کی بڑی منت و زاری کی اور کہا کہ تھوڑی دیر کیلئے چھوڑ دو تاکہ میں اسکو ایک بار گلے سے لگالوں مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور ان سے کہا کہ "جب تک تو اس دنیا میں ہے اسے کبھی گلے نہ لگا سکے گی" اور ہوا بھی یہی کہ عباس نے قید خانہ ہی میں ٢٣ رمضان ١٤٥ھ کو پینتیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انکی اولاد میں سے ایک علی بن عباس تھے جنھوں نے بغداد میں دعوت دی زیدیہ جماعت نے ان کی دعوت کو قبول کیا۔ انکا حلقہ احباب بہت وسیع ہوگیا تھا مہدی عباسی کو یہ ناگوار گزرا۔ اس نے انھیں قید کروادیا اور یہ قید رہے حتیٰ کہ حسین بن علی صاحب فخ نے زندان کا دروازہ کھول کر تمام قیدیوں کو آزاد کردیا۔ اسوقت انھیں رہائی ملی اور یہ مدینہ چلے گئے مگر اسیری کے دوران انھیں زہر دیا گیا تھا جس کے اثر سے انکے جسم کا گوشت پھٹ رہا تھا اور اعضاء بھی متاثر ہوگئے تھے۔ وہ اسی حالت میں فوت ہوگئے۔

عباس بن حسن مثلث کی اس موت سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ بنی ہاشم کے جتنے لوگ اسیری کے دوران مرے ان کو اذیتوں کے علاوہ زہر بھی دیا جاتا تھا یہ لوگ مرتے نہیں تھے بلکہ مار ڈالے جاتے تھے۔

حسن مثلث کے تیسرے بیٹے حمزہ نے باپ کی حیات میں وفات پائی اور چوتھے بیٹے ابراہیم کا حال معلوم نہیں۔ پانچویں بیٹے عبداللہ کی کنیت ابو جعفر تھی اور ان کی ماں ام عبداللہ بنت عامر بن عبداللہ بن بشیر تھیں۔[1] ان کو بھی انکے بھائی و دیگر بنی ہاشم کے ہمراہ کوفہ کے قید خانہ میں رکھا ہوا تھا جہاں انہوں نے ١٤٥ھ میں چھیالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ حسن مثلث کے چھٹے بیٹے علی جو عبداللہ کے ماں جائے بھائی تھے انکی کنیت ابوالحسن تھی اور زہد و عبادت، تقویٰ اور پرہیزگاری کے باعث

[1] مقاتل الطالبین ص: ١٣٣

علی الخیر و علی العابد کے القاب سے مشہور تھے۔ انکی زوجہ زینب بنت عبداللہ محض بھی بڑی عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ چونکہ عباسی حکمرانوں نے زینب کے باپ، بھائیوں، شوہر اور دیگر قریبی اعزاء کو قید و بند کی اذیتوں میں مبتلا کر رکھا تھا لہٰذا یہ خاتون ہر وقت عبادت الٰہی میں مشغول اور گریہ وبکا میں مصروف رہتی تھیں۔ کتب تواریخ میں علی بن حسن مثلث کی نیک نفسی، بندگی و توکل کے واقعات تحریر ہیں ان میں سے ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ مدینہ میں کسی عام جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سانپ آپ کی پوشاک میں داخل ہوا۔ دیکھنے والوں نے شور مچایا مگر آپ انتہائی رجوع قلب سے نماز ادا کرتے رہے یہانتک کہ سانپ گریبان سے نکل کر چلا گیا۔[1] دوسرا واقعہ جسے مورخین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسن بن جعفر بیان کرتے ہیں کہ جب وہ قید خانہ میں تھے تو انکے ساتھ علی بن حسن بھی تھے۔ انکے طوق ذرا ڈھیلے تھے جنہیں یہ لوگ اتار دیتے تھے اور جب محافظوں کے آنے کا وقت ہوتا تو پہن لیتے تھے لیکن حسن بن علی ایسا نہ کرتے تھے وہ کسی وقت بھی طوق نہیں اتارتے تھے اور ہر وقت عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ قید خانہ میں اتنی تاریکی تھی کہ دن اور رات کا پتہ نہیں چلتا تھا یہ لوگ حسن بن علی کی تسبیح سے نماز کا وقت متعین کرتے تھے۔[2] آپ نے پینتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

اولاد علی بن حسن مثلث : علی بن حسن مثلث کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں جن کے نام محمد، عبداللہ، عبدالرحمٰن، حسن، حسین، رقیہ، فاطمہ، ام کلثوم، اور ام الحسن تھے۔ محمد و عبداللہ باپ کی حیات میں فوت ہوئے۔ عبدالرحمٰن کے ایک بیٹی رقیہ تھی۔ حسن

[1] نور الابصار من حیات الصادقین ص : ۲۹۸، منتہی الامال ص : ۳۱۷، [2] تاریخ طبری (عربی) الجزء التاسع ص : ۱۹۹،

جن کا لقب مکفوف تھا یہ صاحب اولاد تھے اور حسین میدان فخ میں شہید ہوئے اور صاحب فخ کہلائے۔ واقعہ فخ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

واقعہ فخ : یہ واقعہ ۱۶۹ھ میں پیش آیا اور نوماہ اٹھارہ دن میں تمام ہوا۔ اس واقعہ کی بابت ابن خلدون، طبری، ابن اثیر، مسعودی اور ابو الفرج وغیرہ نے تفصیلاً لکھا ہے۔ مورخین نے اس واقعہ کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حسن محمد بن عبداللہ محض، مسلم بن جندب ہذلی شاعر اور آل عمر کا ایک غلام عمر بن سلام ایک جگہ جمع تھے والئی مدینہ عمر بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عمر بن خطاب جو آل ابی طالب پر بڑی سختیاں کرتا تھا نے ان تینوں کو گرفتار اور ان پر شراب نوشی کی تہمت لگا کر بلا کسی گواہ وشاہد کے حد جاری کر دی۔ حسن بن محمد کو اسی (۸۰) کوڑے لگوائے جبکہ مسلم کو پندرہ کوڑے اور عمر کو صرف سات کوڑے لگوائے۔ اس پر تکرار ہوئی۔ نیز والئی مدینہ کا حکم تھا کہ آل ابطالب روزانہ قصر امارۃ میں حاضری لگوائیں۔ اور ہر ایک کی حاضری کیلئے انکے خاندان کے افراد کو ضامن مقرر کیا ہوا تھا۔ اتفاقاً ایک روز حسن بن محمد غیر حاضر ہو گئے۔ حاکم مدینہ نے انکے ضامن حسین بن علی اور یحیٰی بن عبداللہ کو طلب کر کے حکم دیا کہ وہ تین دن میں حسن کو پیش کریں ورنہ ان دونوں کو قید کر دیا جائیگا۔ اس پر حسین بن علی نے کہا کہ اے ابو حفص کیا تم غصہ میں آگئے ہو۔ یہ سنتے ہی عمر بن عبدالعزیز آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا "تیری یہ مجال کہ تو مجھے کنیت سے مخاطب کرے" اسی حالت میں اس نے بدکلامی کی جس پر یحیٰی بن عبداللہ طیش میں آگئے۔ انہوں نے حاکم مدینہ سے کہا کہ "یہ قید آل ابطالب پر کیوں آل عمر کو کیوں نہیں اسی طرح حاضری پر مجبور کیا جاتا ان کو بھی بلا کر اسی طرح دیکھو اور حاضری لو۔ ان میں تو بہت زیادہ غیر حاضر پاؤ گے۔ ہمارے ساتھ انصاف کرو" حاکم مدینہ نے یحیٰی کے اس حقیقت پر

مبنی سوال کا تو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس نے حسین بن علی کو مخاطب کر کے کہا "میری بیوی کو طلاق ہو اور میرے غلام آزاد ہوں اگر میں تم کو چھوڑ دوں ورنہ تم اس باقی دن اور رات میں حسن بن محمد کو میرے پاس لا کر حاضر کرو۔ میں تم کو ایک ہزار کوڑے ماروں گا اور تمہاری جائیداد جلا دوں گا۔ اگر تم نے اس عرصہ میں اس کو پیش نہ کیا اور جب میری آنکھ حسن بن محمد پر پڑے گی تو میں اس کو قتل کر دوں گا"۔ اسکے جواب میں یحیٰی نے سخت الفاظ میں جواب دیا اور یہ دونوں وہاں سے چلے آئے۔

راتوں رات حسین بن علی نے اولاد ابطالب میں سے یحیٰی، سلیمان و ادریس فرزندان عبداللہ محض، عبداللہ بن حسن بن علی بن علی بن حسین معروف بافطس، ابراہیم بن اسمٰعیل طباطبا، اپنے بھائی کے بیٹے عمر، حسن و عبداللہ پسران اسحاق بن ابراہیم غمر، عبداللہ بن امام جعفر الصادق و دیگر رفیق و موالی کو اطلاع کروائی یہ سب لوگ اسی وقت جمع ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسوقت اولاد علی سے تئیس (۲۳) افراد تھے۔ بہر حال فجر کا وقت ہوا موذن نے اذان کی تیاری کی تو عبداللہ افطس نے موذن سے حی علیٰ خیر العمل کے ساتھ اذان کہلوائی سب نے نماز ادا کی جسکے بعد حسین بن علی نے خطبہ دیا اور جہاد کا اعلان کیا۔ اذان کی آواز سن کر حاکم مدینہ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا وہ اپنا قصر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ ادھر حسین بن علی کے ساتھیوں نے قصر امارہ کا محاصرہ کر لیا اور قید خانہ کے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔[1] اور مدینہ پر قبضہ کر لیا عباسی فوج جو مبارک ترکی کی سربراہی میں آئی تھی اسے شکست ہوئی۔ حسین نے اپنی حکومت کو مضبوط کیا۔ اکیس دن مدینہ میں قیام کے بعد آخر ماہ ذیقعدہ ۱۶۹ھ میں مکہ گئے۔ ہادی عباسی نے بہت بڑی فوج مکہ بھیجی۔ حسین کے

[1] نور المشرقین ص : ۳۲۰

پاس بہت کم فوج تھی پھر بھی وہ مقابلہ کو تیار ہو گئے ۸ / ذی الحجہ ۱۶۹ھ مطابق ۲۱ / جون ۷۸۶ء کو مکہ کے قریب مقام فخ میں جنگ کا آغاز ہوا۔ حسین کے ساتھی اپنی قلت کے باوجود بڑی بہادری سے لڑے۔ عباسی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی لہٰذا اس نے حسین کے ساتھیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا آخر کار حسین بن علی کو شکست ہوئی اور وہ شہید ہو گئے۔ ایک خراسانی نے ان کا سر قلم کر کے عباسی فوج کے سردار محمد بن سلیمان کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس طرح یہ واقعہ فخ کے میدان میں ختم ہوا۔

حسین بن علی : حسین بن علی کی بابت حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر الصادقؑ سے روایت منقول ہے کہ " ایک روز جناب رسول خدا فخ پر سے گزرے آپؐ وہاں اتر پڑے۔ نماز پڑھی، گریہ فرمایا تو اصحاب نے وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کی جبرئیل نے مجھے مطلع کیا کہ یہاں میرا ایک بیٹا شہید کیا جائیگا اور جو شخص اس کے ساتھ شہید ہو گا اس کو دو شہداء کا اجر ملے گا۔ ان کی ارواح ان کے اجسام سے پہلے جنت میں داخل ہونگی۔

حسین بن علی کی سخاوت کے بہت سے واقعات مورخین نے لکھے ہیں۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ یحیٰی بن عبداللہ کے طرز عمل سے یہ خروج عجلت میں وقت سے پہلے ہوا ورنہ حسین بن علی کی کامیابی یقینی تھی۔ مسعودی کی روایت جسے ابو الفرج نے مدائنی سے نقل کیا ہے کہ شہدائے فخ کے جسد تین روز تک میدان ہی میں پڑے رہے کسی نے دفن نہیں کئے حتیٰ کہ درندوں اور پرندوں نے انہیں کھایا۔ عباسیوں نے اسیران کے سر قلم کئے۔ حسین بن علی کا سر عباسی خلیفہ ہادی کے پاس بھیج دیا۔ جب یہ خبر مدینہ پہنچی تو بنی ہاشم کے گھروں میں کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے شہداء کے مرثیے کہے۔

جعفر بن حسن مثنیٰ : جعفر کی کنیت ابوالحسن تھی۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ انھیں زبان پر بڑا عبور تھا اور اپنے زمانہ کے بہترین خطاب تھے۔ یہ بھی منصور کی قید میں رہے مگر بعد میں رہا کر دیے گئے۔ انہوں نے تقریباً ۷۰ ستر سال کی عمر میں مدینہ میں انتقال کیا۔ انکے چار بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ جنکے نام عبداللہ، قاسم، ابراہیم، حسن، فاطمہ، رقیہ، زینب، ام حسن، ام حسین اور ام القاسم تھیں عبداللہ لاولد تھے۔ ابراہیم کی ماں ام ولد تھیں۔ ابراہیم کی نسل منتشر ہو گئی۔ انکے ایک پوتے عبداللہ بن جعفر بن ابراہیم کو خارجیوں نے قتل کر دیا۔ حسن بن جعفر کے پانچ بیٹے اور ایک دختر تھیں۔ جنکے نام سلیمان، ابراہیم، محمد، عبداللہ، جعفر، فاطمہ تھے یہ فاطمہ کبریٰ زوجہ تھیں عمر بن عبداللہ بن محمد بن عمران بن علی ابن ابطالب کی۔ سلیمان و ابراہیم باپ کی حیات میں لاولد فوت ہوئے۔ محمد کی ماں ملیحہ بنت حسن بن داؤد بن حسن مثنیٰ تھیں۔ انکے ایک بیٹی اور دو بیٹے عائشہ محمد اور علی تھے۔ علی کی عرفیت ابن الحمد یہ تھی انکے سات اولادیں تھیں جو متفرق مقامات پر آباد ہوئیں۔ عبداللہ بن حسن بن جعفر کے چار بیٹے محمد، جعفر، حسن اور عبداللہ تھے ان کی ماں اولاد علی سے تھیں۔ محمد بن عبداللہ کے ایک بیٹے کا نام علی اور لقب باغر تھا۔ عبداللہ کی اولاد کاشان اور نیشاپور میں کثیر ہے۔ جعفر بن حسن بن جعفر بن حسن کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔

داؤد بن حسن مثنیٰ : انکی کنیت ابوسلیمان تھی۔ یہ اپنے بھائی عبداللہ محض کی جانب سے تولیت وصدقات امیر المومنین کے نگران تھے جب انکو منصور نے اسیر کرایا تو انکی ماں حضرت امام جعفر الصادقؑ کے پاس گئیں تو آپؑ نے انکو دعائے استفتاح تعلیم فرمائی اور نیمۂ رجب میں تلاوت کیلئے ارشاد فرمایا۔ انہی کی نسبت سے اس دعاء کو دعائے ام داؤد کہا جاتا ہے۔

اس دعا کے طفیل داؤد کو قید سے رہائی ملی اور وہ مدینہ واپس آئے۔[1] داؤد کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں عبداللہ، سلیمان، ملیحہ اور حماد تھے۔ ان چاروں کی ماں ام کلثوم بنت امام علی زین العابدینؑ تھیں۔ ملیحہ حسن بن جعفر بن حسن مثنیٰ کی زوجہ تھیں۔ عبداللہ کے دو بیٹے تھے ان میں ایک محمد الارزق جو فاضل وپارسا تھے انکے بھی چھ بیٹے تھے مگر وہ منتشر ہو گئے تھے۔ دوسرے کا نام علی تھا کہ مہدی عباسی کے زمانہ میں اسیری کے دوران وفات پا گئے انکے بھی اولاد تھی جن میں سے ایک سلیمان مرد بزرگ و مجد تھے سلیمان بن داؤد کے بیٹے محمد نے ابوالسرایا کے زمانہ میں مدینہ میں خروج کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل کر دیے گئے۔ انکے آٹھ اولادیں تھیں جنکے نام سلیمان، موسیٰ، داؤد، اسحاق، حسن، فاطمہ، ملیحہ اور کلثوم تھے۔ حسن بن محمد جد طاؤس ہیں انکی اولاد عراق میں آباد ہوئی چونکہ حسن لطف شمائل کے باعث طاؤس لقب سے مشہور تھے لہٰذا انکی نسل قبیلہ طاؤس کہلائی۔

تَمَتَّ بِا الخیر

[1] منتہی الآمال ص ۳۲۳۔

تاریخ بنی ہاشم

قدیم و جدید مستند کتب کی روشنی میں خاندان بنیؑ ہاشم کے
دبائو اجداد، پسران، دختران، اُمہات و ازواج کے واقعات و حالات،
عقائد و نظریات دینداری و دینی خدمات، نسلی اور نسبی تسلسل اور
باہمی رفاقت و رقابت کو

اس کتاب میں نئے زاویے اور نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے
یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے

باب اوّل :	آدم تا ہاشم	جلد اوّل قیمت -/75
باب دوئم :	ہاشم تا خاتم	
باب سوئم :	خاتم تا دائم	جلد دوئم قیمت -/90
باب چہارم :	دائم تا کاظم	زیر ترتیب
باب پنجم :	کاظم تا قائم	زیر ترتیب

اس کتاب کی معلوماتی اہمیت اپنی جگہ اس کے علاوہ شجرہ جات اور نقشہ جات کی شمولیت سے کتاب کی افادیت دوبالا ہو گئی ہے

قیمت : جلد اوّل -/75 روپے جلد دوئم : -/90 روپے

نگرانیٔ اِمام میں ہو گا یہ نیک کام
اچّھا ہے وقت خواب کی تعبیر کے لئے
محشر میں فاطمہؑ تجھے کر دیں گی سرخرو
اٹھ جنّت البقیع کی تعمیر کے لئے
آصف لکھنوی

Nigrani-e-Imam main hoga yeh nek kaam,
Achchha hai waqt khwab ki tabeer ke liye,
Mahshar main Fatema (s.a) tujhe kardengi surkhroo,
Uth Jannatul Baqi ki tameer ke liye.
Late: - Asif Lucknowi